شہیدِ وفا

از

مسکان احزم

شہیدِ وفا

حصہ اوّل:

وہ آواز کی سمت مسلسل چل رہی تھی۔آواز قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔کوئی تو تھا وہاں پر جو وائلن کی اتنی خوبصورت دھن کو ہوا کے سپرد کر رہا تھا۔دھیرے دھیرے اس کے قدم آگے کی جانب بڑھ رہے تھے۔بالآخر وہ وہاں پہنچ چکی تھی۔وہاں کا منظر کسی خواب سے الگ نہ تھا۔پہاڑوں کے درمیان گھری وہ جگہ جنت کا ایک دلکش ٹکڑا لگ رہی تھی۔جس کا سحر ہر چیز پر طاری ہو رہا تھا۔

ایک طرف بہتا دریا جیسے وائلن کی دھن میں مگن منزل کی جانب گامزن ہو۔دوسری طرف آٹھ سے نو سال کی بچیاں سفید رنگ کی پشواکیں پہنیے محوِ رقص تھیں

اد گرد سے بے خبر۔

وہ کبھی ایک پاؤں اوپر اٹھاتیں تو کبھی دوسرا۔کبھی ایک دوسرے کے قریب آ کر دائرے کو تنگ کرتیں تو کبھی گھول گھول گھوم کر ایک دوسرے سے دور چلی جاتیں۔کتنا خوبصورت منظر تھا۔وہ تو اپنی بصیرت پر یقین ہی نہیں کر پا رہی تھی۔

کچھ ہی فاصلے پر کوئی وائلن بجا رہا تھا۔وہ اس اجنبی کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی کیونکہ اس کی پشت اس کی جانب تھی۔وہ اجنبی کمال کا وائلن بجا رہا تھا۔جیسے وہ اس دھن سے فضا میں کوئی سحر بکھیر رہا ہو۔وہ تو اس سحر میں جکڑتی جا رہی تھی کہ تبھی سامنے پہاڑ کے پیچھے سے اسے ایک کالی گھٹا اٹھتی نظر آئی۔

سماں بدلنے لگا۔۔۔

اندھیرا چار سو بڑھنے لگا۔۔۔

اداسی کے بادل چھانے لگے۔۔۔

وائلن کی دھن ماتم میں بدلنے لگی۔۔۔

بچیاں جو پہلے رقص سے لطف اٹھا رہی تھیں۔اب چہرے پر پریشانی کے آثار لیے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگیں۔جیسے وہ جانتی ہوں کہ اگلے ہی پل کچھ ہونے والا ہے۔کچھ بہت ہی برا۔اور۔اور۔پھر انہوں نے بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔

اففف خدایا۔۔یہ کیا ہو رہا ہے؟؟وہ خود بھی پریشان ہوگئی۔دریا کا پانی خون کے مشابہ نظر آنے لگا۔سفید لباس میں ملبوس وہ اجنبی ابھی بھی وائلن بجانے میں مصروف تھا۔جیسے اسے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔ہاں مگر فرق پڑا تھا تو صرف اس کی دھن کو جو اب اداس ہوتی جارہی تھی۔

وہ بچیوں کو چپ ہونے کا کہہ رہی تھی۔وہ چلا رہی تھی۔مگر اسے وہاں سن کون رہا تھا۔اس شور میں اس کی آواز دب گئی تھی۔کیا انہونی ہونے جارہی تھی؟اس سے پہلے کہ وہ اس بات کا اندازہ لگاتی کہ گھٹا اجنبی کے بالکل سر پر پہنچ گئی۔اور اگلے ہی لمحے وہاں سرخی مائل اندھیرا چھا گیا۔تاحدِ نگاہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا ماسوائے آسمان تک پھیلے اندھیرے کے۔وائلن کی آواز آنا بند ہوچکی تھی۔دور سے بہت دور سے چھوٹی بچیوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ان آوازوں کے سوا وہاں اور کچھ بھی نہ تھا۔

اوخدایا۔۔۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟

پل بھر میں وہ جنت کا ٹکڑا کربلا میں کیسے بدل گیا؟

آسمان پر جھومتے سفید بادل کالی گھٹائیں کب بدلے؟

اپنی موج میں بہتا دریا خون کی ندی کب بنا؟

ایک لمحہ ہی تو لگا تھا اس قیامت کے آنے میں۔۔۔ہاں صرف ایک ہی لمحہ۔۔۔وہ اب خوف ہراس سے بے سمت بھاگنے لگی تھی۔اس نے کدھر جانا تھا وہ یہ بات خود بھی نہیں جانتی تھی۔اچانک کسی پتھر سے ٹھوکر لگنے سے وہ گہری کھائی میں چلاتی ہوئی گرنے لگی۔

بچاؤ۔۔۔

بچاؤ۔۔۔

وادی میں اس کی آواز گونجنے لگی۔وہ اب بھی چلا رہی تھی تبھی اس کی ماں نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔اس نے نیند سے آنکھیں کھول دیں۔وہ پسینے سے شرابور سہمی ہوئی اپنی ماں کی بانہوں میں چھپ گئی۔

"میرا خیال ہے بیٹا کہ تم نے پھر وہی سپنہ دیکھا ہے۔"اس کی ماں نے اس کی کمر سہلاتے ہوئے کہا۔اور وہ بس روئے جارہی تھی۔

یہ خواب اسے ہمیشہ پریشان کردیتا تھا۔وہ آج تک یہ بات سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ یہ خواب اتنے برسوں سے کیوں دیکھ رہی تھی؟آخر اس خواب کا مقصد کیا تھا؟یہ خوب کس انہونی کی طرف اشارہ کرتا تھا؟وہ اجنبی کون تھا؟وہ اتنی خوبصورت جگہ کہاں تھی؟ایسے بہت سے سوال اسے تنگ کرتے تھے۔مگر کون جانے ان کے جوابات۔

اس کی ماں نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔اور اس کے بال سہلانے لگی۔ناجانے کب وہ نیند کی آغوش میں دوبارہ چلی گئی۔اس کی ماں نے وال کلاک پر نظر ڈالی تو کلاک نے ایک بجنے کی خبر دی۔اس نے اس پر کمبل اوڑھایا اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔نیند اس کی ماں سے روٹھ چکی تھی اب۔وہ بھی اپنی بیٹی کی وجہ سے پریشان رہنے لگی تھی کیونکہ اس کی بیٹی اب گم سم سی رہنے لگی تھی۔

{------------------------}

صبح اس کی آنکھ قریب قریب ساڑھے گیارہ بجے کے قریب کھلی۔آج سنڈے تھا اس لیے اسے یونیورسٹی سے آف تھا۔اور وہ اسی وجہ سے آج لیٹ اٹھی تھی۔نائٹ ڈریس میں ملبوس وہ موبائل کو جس پر اس کی فرینڈز کے کچھ میسجز تھے چیک کرتے ہوئے بیڈ سے اٹھی۔سستی سے چلتے ہوئے اس نے کھڑکیوں پر پہرہ لگائے بڑے بڑے ریشمی پردوں کو سرکایا تو سورج کی کرنیں چھن سے آتے اس کے چہرے کا طوف کرنے لگیں۔کھڑکی کے اس پار بیٹھک ایک سنہری صبح اس کی منتظر تھی۔وہ کچھ دیر وہاں کھڑکی کے پار جھانکتی رہی۔شائد وہ چہرے پر سورج کی کرنوں کی شدت محسوس کرنے کی کوشش کررہی تھی۔سورج کی کرنیں اس کے سفید سرخی مائل چہرے کو گدگدانے لگیں۔اسی لیے وہ مسکرادی تھی۔سلیپرز کو پہنتے ہوئے وہ واش روم کی جانب شاور لینے چلی گئی۔کچھ دیر شاور لینے کے بعد وہ جینز کے ساتھ ڈھیلی سی شرٹ پہنے باہر نکلی۔وہ بالوں کو جلدی جلدی جوڑے کی شکل میں قید کرنے لگی۔

اففف۔۔۔وہ اتنے خوبصورت بالوں پر کتنا ظلم کرتی تھی کہ انہیں آزاد نہیں رکھتی تھی۔ڈھیلا سا جوڑا کئے جس میں سے آدھے بال آزادی حاصل کر کے خوشی سے ادھر ادھر جھومنے لگے تھے،وہ سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے کیچن میں چلی گئی۔وہاں اس نے اپنے لیے ٹوسٹ بنایا اور ایک چائے کا کپ۔وہیں اس نے بے دردی سے ٹوسٹ کھایا اور چائے کا بھاپ اڑاتا مگ ہاتھ میں لیے باہر لان میں آگئی۔اس کی ماں اس وقت سو رہی تھی۔

واقعی وہ ایک سہانی صبح تھی۔لندن میں راج سے اترتی کرنیں ہر چیز کو اپنے سحر میں جکڑ رہی تھیں۔اور فطرت تو ویسے ہی اسے بہت زیادہ اٹریکٹ کرتی تھی۔اس نے وقفے وقفے سے چائے کے گھونٹ بھرے اور موسم سرما کی راج کماری دھوپ سے لطف اٹھانے لگی۔پھر کچھ یاد آنے پر وہ واپس کمرے میں چلی گئی اور وہاں سے اپنا بیگ لیکر باہر چلی گئی۔شائد وہ کہیں باہر جارہی تھی۔

{--------------}

وہ ہسٹری کی اسٹوڈنٹ تھی۔اسے ہسٹاریکل جگہیں زیادہ اٹریکٹ کرتی تھیں۔اسی لیے وہ آج پھر سٹون ہینگ آئی تھی۔وہ اکثر یہاں آیا کرتی تھی کیونکہ یہ اس کی پسندیدہ ترین جگہوں میں سے ایک تھی۔وہ یہاں باربار کیوں آتی تھی اس کی وجہ بھی اسے معلوم نہیں تھی۔56 ٹن کے یہ بڑے بڑے اور بھاری پتھر یہاں کیوں پڑے تھے اس کے بارے میں وہ بہت سی کہانیاں بچپن سے سنتی آئی تھی۔

سٹون ہینگ۔۔۔دنیا کے سات عجوبوں میں سے چوتھا عجوبہ۔گولائی میں کھڑے ان پتھروں کو خدا کی طرح پوجا جاتا تھا۔مگر کیوں؟

لیکن جو بھی تھا وہ جگہ بہت خوبصورت تھی۔وہ پتھر اپنے اندر عجب کشش رکھتے تھے۔وہ اکثر یہاں تنہائی کے کچھ لمحے گزارنے آتی تھی۔اگرچہ یہاں بہت سے وزٹرز آتے تھے مگر وہ اجنبی تھے گویا ایک دوسرے سے بے خبر۔

وہ خاص طور پر تب یہاں آتی تھی جب گزری رات اس کی تاریخ میں ایک دفعہ پھر اسی خوب کو دہراتی تھی۔

اس کا خواب بھی ان پتھروں کی طرح ایک معمہ ہی تھا۔

الجھا ہوا۔۔۔

مبہم سا۔۔۔

حیران کر دینے والا۔۔۔

اور بعض دفعہ پریشان کر دینے والا۔۔۔

وہ دو متوازی پڑے ہوئے پتھروں میں سے ایک پر بیٹھی تھی کہ تبھی اسے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"ہیلو۔۔۔"اس نے حیران ہوکر گردن اوپر اٹھائی تو وہاں ایک نیلی آنکھوں والا لڑکا کھڑا تھا آنکھوں میں نیلے پانیوں کی سی چمک لیے۔جس نے وائٹ شرٹ کے ساتھ بلیو جینز پہن رکھی تھی اور سر پر ریڈ پی کیپ۔

"ہیلو۔۔۔"وہ دھیرے سے مسکرائی تھی۔

" کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"لڑکے نے اس کے پہلو میں خالی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آہاں۔۔ضرور۔"اس نے مسکراتے ہوئے اس بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔

"میرا نام آسٹن ہے۔میں تمہیں یہاں اکثر آتے ہوئے دیکھتا ہوں۔"آسٹن نے اپنی کیپ اتارتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔مگر میں نے تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔"اس کی دلچسپی کا مرکز ابھی بھی وہی پتھر تھے۔

"ہاہاہاہا۔۔۔"آسٹن کا کانوں میں رس گھولتا قہقہہ فضا کی نذر ہوا۔

اب کی بار اسے حیرانی ہوئی تھی کہ وہ ایسے کیوں ہنس رہا تھا۔

"ارے تم تو ان بے جان پتھروں میں ہی اتنی کھوئی ہوتی ہو کہ اردگرد کے چلتے پھرتے لوگ کہاں نظر آئیں گے۔"آسٹن بھی انہیں پتھروں کو نگاہوں کے حصار میں لیے ہوا تھا۔

مگر یہ بات اس بھوری آنکھوں والی لڑکی کو ناگوار گزری تھی۔وہ اس کے چہرے پر ناگواریت کے آثار دیکھ چکا تھا۔

"معاف کرنا میرا خیال ہے کہ تمہیں میری بات ناگوار گزری ہے۔"اسے اپنے یوں پر تکلف ہونے پر شرمندگی محسوس ہوئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"نہیں۔۔۔ایسی بات نہیں۔بس مجھے لوگوں سے زیادہ فرینک ہونا پسند نہیں۔"آسٹن کی شرمندگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس نے اپنے لہجے کی تلخی کو بہت حد تک کم رکھا تھا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

اب اس کی توجہ کا مرکز سامنے کھڑا اسکیچ آرٹسٹ بن چکا تھا جو بڑی مہارت سے سٹون ہینگ کو اپنے قرطاس پر اتار رہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"سکوت توڑا گیا۔

مگر وہ اب اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔اس کی نظریں اور دھیان ابھی بھی اس آرٹسٹ کے تیز چلتے ہوئے ہاتھوں پر تھا۔

"ہیلو۔۔۔"آسٹن نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"آں۔۔۔تم نے مجھ سے کچھ کہا؟"وہ اب اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"مادام میں نے تمہارا نام پوچھا ہے؟"وہ دھیمے انداز میں چلایا۔

ماریہ

ماریہ جارج نام ہے میرا۔

وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت آواز کی بھی ملک تھی۔

ہمم۔۔۔۔اچھا نام ہے۔"نام کو سراہا گیا تھا۔

شکریہ۔"وہ اب دوبارہ آرٹسٹ کی جانب متوجہ ہوچکی تھی۔شائد وہ مزید آسٹن سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔یہ بات آسٹن بھی محسوس کر چکا تھا۔اس لیے وہ اس کے چہرے پر الوداعی نظر ڈالے ،بغیر کچھ کہے وہاں سے چلا گیا مگر وہ بے خبر رہی۔اسے اردگرد کی کوئی خبر نہیں تھی خبر تھی تو بس اس بات کی وہ آرٹسٹ کس انداز میں کام کر رہا تھا۔

وہ بھی مگن تھا ان پتھروں میں اور ماریہ بھی۔

اور بڑے بڑے پتھر بھی مگن تھے اپنی ہی طرح گم سم سی اس لڑکی میں۔

وقت نے بھی دونوں پر کیا کیا نقش چھوڑے تھے۔

کبھی نہ مٹنے والے۔

بڑے واضح۔

{-------------}

اب تو خواہش ہے یہ

درد ایسا ملے

سانس لینے کی حسرت میں

مر جائیں ہم---

اب تو خواہش ہے یہ

ایسی آندھی چلے

جس میں پتوں کی مانند

بکھر جائیں ہم

ایسی ٹھوکر لے کہ

جی نہ سکیں

ایسے الجھیں یہ سینے میں

سانسیں کہ پھر---

ہم دوا پینا چاہیں

تو پی نہ سکیں---

کوئی ہمدم، نہ راہی

نہ راحت ملے

ایک پل کا سہارا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:

www.pakistanipoint.com

نہ چاہت ملے

اب تو خواہش ہے یہ

دشت ہی دشت ہو

ننگے پاؤں چلیں

ہم سر بزم--

شمع کی مانند جلیں

جس کو چاہیں---

اسے پھر نہ پائیں کبھی

چھوڑ جائیں یوں چپ چاپ

دنیا کو ہم---

دل یہ چاہے تو

پھر نہ آئیں کبھی---

اب تو خواہش ہے یہ

کہ سزا وہ ملے

کوئی صحرا

قلعہ

یا بیابان ہو

جس میں سالوں تلک

قید ہی قید ہو----

اپنے خالق و مالک سے

میں نے جو کی بے وفائی

وہاں یہ وہ ناپید ہو

ابنِ آدم کی چاہ کے کڑے جرم میں

اپنی ہی ذات کے کھوکھلے بھرم میں

اب تو خواہش ہے یہ

کہ سزا وہ ملے

روئے جاؤں تو

چپ نہ کرائے کوئی

دور جنگل میں

یا پھر۔۔۔

کسی دشت میں

ہاتھ پکڑے میرا

چھوڑ آئے کوئی۔۔

حالات کی تلخی کو وہ یونہی اپنی ڈائری کے اوراق پر اتارا کرتی تھی۔ یہ الفاظ ہی تو تھے جنہیں کاغذوں پر اتار کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا کرتی تھی۔اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر کبھی اتنی بڑی قیامت ٹوٹے گی۔ساتوں آسمان اس پر یوں گریں گے۔ یہ زندگی بھی بڑی عجیب چیز ہے کبھی کبھی تو ایسے امتحان لیتی ہے کہ اس امتحان گاہ میں بیٹھا انسان اپنی سب سے قیمتی چیز کھو بیٹھتا ہے۔ مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ یونہی چلتی رہتی ہے۔۔مسلسل۔۔ کبھی دبے پاؤں تو کبھی پلک جھپکنے میں ہی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔اور انسان کو بھی چلنا پڑتا ہے اس کے ساتھ۔ بے شک زبردستی ہی سہی۔

آنکھ سے ٹپکے آنسوؤں کو پونچھ کر اس نے اپنی ڈائری کو بند کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح موت نے اس کے پیارے کی زندگی کی کتاب کو بند کیا تھا۔

وہ خالی ہاتھ تھی۔اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا سوائے بچھڑنے والے کی یادوں کے۔

ہماری زندگی میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ان کے صفحات اپنی زندگی کی کتاب سے اکھاڑنا بھی چاہے تو اکھاڑ نہیں سکتا۔ان کی یادیں کسی پکی سیاہی سے لکھی تحریر کی طرح ہوتی ہیں۔انسان لاکھ کوششوں کے باوجود انہیں مٹا نہیں سکتا۔ یہ یادیں کسی زہریلے سانپ کی طرح ہر وقت اسے ڈستی رہتی ہیں۔ ہر پل اسے اذیت سے دوچار کرتی رہتی ہیں۔ یہ انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ نہ جلوت میں اور نہ خلوت میں۔

زندگی کی برف یادوں کے پانی میں گھلتی رہتی ہے۔انسان ان کا وجود ختم کرتے کرتے اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔

آخر زندگی کی یہ کتاب بند ہوجاتی ہے اور اس میں تحریر یادیں بھی اپنا دم توڑ جاتی ہیں۔

وہ لوگ تو بے وفا ہوتے ہیں لیکن ان کی یادیں بے وفائی نہیں کرتیں۔ جب تک سانس رہتی ہے تب تک پاس رہتی ہیں۔۔۔۔ مرنے کے بعد انسان مٹی میں دفن ہوجاتا ہے اور یہ یادیں اس کے دل میں۔۔۔

اسی لیے وہ بھی اس کی یادوں سے آج تک پیچھا نہیں چھڑا پائی تھی اور شاید کبھی بھی اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔ کیونکہ یہ تو وقت کے ستم ہوتے ہیں اور وقت کے چھوڑے نقوش مٹانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔۔۔

{---------------}

ڈھلتی شام،دور دھندلکے آکاش پر غول در غول اپنے آشیانوں کی جانب بے تابی سے پنچھی اڑتے نظر آرہے تھے، قطار در قطار۔ دن بھر کی تھکا دینے والی مسافت کے بعد آفتاب بھی آرام کرنے کی غرض سے دھیرے دھیرے سے رات کی رانی کی زلفوں کی چادر اوڑھ رہا تھا۔دھندلی شام کے اس طرح پر پھیلاتے ہی میڈن لین سنہری قمقموں کی روشنی میں نہا گئی۔اس لین میں واقع ایک رولز نامی ریسٹورنٹ میں وہ پارٹ ٹائم جاب کیا کرتی تھی۔لندن کے قدیم ریسٹورنٹس میں سے ایک رولز ریسٹورنٹ اسی لین میں چہل پہل کا باعث تھا۔اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بھی۔

اسی اسٹریٹ کے آخری کونے میں ایک بوڑھا جانسن گٹار بجایا کرتا تھا۔اور اس کی میٹھی میٹھی دھن پر ایک دس گیارہ سال کی بچی سارہ اپنی سحر طاری کر دینے والی آواز میں خوبصورت گیت رہ گزاروں کی سماعتوں کی نذر کیا کرتی تھی۔ یہی ان دونوں کا ذریعہ معاش تھا۔ ہر وقت بہت سے لوگ یہاں ہجوم لگائے رکھتے تھے۔وہ کبھی اس کے ساتھ اپنے پسندیدہ گیت گاتے یا پھر اپنی پریشانیوں کو بھلانے کے لیے ان کی لے پر رقص کرتے۔

سارہ کبھی محبت کے گاتی تو کبھی دو دلوں کے ملن کے اور بعض اوقات سنگدل محبوب کی بے وفائی کے قصے گانوں کے روپ میں پیش کرتی۔

ماریہ بھی کبھی کبھی سارہ کے گانے سنتی تھی۔

آج بھی جب وہ ریسٹورنٹ سے اپنی سائیکل پر واپس آرہی تھی تو سارہ کی آواز میں اس کے پسندیدہ گانے نے پیڈلز چلاتے اس کے قدم روک دیے۔اس نے سائیکل ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور بلیک کلر کے گھٹنوں تک آتے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھوں کو چھپائے بڑی توجہ سے گانا سننے لگی۔رات کے پونے ایک ہو رہے تھے۔ بہت سے لوگ ابھی بھی وہاں کھڑے تھے۔

بھیڑ لگائے۔

We are talking away

(ہم بول رہے ہیں دور)

I don't know what

(میں نہیں جانتا کیا)

I m to say, I'll be say it anywhere

(میں کہنا چاہتا ہوں اور میں کہوں گا چاہے کچھ بھی ہو)

کچھ لوگ کافی کے بھاپ اڑاتے پلاسٹک کے گلاس لیے کھڑے تھے جو انہوں نے اسی اسٹریٹ میں واقع ایک کافی شاپ سے لیے تھے۔

Today's another day to find you

(آج ایک اور دن ہے تمہیں ڈھونڈنے کے لیے)

Shying away

(شرماتے ہوئے دور ہوئے)

?I'll be coming for your love, OK

(میں تمہارے پیار کے لیے آؤں گا۔ ٹھیک ہے؟)

رولز ریسٹورنٹ اب اپنے دروازے پر کلوزڈ کا بورڈ لگا چکا تھا۔

Take on me,take me on

(مجھے ساتھ لے اپنے، مجھے ساتھ لو)

بوڑھا جانسن نہایت خوبصورتی سے گٹار کی دھن سے وہاں کھڑے لوگوں کو مسحور کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں تھکا تھا۔ وقت اسے کبھی بھی نہیں تھکا سکتا تھا۔

I'll be gone

(میں چلا جاؤں گا)

کافی پینے والے ساتھ ساتھ ایک ہاتھ سے چٹکیاں بھی بجا رہے تھے۔ پریشانیوں کو بھلا کر صرف سارہ کی آواز میں کھو کر۔

In a day or two

(ایک یا دو دن میں)

بوڑھا جانسن بھی گٹار بجا رہا تھا خود کو بھلا کر صرف اپنے گٹار کی دھن میں کھو کر۔

Oh,the things that you say

(او، جو باتیں تم نے کہیں)

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ان لائنز پہ ماریہ کے لب بھی ہلنے لگے۔

...Is it life or

(کیا یہ زندگی ہے یا)

ہجوم میں سے کچھ لوگ جا چکے تھے۔ شائد نیند کی چادر اوڑھ کر سونے کیلیے۔

Just a play my worries away

(صرف میری مشکلات کو دور کرنے کا طریقہ)

سردی کافی حد تک بڑھ چکی تھی۔ شائد اپنا اثر دکھانے کیلیے۔

You're all the things, I've got to

(تم وہ سب کچھ ہو جو میرے پاس ہے)

مگر ماریہ کو فرق نہیں پڑ رہا تھا وہ تو ابھی بھی مگن تھی انہیں لائنز میں۔

Remember

(یاد رکھنا)

You're shying away

(شرماتے ہوئے دور ہوئے)

بچی کی آواز جادو جگا رہی تھی۔ پورا لندن خاموش ہو چکا تھا صرف سارہ کی آواز کو سننے کے لیے۔

I'll be coming for you anyway

(میں پھر بھی تمہارے پاس آؤں گا)

اس کی آواز کافی تھی کسی کو بھی اپنی طرف کھینچنے کے لیے۔

Take on me,take me on

(مجھے ساتھ لو اپنے، مجھے ساتھ لو)

کسی کو بھی اپنے ساتھ لینے کے لیے۔

I'll be gone

(میں چلا جاؤں گا)

In a day or two

(ایک یا دو دن میں)

In a day or two

(ایک یا دو دن میں)

آواز مدھم ہوتے ہوئے اب ختم ہوچکی تھی۔اب وہاں آوز تھی توصرف سننے والوں کی تالیوں کے۔ جو اب اس بچی کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔اور اس کے دل میں سراہے جانے کی خوشی کا سمندر آنکھ کے راستے چھلک پڑا تھا۔ یہ لندن کے باسی ہوتے ہی ایسے ہیں۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کی آنکھیں چھلکنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔وہ اب اچھل رہی تھی۔مارے خوشی سے چیخ رہی تھی۔

لندن کی سنہری روشنیاں صرف اس کی خوشی کو دیکھنے کے لیے جگمگارہی تھیں۔ماریہ کی آنکھوں کے سامنے کامنظر بھی آنسوؤں کی بارش سےبھیگ گیاتھا۔

اس نے اپنی کوٹ میں سے چند سکے نکل کر بوڑھے جانسن کے قریب پڑے نیلے رنگ کے باکس میں ڈال دیے۔بوڑھا جانسن اور سارہ اپنا سامان سمیٹنے میں مگن ہوگئے تھے۔شائد وہ بھی جانے لگے تھے واپس۔

ماریہ نے دیوار کے ساتھ کھڑی کی گئی سائیکل پر سوار ہوکر گھر جانے کی راہ لی اور میڈن روڈ کو پیچھے چھوڑتے آگے بڑھ گئی۔

(_________________)

اُس رات سارہ کا گانا سنتے ہوئے وہ خلافِ معمول بہت زیادہ لیٹ ہوچکی تھی۔ہر طرف اسٹریٹس سنسان نظر آرہی تھیں۔وہ سائیکل کو بہت تیزی سے چلا رہی تھی کیونکہ وہ گھر جلد از جلد پہنچنا چاہتی تھی۔اس کی ماں اسے کئی بار فون کرچکی تھی۔سارا لندن نیند کی آغوش میں سو رہا تھا۔اسٹریٹس میں صرف گھروں کے باہر لگی لائٹس ہی روشن تھیں۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے پیچھے سے کسی سائیکل کے آنے کی آواز محسوس ہوئی تھی۔اُس نے رک کر دیکھنے کی بجائے سائیکل کو مزید سپیڈ سے چلانا شروع کر دیا۔وہ اتنی ہی بہادر تھی۔اس کا سانس اب پھولنے لگا تھا مگر اس نے اسپیڈ کو ذرا بھی کم نہ کیا۔

گلی کا کونہ مڑتے ہی اس کی سائیکل کے اگلے پہیے کے نیچے ناجانے کونسی چیز آئی کہ سائیکل جھٹکے سے نیچے گر گئی۔اوخدایا۔۔۔اس کمبخت کو بھی ابھی ہی گرنا تھا۔اب ماریہ نیچے تھی اور سائیکل اس کے اوپر۔پیچھا کرتی سائیکل گلی کے کونے کے پیچھے ہی رک گئی تھی۔اس سے پہلے اسے کچھ اور سوجھتا،دو اٹھارہ انیس سال کے لڑکے نہایت پھرتی سے اس کے قریب آئے۔شائد اس کی مدد کے لیے۔مگر یہ صرف مادام کا ہی خیال تھا۔انہوں نے اس کے اوپر سے سائیکل ہٹائی اور جھٹ سے اس کی پاکٹس ٹٹولنے لگے۔
اب اس کم عقل کو سارا معللہ سمجھ آیا تھا.اس کی سائیکل کے نیچے آنے والا پتھر انہیں بدتمیز لڑکوں نے رکھا تھااور پیچھے سے آنے والی سائیکل بھی ان کی ہی تھی. مگر یہ بھی صرف ہماری مادام کا ہی خیال تھا. کیونکہ وہ لڑکے توسامنے سے آئے تھے.صورتحال کے سمجھ آتے ہی وہ جھٹ سے کھڑی ہوگئی.اب تماشہ دیکھنے سے تو رہی.اس نے اپنی سائیکل اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی ایک لڑکے نے اسے بازو سے کھینچ کر پیچھے کی جانب دھکا دیا اور اس پر گھونسوں کی بارش شروع کردی۔
اس کے "ہیلپ" پکارنے پر گلی کے کونے سے کوئی اس کی طرف بھاگ کر آتا ہوا محسوس ہوا.شائد یہ ان کا تیسرا دوست تھا. مگر یہ بھی اس کا وہم تھا.وہ ایسا ہی سوچا کرتی تھی.وہ بری طرح زخمی ہوچکی تھی.اس تیسرے شخص نے آتے ہی پاس کھڑے لڑکے کو ایک زبردست گھونسہ رسید کیا جس کی وجہ سے اس کی ناک سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا.اور بڑی تیزی سے ماریہ پہ گھونسے برساتے لڑکے کو کمر سےپکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کیا اور یکے بعد دیگرے تین مکے اس کے منہ پر

رسید کردیے.
وہ دونوں اس حملے سے بوکھلا گئے تھے لیکن لمحہ ہی لگا تھانہیں سنبھلنے میں....وہ بہت چست وچالاک تھے.ان دونوں نے اب اس پر حملہ کر دیا تھا. مگر وہ بھی چٹان کی مانند تھا.اس لڑکی کے لیے تو وہ سارے لندن سے ایک ہی وقت میں لڑ سکتا تھا.
آخر جیت اسی شخص کی ہوئی.ان لڑکوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا.پھر وہ ماریہ کی جانب لپکا جوسڑک پر نیم بے ہوش پڑی تھی.اس کی ناک سے اور نچلے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا.
اس نے ماریہ کا چہرہ اپنی گود میں رکھااور نرمی سے تھپکاتے ہوئے اسے ہوش میں لانے لگا.وہ نیم وا آنکھوں سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی کیونکہ اس نے کوٹ کے کالر کو کھڑا کر کے اس میں چہرہ چھپایا ہوا تھا.ہاں مگر اس کی آنکھیں اس لمحے اسے ضرور شناسا سی لگی تھیں.مدھم سی لائٹ میں بھی وہ نیلے پانیوں کے جیسے چمک رہی تھیں.وہ بس اتنا ہی دیکھ پائی تھی.وہ اسے کچھ کہہ رہا تھا مگر اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا.شائد وہ اپنے حواس کھو رہی تھی.سر ابھی بھی اسی کی گود میں تھا اور چہرہ اس کے ہاتھوں میں.
اس کے بعد کیا ہوا وہ نہیں جانتی تھی.لیکن صبح اس کی آنکھ اپنےہی کمرے میں کھلی تھی.اس کے جسم سے درد کی ٹھیسیں اٹھ رہی تھیں.
پورا جسم ٹوٹا ہوا محسوس ہورہا تھا.اس کی ماں اس کے ساتھ ہی بستر پر سورہی تھی.اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن بڑھتے درد کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیا اور وہ کراہتی ہی رہ گئی.
اس کے کراہنے سے ہی اس کی ماں کی آنکھ کھلی تھی.وہ اپنی بیٹی کی جانب بڑی بے تابی سے لپکی.
ماں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے.اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ محبت اگر کوئی وجود اپناتی تو وہ کونسا ہوتا؟ تو میں بنا سوچے سمجھے کہتی کہ اگر محبت کوئی وجود رکھتی تو وہ ماں کے روپ میں نظر آتی.
کتنی بے تابی تھی اس وقت اس ماں کی آنکھوں میں جو ساون کے مہینے میں برسنے والی برسات کی مانند نظر آرہی تھیں.
"میں ٹھیک ہوں ماں."وہ اپنی ماں کو تسلی دینے لگی جو اس وقت بہت پریشان نظر آہی تھی.
"بس یہ معمولی سی چوٹیں ہیں.بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گی."اس نے مسکراتے ہوئے کہا.اور اس کی ماں دیوانہ وار اس کے ماتھے کو چوم رہی تھی.
وہ کتنی خوش قسمت تھی کہ اس کے پاس دنیا کی سب سے بڑی نعمت موجود تھی.اس نعمت کے لیے اگر انسان اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ سجدہ میں گزار دے تو بھی شکر ادا نہ کر سکے.اولاد کی وجہ سے گیلے ہونے والے بستر پر ماں کی گزرنے والی ایک رات کے مول کے لیے دنیاجہاں کے خزانے کم پڑجائیں.
مائیں توانمول ہوتی ہیں. کسی بہت ہی قیمتی موتی کی طرح.
(..........................)
وہ پچھلے چار دن سے گھر میں ہی پڑی ہوئی تھی.اس نے یونیورسٹی سے آف لے لیا تھااور ریسٹورنٹ کے مینیجر سے بات کرلی تھی.ان لڑکوں کے گھونسوں نے اس کے خوبصورت منہ کو فٹبال بنا دیا تھا.سوزش ذرا کم ہوئی تو اسے اس مسیحا کا خیال آیا.
"ماں"........
"ماں".......
وہ ماں کو پکارتی ہوئی نیچے کیچن میں آگئی.جہاں اس کی ماں کچھ پکانے میں مصروف تھی.
"ہاں میری جان"اس کی ماں اسے یوں دیکھ کر بہار میں سر اٹھانے والی کسی کونپل کی طرح کھل ہی تو گئی تھی.
" کیا بنا رہی ہو ماں؟"وہ پاس والی شیلف پہ ٹانگیں لٹکاتے ہوئے بیٹھ گئی.

"اپنی پیاری سی بیٹی کے لیے میکرونی "اس کی ماں نے اس کے رخسار کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا.

"اچھاماں ایک بات تو بتائیں" وہ شیلف سے اتر کر اپنی ماں کے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی.وہ رازداری کی باتیں یونہی کیا کرتی تھی.

"ہاں پوچھو "اس کی ماں نے چولہے کی آنچ کو دھیما کر دیا.

"ماں اس رات مجھے گھر پہ کون چھوڑنے آیا تھا؟ "اس نے فریج سے سیب نکالتے ہوئے پوچھا.اس کی ماں کا چمچہ چلاتا ہاتھ پل بھر کو رکا اور پھر چلنے لگا.

" کس رات کی بات کر رہی ہو؟"

"جس رات مجھے چوٹیں لگی تھیں. میں تو بے ہوش ہوگئی تھی نا.تو کوئی تو مجھے گھر پہ چھوڑنے آیا ہوگا" اس نے سیب کی ایک بائیٹ لیتے ہوئے پوچھا.

"اواچھا.....اس رات...."اس کی ماں نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا.

"میں تو ہال میں تمہارا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک ڈور بیل بجی میں سمجھی کہ شاید تم آئی ہو.اس لیے دروازہ کھول دیا مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا سوائے تمہارے بےہوش وجود کے اور تمہاری سائیکل کے. میں تو خود ابھی تک پریشان ہوں کہ اس اجنبی لندن میں کون تھا وہ جو مسیحا بن کر آیا تھا"...اس کی ماں اب سبزیوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹنے لگی.اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی.

"لیکن ماں مجھے تو کوئی اینجل ہی لگتا ہے یاپھر کوئی سپر ہیرو جومیرے لیے ان بدتمیزلڑکوں سے لڑا اور اڑاتے ہوئے مجھے یہاں لے آیا اور پھر غائب ہوگیا."سوچ کے سمندر سے نکلتے ہی مادام نے کیابات کی تھی.

اس کی اس بات پر اس کی ماں کی ہنسی بے اختیار چھوٹ پڑی.

"پگلی"اس کا ماں نے اس کے سر پر پیار سے ایک چپت لگائی۔لاور وہ مصنوعی ناراضگی سے اپنے بال ٹھیک کرنے لگی.(اس نے غلط ہی کیا کہا تھا).

(.................................)

چار پانچ دن آرام کرنے کے بعد اسے مجبوری کے طور پر ریسٹورنٹ جانا پڑا.وہ معمول پر آچکی تھی. لیکن ایک سوال اسے ابھی تک تنگ کر رہا تھا کہ وہ سپر ہیرو کون تھا؟

اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کا چہرہ کیوں نہیں دیکھ پائی تھی. لیکن وہ آنکھیں جو مدھم روشنیوں میں بھی نیلے پانیوں کے جیسی نظر آرہی تھیں.

ذہن میں نیلی آنکھوں کا خیال آتے ہی وہ اچھل پڑی تھی.اس کی اس حرکت پہ کچھ ویٹرز وہاں رک کر اسے دیکھنے لگے.یہی لندن کے باسیوں کی خوبصورتی تھی کہ وہ خوشی کے اظہار کے لیے موقع اور جگہ نہیں دیکھتے تھے.

لیکن اگلے ہی لمحے ساری خوشی ہوا بن کر اڑ گئی اسی سوچ پر کہ اس نے ان آنکھوں کو کدھر دیکھا تھا؟

ایک نیا سوال اسے تنگ کرنے کے لیے جنم لے چکا تھا.اب اس کا ذہن ان نیلی آنکھوں کے بھنور میں پھنس چکا تھا.

(.................................)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کئی گزرے ہوئے منظر
کچھ ایسے ایک لمحے کو
پلٹتے ہیں
کہ ان کے ساتھ وابستہ
سبھی کچھ لوٹ آتا ہے

حقیقت اور گماں کی سرحدیں
کچھ اس طرح آپس میں ملتی ہیں
کہ دریا ساتھ چلتا ہے,
کنارا چھوٹ جاتا ہے

میری جاں آج اس لمحے
میرے چاروں طرف تم ہو

میرے حصے میں جتنا آسماں تھا
اس کی وسعت سے
تمہیں نکلے
بہت عرصہ ہوا لیکن
میں اب بھی ہر ستارے میں
تمہیں موجود پاتا ہوں
کچھ ایسے دیکھ سکتا ہوں
کہ جیسے وصل کے
اس آخری لمحے میں دیکھا تھا
جہاں چاروں طرف ہم تھے
ہمارے خواب تھے
اور روشنی کا ایک دریا تھا
وہ دریا جس میں بہتے وقت کی کشتی
کچھ ایسے ایک لمحے کو
ہمارے ساتھ ٹھہری تھی
کسی دیوار پر لٹکی تصویر ہو جیسے

وہی لمحہ,اسی صورت
ہمارے درمیاں جاناں,
پھر ایسے آکے ٹھہرا ہے
کہ ہر جانب ہمی ہم ہیں
ہمارے خواب ہیں
اور روشنی کا ایک دریا ہے

تمہارے وصل کی خوشبو میں
بھیگی رات ہے، تم ہو
زمیں سے آسمان تک
رنگ کی برسات ہے، تم ہو
مگر شعبدہ تو،
اس ستم گر رات سے اب تک
جدائی کی ہر ایک برسی
مجھے یونہی دکھاتی ہے
"میرے چاروں طرف تم ہو"
کہاں گم ہو
کہاں گم ہو

لندن کی سرگوشی کرتی ہوئی دھند ہو منظر کو دھندلا کر رہی تھی بالکل اسی طرح جسطرح کبھی اس کی قسمت نے اس کی آنکھوں کے سامنے والے ہر منظر کو ہر نقش کو دھندلا کر دیا تھا. کسی اپنے, بہت ہی پیارے چہرے کے نقوش کو مدھم کیا تھا.
وہ لمحات کیسے بھلائے جاسکتے ہیں جن میں وہ جان سے پیارا اجڑا ہوا تھا.

(__________________)

ریسٹورنٹ جانے سے پہلے وہ ہارڈراک کیفے سے کافی ضرور پیتی تھی.یہاں کی کافی بہت مشہور تھی اور مزیدار بھی لوگ اپنی تھکن کو کافی کے کپ میں انڈیلنے کے لیے کثیر تعداد میں آتے تھے۔یہاں ہر وقت رش سا جما رہتا۔آج بھی وہ یہاں آئی تھی. گلاس ونڈو کے قریب لگے ٹیبلز میں سے ایک پر وہ بیٹھ گئی۔یہاں کے ویٹرز اب اسے جانتے تھے. کیونکہ وہ ان کی ریگولر کسٹمر تھی.
"ہیلو میم..."ایک ویٹر نے اس کے قریب آکر کہا.
اور اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا.
اس کے آرڈر کیے بنا ہی وہ معمول کی طرح اسے کافی کا کپ پیش کرتے تھے. کیونکہ وہ یہاں آتی ہی صرف کافی پینے تھی.اور سب اس بات سے واقف تھے.
ویٹر کافی کا کپ رکھ کر چلا گیا اور وہ چسکیوں سے کافی پینے لگی. گلاس ونڈو دھند کی وجہ سے باہر کے منظر دھندلے پیش کر رہی تھی.لیکن گلاس ونڈو سے پار کی جانب قطار میں رکھے سرخ پھولوں والے گملے اس دھندلے منظر میں نمایاں نظر آرہے تھے.وہ اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔اس وقت لوگوں کی تعداد کم تھی. لوگ اپنے کاموں سے واپسی پر یہاں سے چائے پینے آتے تھے۔وہ اپنی سیدھ میں لگے ٹیبلز کی جانب متوجہ ہوئی تبھی اس کی نظر شناسی آنکھوں والے چہرے پر پڑی۔وہ لمحہ بھر کو چونکی اور پھر اس کی حیرت خوشی کے تاثرات میں بدل گئی۔وہ دھیرے سے چلتے ہوئے اُس کے ٹیبل کے قریب آ گئی۔وہ اپنے سامنے بلیو کلر کا چارٹ کھولے بیٹھا تھا جس پر کسی عمارت کا نقشہ بنا ہوا تھا.

"ہیلو آسٹن..."اس کا انداز پر جوش تھا.
اتنی چہکتی آواز پر تو کوئی بھی متوجہ ہو سکتا تھا.اس نے گردن اٹھا کر دیکھا.اس کی نیلی آنکھیں پہلے حیرت سے پھیلیں اور پھر خوشی کے مارے سکڑ گئیں.
"ہیلو.."وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا.
"ارے۔۔۔تم یہاں؟"آسٹن کو ابھی بھی یقین نہیں آیا تھا.
"میں تو یہاں روز آتی ہوں."ماریہ نے دائیں ہاتھ سے بالوں کی ایک لٹ کو کان کے پیچھے کیا۔
"اچھا.....پھر شاید میں آج یہاں پہلی بار آیا ہوں."آسٹن نے اپنی پی کیپ درست کی۔
"ہاہاہاہا..."آسٹن کے کہنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ ماریہ کا ایک بے ساختہ قہقہہ کیفے کے پرسکون ماحول میں ابھرا۔
"تم واقعی آج پہلی بار یہاں آئے ہو"بھوری آنکھوں کے کٹورے پانیوں سے بھر گئے. یہ لندن کے باسی ہوتے ہی ایسے ہیں,زیادہ ہنس لیں تو آنکھوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا چھلکنے لگتا ہے.
"تم کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو۔"آسٹن نے سامنے رکھی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔
"کچھ جلدی ہی خیال آ گیا."وہ اس بات کو سوچ کر مسکراتے ہوئے کرسی پیچھے کی جانب کھینچ کر بیٹھ گئی.دونوں کے درمیان کچھ دیر خاموشی چھائی رہی جسے آسٹن نے ہی توڑا.
"کیا لو گی؟"اس نے مینیو کارڈ ماریہ کی طرف بڑھایا۔
"نہیں, کچھ نہیں....میں کافی پی چکی ہوں.شکریہ."اس نے مینیو کارڈ واپس اس کی جانب سرکا دیا.
آسٹن نے اصرار بھی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ اسے کافی پیتے ہوئے دیکھ چکا تھا ابھی تو وہ بس انجان بن رہا تھا.
"وہ میں تمہیں شکریہ کہنا چاہتی ہوں."ماریہ نے بات چیت کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔
"شکریہ؟"نا سمجھتے ہوئے اس کے چارٹ فلڈ کرتے ہاتھ رک گئے.اس نے سوالیہ نظروں سے ماریہ کو دیکھا.
"اس رات اگر تم وہاں نہ آتے تو وہ بدتمیز لڑکے مجھے گھونسے مار مار کر میرا حشر نشر کر دیتے."اس نے خوف سے جھرجھری سی لی۔
اس بات پر ایک خوبصورت سی مسکراہٹ آسٹن کے لبوں کو چھو کر گزر گئی.
"یہ تو میرا فرض ہے لی کسی کی بھی مشکل میں مدد کرنا.مگر تم آئندہ خیال رکھنا اب ہر جگہ تو آسٹن نہیں آسکتا ناں."آسٹن نے کیپ کو درست کرتے دلکش مسکراہٹ سے جواب دیا. کیپ کو بار بار درست کرنا اس کی عادت تھی.
"جی ضرور..."وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی.
"میں اب چلتی ہوں. مجھے ریسٹورنٹ کے لیے دیر ہو رہی ہے" اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا. آسٹن چارٹ ٹیبل پر رکھتے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے دوبارہ تم سے مل کر خوشی ہو گی۔"اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا.

"جی ضرور۔اگر زندگی نے موقع دیا تو۔"اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور واپسی کی جانب قدم بڑھا دیے۔اچانک کچھ یاد آنے پر وہ واپس مڑی۔آسٹن جانے کے لیے اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

"تم اس دن میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟"بھلکڑ کو جو بات پہلے کرنی چاہیے تھی وہ اب کر رہی تھی۔جواب میں اُس نے بس مسکرانے پر اکتفا کیا اور پھر کچھ توقف سے کہا۔

"دیکھو ماریہ! تم رات کو گھر جلدی جانے کی کوشش کیا کرو ورنہ لندن کی تاریکی تمہیں کو نگل جائے گی۔"یہ بات ماریہ کے سر کے بالکل اوپر سے گزر گئی تھی پھر بھی اس نے زور زور سے ہاں میں سر ہلا دیا۔آسٹن جان چکا تھا مگر اُس وقت وہ اسے کتنی پیاری لگی تھی یہ بات صرف وہ جانتا تھا یا پھر کیفے میں بجتا پیانو جو لمحہ بہ لمحہ شوخ ہو رہا تھا۔

(_________________)

ہر گزرتا لمحہ دونوں کی دوستی کی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔وہ دونوں اب زیادہ تر ایک ساتھ ہی دیکھے جاتے تھے۔اجنبی لندن میں کوئی اپنا مل گیا ہو جیسے۔

"بے شک انسان امیر وقت ہو لیکن وہ تب تک غریب ہی ہے جب تک اس کا کوئی دوست نہیں۔مال وزر سے ہر نایاب چیز قدموں کو بوسہ دینے لگتی ہے لیکن چاہنے والے دوست کے سامنے یہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔"

آسٹن بھی ایک چاہنے والا دوست تھا۔ایسا دوست جو رات کے پچھلے پہر بھی اس کے لیے جاگتا تھا۔ چپکے چپکے سے اس کی حفاظت کیا کرتا تھا۔اب تو لندن کی تاریکی بھی اسے خوف زدہ نہیں کرتی تھی۔وہ لوگوں سے کم ملتی جلتی تھی۔اس کا حلقہ احباب تھا ہی نہیں۔یونی ورسٹی میں بھی اس نے کسی سے دوستی نہیں کی تھی۔زندگی میں پہلی بار اس نے دوستی کی تو صرف آسٹن کے روپ میں ایک اینجل سے۔وہ بہت خوش تھی۔

اور آسٹن کے تو قدم ہی اب زمین پر نہیں لگتے تھے۔وہ تو فضاؤں میں اُس پنچھی کی مانند اڑتا نظر آتا تھا جو مراد پا گیا ہو۔اس خوشی کو کبھی نظر نہ لگے لیکن آہ! یہ خوشیاں بھی تو عارضی ہوتی ہیں۔

(_________________)

لندن میں ہالووین ویک منانے کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔چھوٹوں سے لیکر بوڑھوں تک ہر کوئی اس دن کو اسپیشل بنانے میں مگن تھا۔اسٹریٹس کو ہارر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی تھی۔ گھر کے ہر کونے سے لیکر باہر اسٹریٹ تک ہر چیز پر ہالووین کا اثر ڈالا جا رہا تھا۔

اس لندن میں صرف ماریہ ہی ایسی تھی جو ہالووین کو سیلیبریٹ نہیں کرتی تھی۔یہ نہیں تھا کہ اسے ان چیزوں میں دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ فطری طور پر بہت ڈرپوک واقع ہوئی تھی۔اُس کی تو ایسی چیزیں دیکھ کر ہی جان نکل جاتی تھی تو پھر ان چیزوں کو اپنے گھر لانا بہت دور کی بات تھی۔وہ ہالووین کے لیے ارینج کی گئی پارٹیز میں بھی نہیں جاتی تھی۔ان دنوں جب وہ باہر نکلتی تو اپنے لندن کو ایک خوفناک دنیا کا حصہ پاتی۔رات کو گھر واپسی پر جب اس کے بلاک کے بچے اسے ماسک پہن کر ڈراتے تو وہ فلک شگاف چیخیں رات کی خاموشی کی نذر کیا کرتی تھی۔تب اسے ان بچوں پر بہت غصہ آتا تھا جو باقی دنوں میں اسے بہت پسند ہوتے تھے۔

اس کے برعکس آسٹن ان دنوں کو خوب انجوائے کیا کرتا تھا(جن کہیں کا)۔اُس نے اس دفعہ ماریہ کو بھی اپنی پارٹی میں انوائٹ کیا تھا۔ماریہ نے بہت بار انکار کیا مگر آسٹن کے بے حد اصرار کے آگے اسے ہامی بھرنی ہی پڑی مگر صرف اس شرط پر کہ آسٹن خود اسے پارٹی میں لیکر بھی جائے گا اور واپس چھوڑنے بھی آئے گا۔اور بے چارے آسٹن کو یہ بات ماننا ہی پڑی۔وہ تو رات کو باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔بھوتوں کی دنیا میں سفر کرنا کسے کہتے ہیں یہ لندن کی گلیاں ہالووین نائٹ پر دکھا دیتی تھیں۔لیکن یہ صرف ماریہ کا ہی خیال تھا ورنہ پورا لندن سارا سال اسی دن کا انتظار کرتا تھا۔

رات کے گیارہ بجے آسٹن اسے اپنے ساتھ لینے آیا۔وہ اپنی ماں کو بتا کو اس کے ساتھ آگئی۔اس نے آج بھی وہی بلیک اوور کوٹ پہنا ہوا تھا۔اُس کا فلیٹ ماریہ کہ گھر سے واکنگ ڈسٹنس پر ہی تھا۔اسٹریٹس سے بھیانک اس وقت دنیا کا کوئی منظر نہیں تھا۔

زرد روشنیوں میں ڈوبا لندن ایک وحشت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔

وہ اسے پارٹی کے بارے میں بتا رہا تھا۔اس کے سب دوست وہاں آنے والے تھے۔اور وہ بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر آسٹن کو کچھ یاد آیا۔اور وہ ٹھہر گیا۔

"او۔۔۔۔مجھے کھانے کے لیے کچھ لینا تھا جلدی میں بھول گیا تم ایسا کرو اندر چلی جاؤ میرے فرینڈز بھی وہیں ہیں۔ان سے گپ شپ کرو تب تک میں بھی آجاؤں گا۔"وہ دروازے سے ہی واپس چلا گیا۔

اُس نے دروازہ کھول کر قدم اندر رکھے مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔شاید وہ کمرے میں ہوں گے۔اس خیال کے تحت اس نے کمرے کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا خوف کی ایک لہر اس کے جسم سے گزر گئی۔اُس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں دروازے کے پاس ایک سر کٹا بھوت کھڑا تھا جس کی گردن سے بہت سارا خون بہہ رہا تھا۔اسے دیکھتے ہی ماریہ کا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔اتنا خوفناک منظر تو اسے کبھی برے سے برے خواب میں بھی نظر نہیں آیا تھا مگر یہ تو حقیقت میں تھا آنکھوں کے سامنے۔اُس نے خود کو آسٹن کو پکارتے ہوئے پایا۔مگر وہ ہل کوئی نہیں آیا۔

وہ بے ساختہ کمرے کی جانب بھاگی لیکن کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر گئی۔وہ کسی کا پاؤں تھا شاید۔اُس نے اٹھ کر دیکھا تو وہ بھیانک چہرے والی چڑیل تھی جو کہ دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھی تھی۔اس کی گردن ایک طرف کو لٹکی ہوئی تھی۔لمبے لمبے خون سے گیلے بال آدھے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے اور ہاتھ کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں جن سے خون بہہ رہا تھا۔اس کے ٹھوکر لگتے ہی کمرے سے عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں۔دل دہلا دینے والی بھیانک قسم کی۔

خوف کے مارے اس کا سانس بند ہونے لگا تھا۔آواز گلے میں ہی اٹک چکی تھی۔تبھی کسی نے پیچھے سے اسے بازو سے پکڑ کو کھڑا کیا۔وہ سمجھی کہ شاید آسٹن ہے۔وہ تیزی سے پلٹی مگر سفید کپڑوں میں لپٹے ڈھانچے کو دیکھ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی اور چکرا کر نیچے گر گئی۔

(____________________)

چہرے پر پانی کے چھینٹے پڑنے سے وہ واپس ہوش کی دنیا میں آئی۔اُس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں اور سر کو حرکت دے کر دائیں جانب دیکھا۔آسٹن اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا جبکہ اس کے دوست ٹالی، آرنلڈ اور چارلس اس کے قریب ہی پریشان سے کھڑے تھے۔

"تم ٹھیک ہو؟"آسٹن نے نرمی سے اس کا چہرہ چھویا۔اس نے دھیرے سے ہاں میں سر ہلایا۔آسٹن نے اسے پانی کا گلاس دیا۔ماریہ نے بس چند گھونٹ بھرے اور گلاس واپس آسٹن کو تھما دیا۔

" کیا ہوا تھا ماریہ؟" آسٹن کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے یہ پوچھنے پر ماریہ نے ساری روداد بنا سانس لیے اسے سنا دی۔ کچھ دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔ اس نے حیرت سے ان سب کی جانب دیکھا جو خاموشی سے بس اسے ہی تکے جا رہے تھے۔ اس کے یوں دیکھنے پر پورا کمرہ ان چاروں کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔ وہ سب اب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر اسے پورا معاملہ سمجھ میں آیا۔ یعنی کہ وہ سب ڈرامہ آسٹن اور اس کے ان بھوتیہ دوستوں کا رچایا ہوا تھا۔

اُس نے گھور کر ان سب کو دیکھا تو وہ سب یکدم سنجیدہ ہو گئے۔

"ہیپی ہالووین ڈیئر۔" آسٹن نے چہرے پر ایک بھیانک ماسک چڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کے یوں کہنے پر ماریہ نے صوفے کی گدیاں اٹھا کر انہیں مارنی شروع کر دیں۔

وہ سب اس کا مذاق اڑا رہے تھے مگر اب اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ کس نے کہا تھا اوور ری ایکٹ کرنے کا۔

"یار تم تو واقعی بہت ڈرپوک نکلی۔" آسٹن نے اپنی سانس بحل کرتے ہوئے کہا۔

" مجھے تو لگا تھا کہ میرا چہرہ دیکھ کر ہی اوپر پہنچ گئی ہے۔" یہ ٹالی تھی جو پیٹ پکڑتے ہوئے دھڑام صوفے پہ آ گری تھی۔ اس نے ہی چڑیل کا ناٹک کیا تھا۔

"اور۔۔۔اور۔۔۔اور یہ ہیلپ کے لیے آسٹن کو پکار رہی تھی جس نے خود یہ سب پلان کیا تھا۔" آرنلڈ نے ماریہ کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ اس پر ماریہ نے کھینچ کر ایک گدی آسٹن کو لگائی جو اپنی کمر ہی سہلاتا رہ گیا۔

"تو کیسا رہا تمہارا ہالووین کا تجربہ؟؟" چارلس بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

"بہت برا۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو۔۔۔؟" وہ دوسری طرف چہرہ کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے دوست ابھی بھی ہنس رہے تھے۔

اتمہیں کچھ نہیں ہونا تھا۔" آسٹن نے اپنی ہنسی کو کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"وہ کیوں؟" وہ حیرت سے پلٹی۔

"وہ اس لیے کہ آپ تو اس وقت خود سب سے زیادہ ڈراؤنی لگ رہی ہیں مادام۔" جواب چارلس کی طرف سے آیا تھا۔

'مطلب؟" اس نے نا سمجھتے ہوئے اس کو دیکھا۔

"ٹالی! ذرا ماریہ کو شیشہ دکھانا۔" آرنلڈ نے پانی کی بوتل منہ کو لگاتے ہوئے کہا۔

ٹالی چلی گئی اور کچھ ہی دیر میں ہاتھ میں میک اپ والا چھوٹا سا آئینہ لیکر واپس آ گئی۔ اس نے اسے ماریہ کے چہرے کے آگے کیا۔ آئینہ دیکھتے ہی ماریہ کی چیخ نکل گئی۔ اور وہ سب پھر بلند آواز میں قہقہے لگانے لگے۔ اس کے بے ہوش ہونے کے دوران ہی ان سب نے مل کر اس کے چہرے کو میک اپ کی مدد سے بھیانک بنا دیا تھا۔

"بہت برے ہو تم سب۔" ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ بھی اپنی ہنسی کو قابو میں نہ رکھ سکی۔

" چلیں ان بروں میں ایک اور برے انسان کا اضافہ ہو گیا۔" ماریہ نے ایک دھپ اسے رسید کی مگر وہ پھر بھی سنجیدہ نہیں ہوا۔

" بھئی ہم تو ایسے ہی ہیں۔" چارلس نے بیڈ پر نیم دراز لیٹتے ہوئے کہا۔

"اور ایسے ہی رہیں گے۔" آرنلڈ نے آسٹن کے شانے پر ہاتھوں سے اپنا وزن ڈالتے ہوئے کہا جس سے آسٹن کراہتا ہی رہ گیا۔

(_______________________)

ایہہ شیر بہادر غازی نیں، اے کسے کولوں وی ہردے نئیں
اینہاں دشمنل کولوں کی ڈرنا، اے موت کولوں وی ڈردے نئیں

ایہہ اپنے دیس دی عزت توں، جان اپنی دیندے ول کڑے
ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے"

میڈم نور جہاں کی آواز فضا میں جادو جگا رہی تھی۔ میجر بلال آن ڈیوٹی ریڈیو سے دل بہلا رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ سورج کی کرنیں نیلے آسمان پر ڈھیرے سے پھیل رہی تھیں خوش گلو پرندے بھی اس گیت میں میڈم نور جہاں کا ساتھ دے رہے تھے۔ عجب سحر طاری کر دینے والا وقت تھا۔ میجر بلال خیمے کے پاس والے درخت کے مضبوط تنے سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ وہ پوری طرح اس گیت میں مگن تھے۔ یہ ان کے پسندیدہ گیتوں میں سے ایک تھا۔
کچھ ہی فاصلے پر نائیک عطاءاللہ غازی لکڑیوں سے جلائی گئی آگ پر کیتلی رکھ کر چائے بنا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ میں اس گانے کو زیرِ لب دہرا رہے تھے۔

"دھن بھاگ نیں اوہناں ماواں دے، جنہاں ماواں دے ایہہ جائے نیں
دھن بھاگ نیں بہن بھراواں دے، جنہاں گودیاں ویر کھڈائے نیں
ایہہ آن نیں آناں والیاں دے، نئیں ایس دی تینوں سڈ کڑے
ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے"

چائے تیار ہو چکی تھی۔ انہوں نے ایک کپڑے کی مدد سے کیتلی کو آگ کے حصار سے چھڑایا اور چھوٹے چھوٹے سبز رنگ کے کپوں میں چائے کو انڈیلا۔ چائے میں دودھ کم تھا اور پانی زیادہ مگر آن ڈیوٹی یہی کافی تھا۔

”ایہہ سودا نقد وی نئیں ملدا، تولبدی پھریں ادھلا کڑے
ایہہ پتر ہٹاں تئی نئیں وکدے، کی لبنی اے وچ بازار کڑے
ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے“

میڈم نورجہاں کی آواز مدھم ہورہی تھی۔نائیک عطاءاللہ غازی دو کپ اٹھا کر میجر بلال کے پاس چلے آئے جو ابھی بھی اسی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"سر جی۔"عطاءاللہ نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

میجر بلال نے آنکھیں وا کیں۔عطاءاللہ کی طرف دیکھتے ہی میجر بلال کے چہرے پرخوشی کے رنگ کھل گئے۔میجت بلال تھے ہی ایسے۔وہ سب کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے خاڈطور پر عطاءاللہ کو دیکھ کر۔

"شکریہ جناب۔میں چائے کا ہی انتظا کررہاتھا مگر بڑی دیر لگادی مہرباں آتے آتے۔"چہرے پر وہی دلکش مسکراہٹ تھی۔انہوں نے ریڈیو بند کردیااور ٹیک چھوڑتے ہوئے چائے کا کپ تھام لیا۔

"بس سر جی۔دودھ لانے میں دیر ہوگئی۔"عطاءاللہ نے ایک چسکی لیتے ہوئے وجہ بتائی۔

" کوئی بات نہیں۔چائے تو مل ہی گئی ہے ناں۔بے شک دیر سے ہی۔"ان کے چہرے پر ابھی بھی وہی مسکراہٹ تھی جو عطاءاللہ برسوں سے ان کے چہرے پر دیکھتے آرہے تھے۔

"عطاءاللہ!ایک بات پوچھوں؟"میجر بلال نے عطاءاللہ کا جھریوں سے بھراچہرا بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"حکم کریں سر جی۔"عطاءاللہ چوکناہو کر بیٹھ گئے۔

"عطاءاللہ تم اتناعرصہ آرمی میں رہے ہو۔پھر بھی ریٹائر ہونے کے بعد بھی تم نے خود کو مدد کے لیےپیش کردیا۔عمر کے اس حصے میں تو تمہیں اب آرام کرنا چاہیے۔"ناجانے یہ بات میجر بلال کو کیوں سوجھی تھی۔

"سر جی میں تب تک آرمی میں رہوں گا جب تک میرانام عطاءاللہ غازی سے عطاءاللہ شہید نہیں ہوجاتا۔میں ان میدانوں میں اس وقت تک آتا رہوں گا جب تک سینے پہ دشمن کی گولی نہیں کھالیتا۔یہ مٹی مجھے جب جب بھی بلائے گی میں سر کے بل دوڑا آؤں گا۔مجھے یہاں زیادہ سکون ملتا ہے

۔میں جو پل فوج کی خدمت میں گزارتاہوں وہ مجھے زیادہ خوشی دیتے ہیں۔بس جس دن مجھے لگے گا کہ میں نے اس مٹی کا قرض چکادیا ہے تو اس دن چین سے اسی مٹی کی چادر اوڑھ کو سوجاؤں گا۔“

فرطِ جذبات سے عطاءاللہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔وہ اس وطن سے،اس کے لوگوں سے،اس کی فوج سے بے لوث محبت کرتے تھے۔

میجر بلال ہمیشہ سے عطاءاللہ غازی سے بہت متاثر تھے۔اس وقت بھی وہ لاجواب ہو چکے تھے۔عطاءاللہ غازی ان کے لیے ایک مثال تھے۔وہ جب بھی کسی مشن پر جاتے نائیک عطاءاللہ غازی کی باتیں انہیں ہمیشہ ایک نیاجذبہ دیتی تھیں۔

"عطاءاللہ اگر میں لڑکی ہوتا تو تمہارہی ہی دلہن بنتا۔"میجر بلال نے لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے کہا۔جس سے دونوں کے قہقہے چھوٹ گئے۔

(____________)

کیپٹن عارف اپنے ساتھ بیس اور نوجوان اہلکار لیکر آئے تھے۔ان سب کو ایل او سی پرتعین کردیا گیا۔بھارت ایل او سی کے معاہدات کی خلاف ورزی کررہا تھا۔اسی لیے ایل او سی پر سکیورٹی کو مضبوط تر مضبوط کیا جارہاتھا۔ان سب کو میجر بلال کے انڈر کام کرنا تھا۔کیپٹن علطف کو میجر بلال کی مدد کے لیے ہی بھیجا گیا تھا۔وہ وقتاًفوقتاًہیڈ آفس میں بریفنگ کرتے تھے۔دشمن وقفے وقفے سے دیوانوں کی طرح ول کررہاتھا۔بزدلوں کے ول کرنے کا یہی طریقہ ہوتاہے۔جوابی

کاروائی پہ دشمنوں کومنہ کی کھانی پڑتی۔

ایک طرف ضرب عضب آپریشن اور دوسری طرف بھارت کی ہڈدھرمی۔اس وقت میں ملک میں حالات بھی کافی نازک چل رہے تھے۔اور یہ ساری کی ساری پریشانی ان نوجوانوں کے کندھوں پر دھری ہوئی تھی۔

میجر بلال صفِ اول میں تھے۔اس منصوبے میں کیپٹن عاطف کو صرف ہدایات پہنچانے کا کام ہی سونپا گیا۔دشمن کو دیکھ کر خون کا کھولنا ایک فطری عمل ہے۔لیکن ٹاک جنگیں جوش سے نہیں ہوش سے لڑی جاتی ہیں۔اور اس دیس کے لوگ تو ویسے بھی دشمن کی جانوں کو نقصان پہنچانے کا نہیں سوچتے۔یہ تو امن کے سفیر ہیں۔امن کے چرغ روشن کرتے ہیں۔اس دیس کے باسی امن وسامتی کے دیوتاہیں۔

(____________)

رات کے پچھلے پہر جب چہار سوسناٹاچھایا ہوا تھا۔ہر کوئی اپنے نرم وگرم بستروں میں بے فکری کی نیند سورہاتھا۔تب بھی یہ شیر دل جوان جاگ رہے تھے۔یہ جاگتے ہیں تو ہم چین کی نیند سوتے ہیں۔ناجانے دشمن کو رات کے اس پہر کیا سوجھی تھی کہ اس نے اندھادھند فائرنگ شروع کردی۔یہ حملہ اچانک تھا مگر اس ملک کے محافظ ہر حملے کے لیے تیار رتھے۔جواب میں میجر بلال اور ان کے ساتھی اہلکاروں نے بھی خوب فائرنگ کی۔ایک گھنٹے تک یہ سنسنی خیز فائرنگ جاری رہی جس میں دو پاکستانی بہادروں نے جامِ شہادت نوش کیا۔لیلن ان اہکاروں کا یہ حملہ دشمن کی کمر توڑنے کے لیے کافی تھا۔دوسری طرف زیادہ اہلکار جہنم واصل ہوئے تھے ا۔اگر کوئی بچابگی تھا تو وہ بھی زخمی چوہے کی طرح بل میں دبک کربیٹھ گیا تھا۔چلے تھے سانپ کی بل میں ہاتھ ڈالنے۔

رات کے اس پہر جب آکاش پر چاند پوری طرح روشن تھا اللہ اکبر کے نعرے نے ان مومنوں کے ایمان کو اور تازہ کردیا۔سلام ہے ان مجاہدوں پر۔

شہداء کے جسدخاکی کو مین کیمپس میں بھیجنے کے بعد ان نڈرسپاہیوں نے خدا کے آگے سجدہ کیا۔فجر کا وقت ہو گیا تھا اور مجاہدوں کی صفوں کی امامت میجر بلال نے ہی کروائی تھی۔خشوع وخضوع سے نماز کی ادائیگی کے بعد سب نے دل سے ملک وقوم کی امن وسلامتی کی دعائیں مانگی تھیں۔

(____________)

اگلے روز ان مجاہدوں کی کپتانی کیپٹن عاطف کو سونپ دی گئی۔اور ان کا کام کیپٹن علبد کردے دیا گیا جنہیں کیپٹن عاطف کی ہی جگہ پر بھیجا گیا تھا۔میجر بلال صبح صبح ہی ہیڈ آفس چلے گئے تھے جہاں پہ ایک نہایت اہم میٹنگ ہونے ولی تھی اور میجر بلال کو وہاں ساری صورتحال کی بریفنگ کرنا تھی۔

میٹنگ میں نہایت نازک پہلوؤں پہ گفتگو کی گئی اور دشمن سے نبٹنے کے لیے ایک نیالائحہ عمل ترتیب دیا گیا۔میجر بلال ہدایات لیکر چلے گئےاور نئے منصوبے کے تحت اہلکاروں کی پوزیشنز تبدیل کردیں۔بھارت کے لیے پچھلا جواب ہی کافی تھا۔شاید اسی لیے اپنے زخموں کے بھرنے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

(____________)

رات کا وقت تھا۔سردی کافی حد تک بڑھ چکی تھی۔کیپٹن عابد، کیپٹن عاطف،نائیک عطاءاللہ غازی اور میجر بلال خیمے کے اندر انگیٹھی کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے ا۔نگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے جن سے خیمہ کافی حدتک گرم تھا۔وہ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"سر آپ اتنے وجیہہ شخصیت کے مالک ہیں،ہینڈسم ہیں،گڈلکنگ ہیں اوراوپر سے قدرت نےاور مہربان ہوکر آپ کو کیلنگ اسائل سے بھی نواز دیا۔لڑکیاں تو ویسے ہی آپ کو دیکھ کر آپ کی دیوانی ہوجاتی ہوں گی؟" کیپٹن عابد سب کا انٹرویو لے رہے تھے اور اب میجر بلال ان کے ہاتھ چڑھ گئے تھے۔

"ہوسکتاہے۔میں نے کبھی غور نہیں کیا۔"میجر بلال کو خوب بننا آتا تھا۔

"لڑکیاں تو آپ کو پرپوز کرتی ہی ہوں گی کیا آپ نے کبھی خو کسی لڑکی کو پرپوز کیا؟" کیپٹن عابد اندر کی بات اگلوانے کی کوشش کررہے تھے۔اس پر میجر بلال نے انہیں گھورا بھی مگر وہ باز نہ آئے۔

"ہاں کیا تھا ایک بار۔"وہ سب ایسے متوجہ ہوئے تھے جیسے وہ پوری کہانی سنانے لگے ہوں۔

"کسے کیا تھا سر؟" کیپٹن عاطف نے بے صبری کا مظاہرہ کیا جو ان کی بچپن سے عادت تھی۔

"یہ جو اپنے نائیک عطاءاللہ ہیں ناں۔ان کو ہی کیا تھا۔"شرارت ان کے چہرے سے واضح چھلک رہی تھی۔ان کو میجر بلال سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی سوائے عطاءاللہ کے۔ جواب ان کو کافی حد تک جان چکے تھے۔

"نائیک عطاءاللہ کو؟"وہ دونوں ایک ساتھ حیرت سے بولے۔

"ہاں نائیک عطاءاللہ کو۔ میں نے اسے کہا تھا کہ عطاءاللہ اگر میں لڑکی ہوتا تو تمہاری ہی دلہن بنتا۔ میجر بلال کے چہرے پر وہی دلکش مسکراہٹ تھی جس کے سب دیوانے تھے۔

" کیوں بھئی عطاءاللہ صاحب۔ میں نے تمہیں پرپوز نہیں کیا تھا؟"وہ اب عطاءاللہ کی جانب متوجہ ہوئے جو بس ہنسے ہی جارہا تھا۔

" کیا ہے صاب جی۔آج تو مجھے جانے دیں۔"چہرے پر بلا کی مسکینیت تھی۔ میجر صاحب انہیں ہمیشہ یونہی تنگ کرتے تھے۔

"کدھر جانے دیں آپ کو؟"ان کی آنکھوں میں شرارت واضح تھی۔

"وہ تو آپ نے لڑکی بن کر پرپوز کیا تھاناں۔لڑکا بن کر کسے پرپوز کیا تھا؟" کیپٹن عابد سے صبر نہیں ہورہا تھا وہ جانتے تھے کہ میجر صاحب بات کو گول مول کررہے ہیں۔

"زندگی میں ایک بار ہی پرپوز کیا جاتا ہے۔ بے شک لڑکا بن کر کرو یا لڑکی بن کر۔"وہ بھی میجر بلال تھے۔اتنی آسانی سے جواب دینے والے نہیں تھے۔

"پھر بھی بتائیے ناں۔ہم کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔"اف کیپٹن عاطف کا بچپنا ابھی گیا نہیں ۔اس پر میجر بلال بے ساختہ ہنس دیے۔

"ہاہاہاہا۔۔۔۔۔۔ چلو بتا دیتا ہوں کیا یاد کروگے؟"انہوں نے فرضی کالر کھڑے کیے۔وہ سب جواب کے منتظر ہوگئے جیسے وہ بتا ہی دیں گے۔

"لڑکی ہی تھی ایک۔"انہوں نے اپنی ہنسی کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ہمیں بھی پتا ہے کہ وہ لڑکی ہی ہوگی۔اب لڑکے کو تو پرپوز کرنے سے رہے۔" کیپٹن عاطف نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"لیکن سچ بتاؤں۔ میں نے لڑکے کو ہی پرپوز کیا تھا۔ میجر بلال نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلیں یہی بتادیں کہ کیسے پرپوز کیا تھا؟" کیپٹن عابد اب چڑ رہے تھے۔

"وہ ایسے کہ۔۔۔۔۔۔۔ عطاءاللہ اگر میں لڑکی ہوتا تو تمہاری ہی دلہن بنتا۔"(حد کرتے ہیں میجر بلال بھی)۔

"عطاءاللہ نئ دلہن مبارک ہو۔"وہ دونوں یہ الفاظ پیس پیس کر کہتے ہوئے باہر چلے گئے اور میجر بلال کے بے ساختہ قہقہے نے ان کو دور تک پیچھا کیا۔

"صاب جی آپ بھی ناں۔"نائیک عطاءاللہ انیسویں صدی کی لڑکیوں کی طرح نظر آرہے تھے۔

"اوئے ہوئے۔"میجر بلال نے ایک چٹکی ان کے بازو پہ کاٹتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں کہا۔جس پر عطاءاللہ بھی باہر چلے گئے۔کیونکہ میجر صاحب کے ساتھ بیٹھے سے بہتر تھا کہ بندہ باہر سردی میں ہی بیٹھ جائے۔

(——————)

یہ جو مسافر ہیں
اک زمانہ بیت گیا ہے
سرحد کی پگڈنڈیوں پہ
دوڑتے ہوئے
ان کے پاؤں گردآلود ہیں

مگر ان کے پرعزم چہرے
فرطِ شوق سے چمک رہے ہیں
تھکن کے کوئی آثار نہیں
یوں دکھائی دیتا ہے کہ
زندگی اپنے جوبن پر ہے
اک جستجو ہے
جو بیٹھنے نہیں دیتی
ایک طلب ہے جو
رگ و جاں کے
ہر ریشے میں سما گئی ہے
اس عجب موڑ پر آکے
موت بھی زندگی سے
گھبرا گئی ہے
رات بھی جاگتے جاگتے
سو جاتی ہے
مگر گردشِ دوراں کی نبض
تھامے ہوئے
یہ گمنام چہرے
برسوں سے جاگ رہے ہیں
وقت کوئی بھی کھیل کھیلے
بازی جو بھی رخ بدلے
اک بات تو طے ہے
اگر ان مسافروں کے چلتے
قدم رک گئے
اگر ان کا سفر تھم گیا
تو پھر شاید
اس دھرتی پہ
ہر اک کو سفر پر نکلنا ہوگا
کہیں یہ حادثہ نہ ہو

اس لیے تو جاگ رہے ہیں

یہ جو مسافر ہیں

"اور سلام ہے ان مسافروں پر کہ جن کو لمبی مسافت بھی تھکانے میں ناکام رہتی ہے۔موت بھی جن کے روبرو آنے پر گھبراتی ہے۔سلام ہے ان جیالوں پر جو سر پر کفن باندھ کر نکلتے ہیں۔سلام ہے ان تاریخ سازوں پر کہ جن کی بہادری کے قصے تاریخ بڑے فخر سے بیاں کرتی ہے۔سلام ہے اس دھرتی کے بیٹوں پر کہ جو اس کی حفاظت کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ وار دیتے ہیں۔"

میجر بلال کی ڈائری ایسے الفاظ سے بھری ہوئی تھی جو مشکل وقت میں بھی انہیں ہارنے نہیں دیتے تھے۔یہ تو دھرتی ماں سے عشق تھا جو الفاظ کی صورت ان کی ڈائری کے اوراق پہ بہہ نکلا تھا۔شاعری ان کا پسندیدہ ترین مشغلہ تھی۔ان کی شاعری زیادہ تر وطن سے محبت کی عکاسی کرتی تھی۔

(______________)

ایل۔او۔سی پہ بھارت کی جارحیت تھم چکی تھی۔ لیکن ملک کو ابھی ایک مسئلہ درپیش تھا اور وہ تھا روز کی بڑھتی ہوئی دہشت گردی۔دشمنوں کا یہ پرانا ہتھکنڈا ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے پر تلا ہوا تھا۔لیکن مادرِ گیتی کے بیٹے اس کے ہر منصوبے کو ناکام کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

ایل او سی پر تعین میجر بلال، کیپٹن عاطف اور کیپٹن عابد کا انتخاب ضربِ عضب کے لئے کیا گیا۔ان کی جگہ نئی نفری کو وہاں مقرر کر دیا گیا۔

اور ان سب کو آپریشن کے لیے تربیتی کیمپس میں بھیج دیا گیا۔جہاں ان سب کو اس آپریشن کے لیے خاص تربیت دی جانی تھی۔

(__________)

اگلی صبح ان سب کو پاکستان کے قبائلی علاقے وزیرستان جانا تھا جہاں دشمن جہنم واصل ہونے کے لیے اور اس ملک کے جانباز سپاہی جام شہادت نوش فرمانے کے لیے بے تاب تھے۔

رات کے وقت میجر بلال اور ان کی قیادت میں جانے والے اہلکار خیموں کے باہر بون فائر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔وہ سب اپنی حسین یادوں کو وہاں ہوا میں نقش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔کل کون رہے گا یہ بات ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔لیکن آج وہ سب یہاں موجود تھے اور یہی کافی تھا۔

میجر بلال کو شاعری کرنا بہت پسند تھا۔اسی لیے انہوں نے بیت بازی کا سلسلہ شروع کیا۔

ے شب وصال ہے، گل کر دو ان چراغوں کو

خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا

پہلا شعر بھی میجر بلال ہی کی طرف سے آیا تھا۔جس پر سب نے خوب داد دی۔ان سب نے دو ٹیمیں تشکیل دی تھیں۔ٹیم اقبال میں میجر بلال اور عطاءاللہ جبکہ ٹیم قائد میں کیپٹن عابد، کیپٹن عاطف اور باقی کے جوان شامل تھے۔

ے ایک ہی انجام ہے اے دوست حسن و عشق کا

شمع بھی بجھتی ہے پروانوں کے جل جانے کے بعد

کیپٹن احمر ٹیم قائد کی جانب سے میدان میں اترے تھے۔

"د" کیپٹن عابد نے بلند آواز میں کہا۔

دل دھڑکتا ہے تو دستک کا گماں ہوتا ہے

کر کے انکار بھی آجاتے ہیں آنے والے

جانے کیوں روتے ہیں دل کھول کے تنہائی میں

لوگ ہنس مکھ سے، یہ اوروں کو ہنسانے والے

میجر بلال کے شعر پڑھنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ اشعار خود بخود دل میں اترتے چلے جا رہے تھے۔عطاءاللہ نے یہ اشعار میجر صاحب سے دوبارہ سنے۔

ے یہ دشت سے امڈ آیا ہے کس کا سیل جنوں

کہ حسن شہر کھڑا ہے نقاب اٹھائے ہوئے

''واہ،واہ'' کیپٹن عاطف کے شعر پر کیپٹن عابد نے کھڑے ہو کر داد دی۔وہ سب ایسا ہی کر رہے تھے۔ میجر بلال کے شعر پر صرف عطاءاللہ ہی داد دیتے۔حالانکہ وہ سب میجر صاحب کی شاعری کے انتخاب کے دل سے قائل ہو چکے تھے اور وہ بس اپنی ٹیم کا پلڑا بھاری رکھنا چاہتے تھے۔

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سر رہ سیاہی لکھی گئی

یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے

''واہ واہ، بہت خوب۔''عطاءاللہ نے بھی کیپٹن عابد کی نقل اتارتے ہوئے بلند آواز میں میجر بلال کو خوب داد دی۔>

...

حصہ دوم

ہمیں تھے جن کے لباس پر سر رہ سیاہی لکھی گئی

یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے

''واہ واہ، بہت خوب۔''عطاءاللہ نے بھی کیپٹن عابد کی نقل اتارتے ہوئے بلند آواز میں میجر بلال کو خوب داد دی۔

یہ ضبط چھوٹ گیا تو تمہاری یاد آئی

میں تھک کے ٹوٹ گیا تو تمہاری یاد آئی

تمہارے بعد نہ تھا کوئی میرا،دل کے سوا

یہ دل بھی روٹھ گیا تو تمہاری یاد آئی

''برخوردار کس کی یاد آئی ہے آپ کو؟ ''میجر بلال کے پوچھنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ کیپٹن عابد ہڑبڑا گئے۔غلطی ہو گئی ان سے جو میجر صاحب کے سامنے یہ قطعہ کہہ بیٹھے۔

''کسی کی بھی نہیں سر۔ میں نے تو ویسے ہی شعر کہا ہے۔ '' کیپٹن علابد کو بھی بہت کچھ چھپانا آتا تھا۔

''ایسے تو نہیں کہا جاتا شعر۔''بس اب کیپٹن عابد بچنے والے نہیں تھے۔موضوع بدلا جا چکا تھا۔

''پہلے آپ بتائیں۔'' کیپٹن عاطف نے اپنے دوست کی جان چھڑانی چاہی۔

''بچے کیا بتاؤں؟''خود پر بات آئے تو میجر صاحب ایسے ہی انجان بن جاتے تھے۔

''وہی جو اس دن ہم پوچھ رہے تھے۔'' کیپٹن عابد نے مبہم سا اشارہ دیا۔

عطاءاللہ بات سمجھتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب ان سب نے انہیں ہی ہر بات میں لے آنا تھا خاص طور پر بیجر بلال نے۔

''سر آپ کے مجازی خدا چلے گئے۔ '' کیپٹن عابد نے عطاءاللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

جواب میں میجر بلل مسکرا بھی نہ سکے۔جانے کیوں وہ ایکدم اداس ہو گئے تھے۔ میجر بلال نے انہیں روکا بھی نہیں تھا

۔جانے والے کہاں رکتے ہیں بھلا۔

وہ سب کچھ پریشان ہو گئے۔چہرے پر سجی رہنے ولی مسکراہٹ ان لمحوں میں غائب ہو چکی تھی۔

''سوری سر۔لگتا ہے آپ کو ہماری کوئی بات بری لگی ہے۔ '' کیپٹن علطف کو کچھ غلط بول دینے کا احساس ہوا۔

" نہیں،ایسی بات نہیں ہے۔''انہوں نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجانے کی کوشش کی۔

وہ تاروں بھری رات میجر بلال کو خلاف معمول اداس کر رہی تھی۔وہ سب یہ بات جان چکے تھے اس لیے میجر صاحب کو تنہائی فراہم کے لیے "شب بخیر'' بولتے ہوئے خیموں میں چلے گئے۔

موٹی موٹی لکڑیاں ڈھیرے ڈھیرے راکھ میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ کہیں سے کوئی چنگاڑی اٹھتی اور کچھ بلندی پر جا کر بے موت ماری جاتی۔وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھے اپنے دردناک ماضی کو یاد کرتے رہے۔یادوں کو آگ میں جلا کر وہ پھر آگ کو پانی سے بجھا کر خیمے میں چلے گئے جہاں عطاءاللہ بے فکری کی نیند سو رہے تھے شکنوں سے بھرا چہرہ ہر قسم کی تھکاوٹ سے پاک نظر آ رہا تھا۔وہ ایک نظر ان پر ڈالتے ہوئے سونے کے لیے لیٹ گئے۔ بہت ہی جلد نیند نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

(...............)

کافی بزی شیڈول کے بعد وہ سب کافی عرصے بعد فری ہوئے تھے۔وقت ساتھ گزارنے کے لیے ان سب نے ٹریفلگر اسکوائر جانے کا پروگرام بنایا۔

ماریہ کے سوا باقی سب کا نئی ریلیز ہونے والی فلم دیکھنے کا پلان تھا۔اسے سینما ہال متاثر نہیں کرتے تھے اس لیے اس نے وہاں موجود نیشنل گیلری کا انتخاب کیا اور آسٹن کو بھی اپنے ساتھ زبردستی لے گئی۔حالانکہ آسٹن بھی آرنلڈ لوگوں کے ساتھ فلم دیکھنے جانا چاہتا تھا لیکن آخر اسے وہی دیکھنا پڑا جو ماریہ چاہتی تھی۔

گیلری کے باہر لوگوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی کیونکہ وہاں مشہور تصاویر کی نمائش لگنے جارہی تھی۔

اپنی باری پر وہ گیلری کے اندر داخل ہوگئے۔

اندر کا ماحول سحر طاری کردینے والا تھا۔یہاں ہر قسم کی پینٹنگز،پورٹریٹس،اور مجسمے رکھے گئے تھے۔سبز و سرخ دیواروں پر بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں جن میں مصور نے ہر عظیم دور کو اپنے برش سے قید کرنے کی کوشش کی تھی۔

ماریہ ان تصاویر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ فطرت کے زیادہ قریب تھیں اور ماریہ تو شروع سے ہی فطرت کی دلدادہ واقع ہوئی تھی۔

جیسے کہ ایک کونے میں لگی تصویر جس میں نیلے پانی کے سمندر کا ساحل ایک خوبصورت منظر پیش کر رہا تھا۔اور سمندر میں دور سے آتی،شور مچاتی لہریں ساحل سے نکلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔دور کہیں افق کے پار آفتاب غروب ہونے کا پیغام دے رہا تھا۔نیلا آسمان سرخی مائل نظر آرہا تھا۔

ساتھ ہی لگی ایک تصویر ایک خوبصورت جزیرے کے منظر کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ جس کے ایک طرف بانس کے اونچے درخت فلک سے سرگوشیاں کرتے نظر آرہے تھے۔ایک کم عمر لڑکی گلابی پوشاک پہنے نرم نرم گھاس پر چادر بچھائے گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔پاس بہتی ندی کا نیلا رنگ آسمان سے ندی کے نکلنے کا عکس پیش کر رہا تھا۔

کچھ ہی فاصلے پہ لگی ایک بہت بڑی تصویر ایک فیری لینڈ کا حصہ لگ رہی تھی جس میں رات اپنے پر پھیلائے کھڑی تھی۔دور فلک پر چاند پورے جوبن پر چمک رہا تھا۔لمبی لمبی گھاس کے اوپر سنہری روشنیاں اپنی دموں میں سموئے جگنو ادھر سے ادھر اڑتے رات کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔

ایک لمبے گھنے جنگل والی تصویر جس کے درمیان میں ایک جھونپڑا تھا۔اور قریب ہی ایک بوڑھی عورت لکڑیوں سے آگ جلائے اس پر دیگچی رکھے کچھ پکا رہی تھی۔ جس سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اوپر فضا میں جاکر کہیں غائب ہو رہا تھا۔ساتھ ایک ٹوکری پڑی تھی جس میں طرح طرح کے تازہ پھل نظر آرہے تھے۔شاید وہ انہیں جنگل سے توڑ کر لائی تھی۔

آسٹن شدید اکتاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

یار مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنی بورنگ ہو گی۔ "آسٹن نے بیزاریت سے کہا۔کیونکہ اسے یہاں کسی "تصویر کی سمجھ نہیں آرہی تھی اور ایک ماریہ تھی جو ان تصاویر میں اتنی مگن تھی کہ آسٹن کے ہلانے سے واپس حقیقی دنیا میں آئی تھی۔وہ تو خود کو ہر تصویر کا ایک حصہ محسوس کر رہی تھی۔ کہیں وہ گہرے سمندر میں غوطہ زن تھی تو کہیں نیلے آسمان پر اڑتے ہلکے پرندوں کی مانند بلندیوں کو چھو رہی تھی۔

اف کیا ہو گیا ہے بھئی؟ "وہ اس کی جانب پلٹی۔"

پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں ان تصاویر میں نظر کیا آرہا ہے؟ "آسٹن نے اپنی آواز کو قدرے پست رکھا۔

وہی جو تمہیں نظر نہیں آرہا۔ "وہ مسکرائی تھی۔"

کیا نظر نہیں آرہا مجھے؟ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

یہ سچ ہے کہ اصل بینائی تو دل کی ہوتی ہے۔جس کے دل کی آنکھ کھلی ہوتی ہے اسے گہرائیوں میں چھپے خزانے بھی نظر آنے لگتے ہیں۔اور آسٹن کے دل کی آنکھ اس معاملے میں بند تھی۔

یہ دیکھو!اس تصویر کو۔ "اس نے اسی طرف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آسٹن کی توجہ اس جانب مبذول کروائی"

"یہ بڑھیا دیکھنے میں کتنی تنہا لگ رہی ہے۔ "ماریہ نے افسردگی سی ہوئی تھی۔ "

" تو اکیلی بیٹھی ہے ادھر اتنے بڑے جنگل میں۔تنہا ہی ہو گی نا پھر۔"

اسے ماریہ سے اس قدر بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔

اف۔ "ماریہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔کس قدر بے ذوق انسان سے اس کا پالا پڑا تھا۔"

یہ اکیلی کہاں ہے؟ اس کے قریب جو اتنے بڑے بڑے درخت ہیں۔"

جو اسی کی طرح بوڑھے ہو چکے ہیں۔اس کے پرانے دوستوں کی مانند ہیں۔یہ ان سے ہی اپنے دل کی باتیں کرتی ہے۔یہ دیکھو !یہ اس کے جھونپڑے کی چھت کس قدر جھکے ہوئے ہیں، جیسے یہ اس کی سرگوشیوں کو سننے کے لیے بے تاب ہوں۔اور اس بڑھیا کے چہرے پر عمر کی لمبی مسافت کی تھکن کے آثار نظر آرہے ہیں لیکن اس کے غمزدہ ہونے کی گواہی چغلی نہیں کھا سکتے۔

"

وہ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اپنی ہی رو میں بولے جارہی تھی اور وہ بس حیرت سے اس کے چہرے کو تکے جارہا تھا۔

" واہ۔ماننا پڑے گا کہ آپ کو ان بے زبان تصویروں کی سرگوشیاں بھی سنائی دیتی ہیں۔ "

وہ اس کے اندر کی بینائی کا دل سے قائل ہوا تھا۔

چلو۔بس کرو۔میں تھک گیا ہوں یہاں کھڑے ہو کر۔ اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت کو دیکھ کر ماریہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔

" ہاہاہا۔ٹھیک ہے۔چلو" !

اس کا وہاں سے جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔وہاں ایک انبار تھا ایسی تصاویر کا مگر اسے آسٹن کی بات ماننا ہی پڑی کیونکہ وہ پہلے ہی اس کے صبر کا امتحان لے چکی تھی۔

(--------------)

گیلری کے باہر سامنے والا منظر لندن کا خوبصورت ترین منظر تھا۔

ٹریفلگر اسکوائر۔

یادگاروں کی یادگار۔

فتح کا نشان۔

کتنے ہی تاریخی واقعات تھے جو ٹریفلگر اسکوائر میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔

ان کا چشم دید گواہ۔

مربع نما چوک کے درمیان تعمیر کیا گیا اکاون میٹر اونچا ایک کالم جس پر نیلسن کا مجسمہ نصب کیا گیا تھا۔

نیلسن۔۔۔یک عظیم فاتح۔

ایک کامیاب جنگجو۔

ایک ایسا جنگجو جس کے مجسمے سے بھی رعب و دبدبہ دکھائی دیتا تھا۔اس کے چہرے سے جیت کی خوشی نمایاں نظر آتی تھی۔

اس کے ہاتھ میں پکڑی تلوار کئی جنگوں کی داستان سناتی تھی۔

فخر سے کھڑا اس کا مجسمہ اس کے کبھی نہ جھکنے کا قصہ سیاحوں کی سماعتوں کے نذر کرتا تھا۔

کالم کے نیچے چاروں جانب بہادری کے نشان،شیروں کے مجسمے نصب کیے گیے تھے۔

ہر کونے میں ایک شیر۔

اور۔۔۔۔

ہر شیر بہادری کی علامت۔

ان کی خون سے بھری آنکھیں کسی پر بھی رعب جمانے کے لیے کافی تھیں۔

سامنے دونوں جانب دو فوارے اور ان کے ارد گرد نیلے پانیوں کے حوض۔اور ان نیلے پانیوں سے نکلتے ڈولفن اور جل پریوں کے خوبصورت مجسمے۔دونوں فواروں کے درمیان پزل کی طرح کا ایک خوبصورت باغ۔بلاشبہ وہ منظر ہر لحاظ سے حسین تھا۔نیلسن کے سینکڑوں مداح کبوتر اس منظر کو اور بھی حسین بناتے تھے۔وہ کبوتر اتنی تعداد میں تھے کہ ایسا لگتا تھا کہ وہ سلطنت کبوتروں کی ہی تھی۔اور جب کوئی ان کے درمیان سے گزرتا تو وہ اڑ کر چاروں طرف پھیل جاتے۔

ان دونوں نے وہاں ایک چھوٹی سی شاپ سے پاپ کارن خریدے۔وہاں یہ کاروبار خوب چلتا تھا۔کیونکہ لوگ جب بھی کوئی پکچر یا پھر گیلری میں لگی کسی نمائش کو دیکھنے جاتے تو ساتھ میں پاپ کارن ضرور لیکر جاتے۔لیکن یہ آسٹن اور ماریہ تھے جنہوں نے واپسی پر لیے تھے۔

وہ دونوں وہاں بنی ایک منڈیر پر بیٹھ گئے۔انہوں نے کچھ پاپ کارن نیچے زمین پر پھینک دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے کبوتر ان کے قدموں میں آکر بیٹھ گئے۔معمول کی طرح وہاں لوگوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔جو نیلسن سے اس کے یادگار واقعے سننے آتے تھے۔

" چالس لوگ کچھ دنوں تک پاکستان جارہے ہیں۔"

آسٹن نے پاپ کارن اپنی جانب کے کبوتروں کی جانب پھینکے۔

پاکستان؟ "ماریہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔"

ہاں۔پاکستان۔ "سارے کبوتر آسٹن کی جاب آگئے تھے۔"

اچھا !لیکن کیوں؟ "ناجانے کیوں اسے حیرت ہوئی تھی۔"

انہوں نے خوبصورت وادیوں پر ایک ڈاکومنٹری بنانی ہے۔"

اسی سلسلے کے لیے انہوں نے پاکستان کا انتخاب کیا ہے۔ "وہ وقفے وقفے سے پاپ کارن کبوتروں کی جانب پھینک رہا تھا۔

انہیں وہاں کونسی خوبصورتی نظر آگئی؟ "وہ طنزیہ ہنسی۔"

سنا ہے کہ وہاں بہت سی خوبصورت وادیاں ہیں۔ "وہ ان کبوتروں کی ہر حرکت کو دیکھ رہا تھا۔"

" لیکن میں نے تو پاکستان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے کہ وہاں کے حالات بالکل اچھے نہیں۔ "

اسے یہی خدشہ لاحق تھا جس کا باعث ہمارا آزاد میڈیا تھا جو دنیا کے سامنے پاکستان کے برے پہلوؤں کو اچھال رہا تھا۔

حالات تو کہیں بھی اچھے نہیں۔''وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔

انہوں نے بہت سی جگہوں پر ریسرچ کی ہے "

اور انہیں ڈاکومینٹری بنانے کے لیے پاکستان ہی سب سے اچھا لگا ہے۔ "پاپ کارن ختم ہو رہے تھے لیکن ان کبوتروں کی بھوک ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

ہمم۔ ویسے مجھے بھی ایک پراجیکٹ ملا ہے"

۔تاریخی مقامات پر تھیسس بنانے کا۔شائد میں نے تم لوگوں کو اس دن بتایا تھا۔ "ماریہ اب اپنی کون سے پاپ کارن نکل کر کبوتروں کی جانب پھینکنے لگی۔

" ہاں۔بتایا تھا۔ "

آسٹن اب اس عظیم الشان نیلسن کے مجسمے کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔اس کی دلچسپی اب ان کبوتروں سے ختم ہو چکی تھی۔

" تو اگر میں بھی ان کے ساتھ چلی جاؤں تو میرا پراجیکٹ کامیاب ہوسکتا ہے۔ "

اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے ہی سارا منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔

اچھا۔وہ کیسے؟ "آسٹن حیرت سے اس کی جانب گھوما۔"

وہاں بہت سے قدیم مقامات ہیں۔ ٹینا بتا رہی تھی۔"

میں نیٹ سے ریسرچ کر کے اتنا اچھا تھیسس نہیں بنا سکتی جتنا میں انہیں براہ راست دیکھ کر بنا سکتی

ہوں۔ "خوشی سے اس نے پاپ کارن سے ایک مٹھی بھر کر کبوتروں کی جانب اچھالی۔

آہاں۔ یہ خیال اچھا ہے۔ "وہ دوبارہ نیلسن کی جانب متوجہ ہوگیا۔"

لیکن تم بھی ساتھ چلو گے۔ "وہ خود ہی ہر منصوبہ بنا لینے کی عادی تھی۔"

" ۔میرا وہاں کیا کام ہے؟ "

" وہ تینوں تو ساتھ ہوں گے۔تو میں کس کو اپنے ساتھ لیر ان مقامات پر جاؤں گی۔؟"

وہ اکیلی کسی کام کی نہیں تھی۔

اچھا۔دیکھتا ہوں۔ "اس نے اسے ٹالنا چاہا۔"

دیکھنا نہیں۔جانا ہے۔ انداز حکمیہ تھا۔

" ٹھیک ہے ملکہ الزبتھ۔ جو تمہارا حکم۔"

اس نے ملکہ کے سامنے جھکتے ہوئے فرمانبرداری دکھائی۔

اتنی ہی دیر میں چارلس لوگ بھی آ گئے۔

ہیلو دوستو۔ کیا ہو رہا ہے؟ "ٹالی ماریہ کے قریب بیٹھ گئی۔اور وہ دونوں کھڑے ہی رہے۔"

پاکستان جانے کی پلاننگ۔ "ماریہ نے چہکتے ہوئے کہا۔"

سچ؟ "ان سب کو حیرت ہوئی۔"

" ہاں۔ میں اور آسٹن بھی جا رہے ہیں تم لوگوں کے ساتھ۔ "

وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی اس لیے انہیں یہ بات تسلیم کرنا ہی پڑی۔

واہ۔یہ تو بہت اچھی خبر دی ہے تم دونوں نے۔ "ٹالی بہت خوش ہوئی تھی۔"

کتنا مزا آئے گا ہم سب کو۔"چالس وہیں کھڑا اپنا مستقبل دیکھنے لگا۔"

ایک منٹ۔ "آرنلڈ کے یوں کہنے پر وہ سب اس کی جانب متوجہ ہوئے۔"

ہم نے تو اس دن آسٹن کو اتنا کہا تھا کہ ہمارے ساتھ چلے مگر یہ نہیں مانا۔ "

تو اب یہ کیسے راضی ہوگیا؟ "ذہین آرنلڈ کے دماغ نے دال میں کچھ کالا ہونے کی گھنٹی بجائی۔

ماریہ جو ہے آسٹن کو راضی کرنے کے لیے۔ "ماریہ نے فخریہ انداز میں کوٹ کے کالر کھڑے کیے۔"

اب ان سب کو بات سمجھ آئی تھی کہ آسٹن اپنی بات سے ٹلا کیسے تھا۔

اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اب اگر آسٹن سے کوئی بات منوانی "

ہو تو مقدمہ ماریہ کی عدالت میں لیکر جانا پڑے گا۔" چالس نے اس کو داد دی۔

" ہاں۔بالکل۔ "

فخر سے اس کا سر بلند ہوا تھا اور آسٹن اس کے چہرے کی خوشی دیکھ کر ہی خوش تھا۔

اچھا چلو۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ "ٹالی سب کچھ برداشت کر سکتی تھی سوائے بھوک کے۔"

اس بات کا علم سب کو تھا۔وہ سب قریب ہی ایک ریسٹورنٹ جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔جاتے ہوئے ماریہ نے سارے پاپ کارن کبوتروں کی طرف اچھال دیئے۔آسٹن نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا تھا لیکن ان پھڑ پھڑاتے ہوئے کبوتروں کو نہیں بلکہ بلندی پر نصب اس مجسمے کو جس کے چہرے سے فتح کا غرور چھلک رہا تھا۔آسٹن کو کچھ دیر کے لیے ایسا لگا کہ جیسے اس کا بے زبان مجسمہ کہہ رہا ہو کہ آسٹن تم ناکام ہو جاؤ گے۔آسٹن تم ایک دن ہار جاؤ گے۔اس وقت آسٹن کا دل چاہا تھا کہ وہ اس فاتح کو نیست و نابود کر دے مگر وہ چاہ کر بھی ایسا نہ کر سکا وہ شکست کھا چکا تھا۔وہ نیلسن پہ رشک کیا کرتا تھا لیکن اس لمحے پتا نہیں کیوں اسے وہ مجسمہ زہر لگا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر بیٹھتا وہ وہاں سے چلا گیا۔

(---------------------)

کیپٹن احمر کی منگیتر کے والد صاحب کی طبیعت بہت بگڑ چکی تھی۔اس لیے ان کی شادی جو کہ دو ماہ بعد طے پائی تھی،اسے وقت سے پہلے ہی مقرر کر دیا گیا۔اسی لیے وہ ایک اہم آپریشن کیلئے بھی نہ جا سکے۔

شادی کی تیاریاں عروج پر جاری تھیں۔کیپٹن احمر اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔پورے گاؤں میں ان کے لیے چراغاں کیا جا رہا تھا۔ کیپٹن احمر تھے ہی اتنے اچھے کہ پورے گاؤں کی آنکھ کا تارا تھے ہر کسی کی خوشی میں خوش اور غم میں غم زدہ ہونے والے۔تو پھر گاؤں کے سادہ دل اور اپنائیت سے بھرے لوگ کیسے ان کی اپنی خوشی میں اکیلا چھوڑ دیتے۔رات کے ڈھلتے ہی چوہدری حیات عالم کی حویلی رنگ برنگی روشنیوں میں نہا گئی۔دور دور تک صرف جلتی بجھتی روشنیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔

دور دراز سے چوہدری حیات کے ملنے ملانے والے مٹھائی کی ٹوکریاں لیکر تشریف لا رہے تھے۔حویلی کے قریب ہی ایک بہت بڑی پنڈال سجائی گئی۔جس میں قطار در قطار سرخ و سفید کرسیاں سجائی گئی تھیں۔سامنے ایک خوبصورت اسٹیج دلہا صاحب کے لیے سجایا گیا تھا۔تازہ مہکتے گلاب اس سجاوٹ کا حصہ بن کر خود پر نازاں نظر آ رہے تھے۔

گاؤں کی شوخ و چنچل سی لڑکیوں نے ڈھولکی کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا جس کی تھاپ پر وہ اپنی مادری زبان میں نہایت خوبصورت ٹپے اور بولیاں پیش کر رہی تھیں۔

پنڈال میں چارپائیاں بھی رکھی گئی تھیں کیونکہ تصنع سے پاک گاؤں کے معصوم لوگ کرسیوں سے زیادہ چارپائیوں کو ترجیح دے رہے تھے۔وہ اس طرح ایک دوسرے سے گھل مل جانا چاہتے تھے۔یہ لوگ تھے ہی ایسے۔

متحد۔۔۔

ایک بند مٹھی کی طرح۔۔۔

سب کے لیے حقے کا انتظام بھی کیا گیا تھا جو کہ ان لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

کیپٹن احمر کی کزنیں ڈھولکی کسی کو تھمانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں

بیڑی لگی اے کنارے تے

بیڑی لگی اے کنارے تے
تینوں کی خبر چنا، جینا تیرے سہارے تے

وہ سب اس کام میں ماہر تھیں۔

گاؤں کی بزرگ خواتین گھونگھٹ نکالے شرم و حیا کا پیکر نظر آ رہی تھیں۔وہ سب چٹائی پر ایک طرف بیٹھی ہوئی تھیں اور آپس میں ہنسی مزاح کر رہی تھیں۔

گھو بھی دا پھل ہیریے

گھو بھی دا پھل ہیریے
نی اسی پردیسی آں، ساڈے مگر نہ رُل ہیریے

پنڈال کے باہر رات کی چاندنی بھی اسی دلکش منظر کا حصہ نظر آ رہی تھی۔

دلہا صاحب کو مایوں کی رسم کیلئے تیار ہونے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔کیپٹن احمر کے کئی دوست ان کی شادی میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔لیکن ان کے ایک دوست میجر ارتضی حدید خاص طور پر گاؤں کی ہر لڑکی کی نظروں کے حصار میں تھے۔بہت سی لڑکیوں کو اپنا دل ان کے رخساروں کے بیچ پڑتے ننھے گڑھوں میں پھنستا محسوس ہو رہا تھا۔میجر ارتضی یہ بات محسوس کر چکے تھے اس لیے وہ بھی کیپٹن احمر کے ساتھ ہی چلے گئے۔

چہرے پر مسکراہٹ سجائے، سفید رنگ کے کاٹن والے شلوار قمیض میں ملبوس دلہا صاحب کو لال رنگ کی چنری کے سائے تلے اسٹیج تک لایا گیا۔اس چنری کو ان کے دوستوں نے چاروں کونوں سے پکڑ رکھا تھا۔

اسٹیج پر لے جا کر چنری کو ہٹا لیا گیا اور کیپٹن احمر کو کرسی پر بٹھا دیا گیا۔گاؤں کی خوبصورت لڑکیاں رنگ برنگے لہنگوں میں ملبوس ہاتھ میں تھالیاں تھامے جن پر مہندی کے درمیان موم بتیاں جلا کر کھڑی کی گئی تھیں،ترتیب سے قطاروں میں چلی آ رہی تھیں۔بوڑھی عورتیں شگن کے گیت گا رہی تھیں۔وہ تھالیاں اسٹیج پر ایک خاص ترتیب سے سجاتے ہوئے واپس چلی گئیں۔

چوہدری حیات عالم بڑی شان سے سر پر سفید پگڑی پہنے کیپٹن احمر کے بائیں پہلو میں براجمان تھے۔چہرے سے خوشی کی کرنیں پھوٹ کر اس پر وقار تقریب کو اور بھی چمکدار بنا رہی تھیں۔

مہندی کی رسم کو چوہدری حیات عالم اور انکی بیگم صاحبہ نے اللہ کے بابرکت نام سے شروع کیا۔

کیپٹن احمر کی والدہ نے رسم کا آغاز اپنے لاج دلارے بیٹے کے ہاتھ پر رکھے ہوئے چوڑے پتے پر مہندی رکھتے ہوئے کیا۔

پھر خوشی کی رسم کی پیامبر مٹھائی کو اپنے بیٹے کے منہ میں ڈالا۔سر پر تیل لگانے کے بعد انہوں نے ان گنت پیسے اپنے بیٹے کے سر سے وار دیے۔محبت کا بوسہ دیتے ہوئے وہ اس جہان کی باقی ماؤں جیسی ہی نظر آرہی تھیں جو کہ بڑے مان سے اپنے بیٹوں کو دلہا بناتی ہیں۔بے شمار دعائیں دیتے ہوئے وہ اسٹیج سے تشریف لے آئیں۔آنکھوں میں خوشی کے موتی چمکتے نظر آرہے تھے۔اس کے بعد چوہدری صاحب نے بھی انہیں سلسلوں کو دہرایا اور پھر یکے بعد دیگرے گاؤں کے ہر فرد نے اپنی محبت کیپٹن احمر پر نچھاور کی۔

اب باری تھی کیپٹن احمر کے دوستوں کی۔جن کے لیے وہ دعا کر رہے تھے کہ وہ اسٹیج پر تشریف نہ لائیں۔لیکن دوستوں جیسی بلائیں دعاؤں سے کہاں ٹلنے والی ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے لیفٹینینٹ داؤد تشریف لائے۔انہوں نے سب رسموں کو نہایت شرافت سے ادا کیا لیکن مٹھائی کھلانے کی رسم پر ان کی شرافت اللہ حافظ بول کر جا چکی تھی۔انہوں نے دو بڑے گلاب جامن ایک ساتھ ہی دلہا صاحب کے منہ میں ٹھونس دیے۔جنہیں ایک ساتھ ہی نگلنا تھا۔ورنہ پھر ایسا ٹاسک دیا جاتا جس سے بہتر تھا کہ بندہ شرافت سے گلاب جامنوں کو ہی حلق سے نیچے اتار لے کیپٹن احمر کی حالت ایسی تھی کہ آنکھیں پھٹ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھیں لیکن اب اس زہر کو نگلنا ہی تھا کیونکہ کیپٹن احمر لیفٹینینٹ داؤد کے ساتھ ایسا کر چکے تھے۔آج تو بدلہ لینے کا وقت تھا اور سب اس کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔

اللہ اللہ کر کے مصیبت حلق سے نیچے ہوئی تھی۔میجر ذیشان اور کیپٹن دانیال نے اسٹیج پر آتے ہی تیل کی پیالی کیپٹن احمر کے سر پر انڈیل دی۔جس سے وہ کچھ دیر کے لیے فریز سے ہوگئے۔اب اتنی بدتمیزی تو انہوں نے کسی کے ساتھ بھی نہیں کی تھی۔میجر ارتضی حدید اور حوالدار عزیز علی کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔انہوں نے مہندی اور ابٹن میں پانی ملا کر ان کے چہرے پر چھینک دیا۔پورا گاؤں ان کے دوستوں کے اس مذاق پر کھلکھلا اٹھا۔جبکہ کیپٹن احمر کا تو بس ہی نہیں چل رہا تھا کہ ان کا قتل ہی کر دیں۔صبح دلہن کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا انہوں نے۔

اگلے دن کے سورج نے سب کو لاڈ سے جگایا۔گاؤں میں تو ابھرتے سورج کی کیا ہی بات ہے۔

رواج کے مطابق پورے گاؤں والوں کو چوہدری حیات عالم کی حویلی میں ناشتے پر مدعو کیا گیا تھا۔جسے گاؤں کے ہر فرد نے دل کی گہرائیوں سے قبول کیا۔ناشتے کے بعد سب لوگ بارات کے ساتھ جانے کی تیاری کرنے لگے۔بارات کو قریب کے ہی ایک گاؤں جانا تھا۔

تیاری کا شوق پورا کر کے میجر ارتضی بھی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے ہال میں تشریف لے جا رہے تھے کہ اچانک کسی سے زار سے ٹکرا گئے اور نسوانی چیخ فضا میں سنائی دی۔

اگر میجر ارتضی اسے بروقت نہ پکڑتے تو وہ تو کام سے چلی جاتی۔

بلاشبہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جو کہ نہایت شوخ سے کپڑے زیب کیے ہوئے تھی۔دوسری طرف کا تو عالم ہی کچھ اور تھا۔وہ لڑکی تو میجر صاحب کو اپنے سامنے یوں دیکھ کر پاگل ہونے والی تھی۔یہ وہی لڑکی تھی جس نے پچھلی رات میجر ارتضی کا خوب مشاہدہ کیا تھا۔

اف پاگل ہی لگتی ہے۔'' دل میں آئے خیال کو جھٹک کر وہ نیچے ہال میں آگئے۔

"ہائے اللہ۔بڑا ای سوہنا اے۔(بڑا ہی پیارا ہے۔)۔انداز ان پر مر مٹنے کا سا تھا۔

میجر ارتضی سنی ان سنی کر کے چلے گئے۔

دلہا صاحب کے آتے ہی بارات لے جانے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں،کالے رنگ کی شیروانی میں تو دلہا صاحب قیامت ڈھا رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں بارات خدا کی رحمت کے سائے میں منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔اور پھر فضلِ الٰہی سے پندرہ منٹس کی مسافت طے کر کے منزل پر جا کھڑی ہوئی۔

بارات کا استقبال نہایت پروقار طریقے سے کیا گیا۔دلہن کی بہنوں اور کزنوں نے باراتیوں پر پھول نچھاور کیے اور چوہدری صداقت علی اور ان کے رشتے داروں نے مرد حضرات کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے۔

میجر ارتضی حدید کے لیے ادھر بھی وہی صورتحال تھی۔جسے وہ پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔اس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ وہ سب کو نظر انداز کر دیں۔ورنہ گاؤں والوں سے ان کی پٹائی ضرور ہو جاتی۔بھئی اس میں اب معصوم سے میجر کا کیا قصور تھا۔

اسٹیج پر میجر ارتضی کے بیٹھتے ہی کیپٹن احمر نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

سر! مجھے تو اب آپ سے جیلسی ہو رہی'' ''ہے۔

کیوں جناب؟'' میجر ارتضی نے نہایت معصومیت سے ''پوچھا۔

دلہا میں ہوں اور لڑکیاں خدمت آپ کی کر رہی ہیں۔اور بعض تو آپ کی بلائیں لے رہی ہیں۔کیپٹن احمر صاحب بے چارگی سے بولے۔واقعی صورتحال ایسی ہی تھی۔

اچھا مگر مجھے تو ایسا نہیں لگا۔میجر ارتضی کو بھی خوب بننا آتا تھا۔

اچھا جی۔آپ کو کچھ نہیں پتا۔مجھے تو اب یہ فکر ہو رہی ہے کہ کہیں ہماری دلہن صاحبہ بھی یہ نہ فرما دیں کہ نہیں نہیں،مجھے شادی کرنی ہے تو صرف و صرف کیپٹن احمر کے دوست کے ساتھ ہی۔کیپٹن احمر کے چہرے پر مصنوعی پریشانی کے تاثرات تھے۔

میجر ارتضی ان سے رینک میں سینئیر تھے لیکن وہ ان کے بہت اچھے دوست تھے۔

ہاہاہاہاہا۔کیپٹن احمر کی بات سن کر میجر ارتضی کے رخساروں کے گڑھے اور بھی نمایاں ہو گئے۔

یار! مگر مجھے تو اس بات کی پریشانی ہے کہ ان میں سے کوئی پاگل لڑکی کچھ اول فول ہی نہ کر دے اور گاؤں والے مجھے جوتے مار مار کر عبرت کا نشان بنا دیں۔میجر صاحب کو ابھی تک اسی بات کا ہی خدشہ لاحق تھا۔وہ جانتے تھے کہ گاؤں والے غیرت کے معاملے میں کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔

ہاہاہاہا ۔۔۔سر کہیں میری عزت پر دھبہ ہی نہ لگا کر چلے جایئے گا۔یہ نہ ہو کہ بعد میں سب مجھے آپ کے حوالے سے طعنے دیتے پھریں۔"۔کیپٹن احمر کی اس معصوم سی بات پر وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

میجر ارتضی کی اپنے جونیئرز کے ساتھ ایسی ہی دوستی تھی۔انہون نے اس معاملے میں کبھی بھی اپنے رینک کو شامل نہیں کیا تھا۔

سنت رسول ؐ کی ادائیگی کا وقت آن پہنچا تھا۔

دل کی دھڑکنیں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ایک خواب کی تعبیر ممکن ہونے جا رہی تھی۔

ساعتوں پر احترام واجب کر دیا گیا تھا۔

سماعتوں کو منتظر کر دیا گیا تھا۔

قطار در قطار سلامتی دینے والے ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔

مولوی صاحب نے نکاح پڑھنا شروع کیا۔

قبول ہے۔

زیرلب اقرار کیا گیا۔

قبول ہے۔

محبت کے ترانے گائے جانے لگے۔

قبول ہے۔

آسمان سے سلامتی بھیجی گئی اور پھر مبارک ہو مبارک ہو کی صدائیں فضا میں بلند ہو نا شروع ہوئیں۔

سب دلہا صاحب سے بغلگیر ہوئے۔

خوشی کا سماں بندھنے لگا۔

دو دل ایک دوسرے کو فتح کر چکے تھے۔

دو سلطنتیں ایک ہو چکی تھیں۔

ایک ملکہ اور دوسرا بادشاہ کا رتبہ پا چکا تھا۔

اور محبت کا یہی بہترین فیصلہ تھا۔

رات بھر ہونے والی بارش کو انجوائے کرتے رہنے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔دائیں جانب دیوار پر ٹک ٹک کرتی گھڑی ساڑھے آٹھ ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ یہ اعلان سنتے ہی وہ کمبل سے تیزی سے اٹھی۔آج اس کا ٹیسٹ بھی تھا جو اسے لازمی دینا تھا۔وہ جلدی سے واش روم گئی اور یونیفارم پہن کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ہمیشہ کی طرح اس نے اونچی پونی کی اور اپنی خوبصورت آنکھوں کے کٹورے کاجل سے بھرے۔

پاؤں میں نازک سی سینڈل پہنی جو کہ سیلپری بھی تھی۔اسے یہ پہنتے ہوئے یہ خیال نہیں آیا کہ رات بھر ہونے والی بارش کی وجہ سے سڑک پر پھسلن ہوگی۔اس نے جو بھی بکس ہاتھ میں آئیں،اٹھائیں اور بیگ لیکر سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے کالج جانے کے لیے گھر سے باہر نکل آئی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھارہی تھی تا کہ کالج جلدی پہنچ سکے۔کاش وہ رات کو جلدی سو جاتی۔ابھی وہ اسی خیال میں گم تھی کہ پاؤں پھسلنے پر دھڑام زمین پر گر پڑی سڑک کے کنارے پر کیچڑ بہت تھی۔کچھ لمحے تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔جب سمجھ میں آیا تو نظریں کیچڑ میں کھلی کتابوں پر پڑی۔وہ ابھی بھی گھٹنوں کے بل کیچڑ میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اتنی ہی دیر میں اسے ایک اجنبی کا بلند قہقہہ سنائی دیا۔اس نے آواز کی سمت میں نظریں گھمائیں تو سڑک کے بائیں جانب سنگی بنچ پر ایک اجنبی، جسے دیکھتے ہی اس کے ذہن میں طلسمی شہزادے کا خیال آیا آیا تھا،جاگنگ ٹریک پہنے،کانوں میں ہینڈز فری لگائے بڑے مزے کے ساتھ اس کے گرنے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔لیکن اس کے یوں دیکھنے پر وہ یکدم سنجیدہ سا ہو گیا۔اور پھر کچھ سوچ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس کی جانب آ گیا۔وہ ابھی بھی اسی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے اس کی کتابیں اور بیگ اٹھایا اور پھر اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔جیسے وہ اسے صدیوں سے جانتی ہو اور ابھی اس کا ہاتھ تھام کر کھڑی ہو جائے گی۔

طلسمی شہزادہ ابھی بھی اپنی ہنسی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہوگئی۔اس کا سارا یونیفارم کیچڑ آلود ہو چکا تھا۔اس نے غصیلے انداز میں اس سے اپنی بکس اور بیگ چھینا اور ایک چبھتی ہوئی نگاہ اس پر ڈال کر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

طلسمی شہزادے کے کانوں مین رس گھولتے قہقہے نے اس کا دور تک پیچھا کیا۔

گھر کے دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی سینڈل اتار کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ پل بھر کے لیے رکی۔

اس نے قریب پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکالے اور اپنی ناک سے کیچڑ صف کرتے ہوئے وہ بھی اپنی ہنسی کو کنٹرول نہیں کر پائی تھی۔

یہ حسین موسم۔۔۔۔ یہ بارش۔۔۔۔۔۔ یہ ہوائیں

لگتا ہے محبت نے آج کسی کا ساتھ دیا ہے

آج بھی باہر بارش برس رہی تھی لیکن وہ اس سندری شہزادی کو متاثر کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

"اف۔اس طلسمی شہزادے کی مسکراہٹ۔

وہ بار بار اسے ہی سوچ کر مسکرائے جارہی تھی۔

کیا تھا اس شخص میں جس نے پہلی ہی نظر میں اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔وہ واقعی کسی طلسم سے بنا تھا جس کے سحر سے وہ سندری شہزادی ابھی تک نہیں نکل پا رہی تھی۔

کون تھا وہ؟ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر یہ سوال اس نے اپنے ہی عکس سے کیا۔

پہلے تو کبھی بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔بے چینی ہی بے چینی تھی۔

میں کیوں پاگل ہو رہی ہوں؟ پتا نہیں کون تھا؟ کدھر سے آیا تھا اور کدھر چلا گیا؟وہ اپنی ہی سوچوں کی نفی کرتے ہوئے اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔

لیکن نیند تو کوئی چرا کرلے گیا تھا۔

اپنے ساتھ۔

ناجانے کہاں؟

صبح فجر کی نماز سب نے ایک ساتھ پڑھی جس کی امامت میجر بلال نے کروائی۔ ملک و قوم کے امن و

سلامتی کیلیے دعا کرنے کے بعد سب نے عطاءاللہ غازی کے ہاتھ کی بنی چائے پی۔تھوڑی دیر تک انہیں سفر کے لیے روانہ ہونا تھا۔اس سفر کے لیے تیاری وہ ایک دن پہلے ہی مکمل کر چکے تھے۔

شمالی وزیرستان اس وقت شرپسندوں کا گھر بنا ہوا تھا۔شرپسندوں کا ایک سیلاب تھا جو وہاں اُمڈ آیا تھا۔اور اسی سیلاب کو روکنے کے لیے مادرِ گیتی کے شیر دل جوان سیسہ پلائی دیوار بن کر وہاں جا رہے تھے۔ میجر بلال نے عطاءاللہ کو ساتھ جانے سے منع بھی کیا لیکن وہ یہ موقع کسی صورت میں گنوانے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ان کے اسی جذبے کے آگے میجر صاحب کو ہار ماننا پڑی۔

سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میجر صاحب نے اللہ کے ان پراسرار بندوں سے مختصر ساخطاب کیا تھا۔

'' ہم سب ایک اہم مشن پر جار ہے ہیں جس کے لیے اللہ نے ہم سب کو چنا ہے اور یہ ہم سب کے لیے'' خوش قسمتی کی بات ہے۔اور اس علاقے میں موت قدم قدم پہ ہمیں اپنے سینے سے لگانے کے لیے بے تاب کھڑی ہو گی۔لیکن ہمیں پہلے دشمنوں کو ٹھکانے لگانا ہو گا۔اس علاقے کو دشمن سے پاک کرنا ہی ہمارا اصل ٹاگٹ ہے۔ ہم تب تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک آخری دشمن کو جہنم واصل نہیں کر دیں گے۔دشمن کو یہ بتانا ہے کہ اس نے اس ملک کے بیٹوں کو للکار کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔اور آپ نے ایسی کارکردگی دکھانی ہے کہ دشمن کو اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑے۔

آپ سب کے لیے سب سے اہم یہ بات ہونی چاہیے کہ آپ جہاں سے گزریں دشمن وہیں آپ کی دہشت سے مرعوب ہو جائے۔

اور ہاں سب متحد رہیں گے کیونکہ قطرہ قطرہ جب سیل کا روپ اختیار کر لے تو بڑی سے بڑی چٹانوں کو بھی بہا کر لے جاتا ہے۔مشکل سے مشکل وقت میں بھی پیٹھ پھیر کر بھاگنا نہیں کیونکہ یہ اس ملک کے بیٹوں کا شیوہ نہیں ہے۔وہ معمولی سا دشمن آپ کے ایمان کو ڈگمگا نہیں سکتا اللہ کے فضل و کرم سے ہماری فوج ناقابل شکست ہے۔

"شیر و اللہ پر بھروسہ رکھیں۔اسی کا نام لیکر آگے بڑھیں۔اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔"

اس کے بعد میجر بلال نے ایک ایک نوجوان کو تھپکی دے کر اس کا حوصلہ بڑھایا سب نے بیک وقت ساتھ مل کر اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔اور منزل کی جانب اپنے قدم بڑھا دیے۔

(________________)

پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے وہاں بہت سی مشکلات پیش آسکتی تھیں لیکن پاک فوج پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اتری تھی۔

جنگل میں حکومت تو شیر کی ہی قائم رہتی ہے چاہے بھیڑیوں کا ایک ریوڑ ہی کیوں نہ خونخوار بن کر وہاں نکل آئے۔شاید دشمن اسی بات سے ناواقف تھا اسی لیے جنگل کے بادشاہ شیر سے مقابلہ کرنے کے لیے نکل پڑا تھا۔

وہاں سب سے بڑی مشکل اس بات کی ہو سکتی تھی کہ شر پسندوں نے اپنے ٹھکانے پہاڑی کی چوٹی پر بنائے ہوئے تھے۔وہ اوپر سے با آسانی وار کر سکتے تھے۔یہ ایک سنگین صورتحال تھی جس کے لیے فوج کے ان بہادر جوانوں کو ایک بہترین حکمت عملی اپنانے کی ضرورت تھی اور ایسا ہی کیا گیا تھا۔

(_________________)

رات کے پر پھیلاتے ہی پہلے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا گیا۔جو کہ دشمن کے قرینب سے قریب پہنچنے کا تھا۔لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ دشمن کے مورچے ان سے نہایت بلندی پر تھے۔اور کچھ مورچے ڈھلوان کے رخ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنائے گئے تھے۔ پہلے نیچے والے مورچوں کو تباہ کرنا لازمی تھا۔

ذرا سی بے احتیاطی اس منصوبے کو ناکام بنا سکتی تھی۔

دشمن کی جانب پہلی پیش قدمی الفا کمپنی کی طرف سے کی گئی جس کی کمانڈ میجر بلال کر رہے تھے جبکہ صورتحال کے سنگین ہونے پر براو کمپنی کو موو کرنا تھا جس کی کمانڈ کیپٹن علید کر رہے تھے۔

اس آپریشن کے کمانڈنگ آفیسر بریگیڈیر انور عثمان تھے۔

قدرت اس وقت ان پراسرار بندوں پر بہت مہربان ہو رہی تھی۔چودھویں کا چاند اس تاریک رات کو اپنی پرنور کرنوں سے روشن بنا رہا تھا۔

ستارے یہ نظارہ دیکھنے کے لیے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔

رات ان کے دلوں کی دھڑکنوں کو سننے کے لیے خاموش کھڑی تھی۔

اد گرد اونچے درخت قدرے جھک کر ان مجاہدوں کو سلام پیش کر رہے تھے۔

درختوں کے پیچھے چھپتے چھپاتے اللہ کے کرم و فضل سے یہ شیر دل دشمن کے سر پر پہنچ گئے اور دشمن کو اس بات کی بھنک تک نہ پڑی کہ باطل کو موت دینے کے لیے حق پہنچ چکا ہے۔

دشمن کے سب سے نچلے مورچے کے قریب پہنچ کر وہ منصوبے کے تحت رک چکے تھے۔فاصلہ زیادہ تھا لیکن وہ اس مورچے کو چاند کی چاندنی کی مدد سے آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔مگر وہ اس وقت اس پر حملہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مورچے کے اندر اور اس کے ارد گرد دشمن کی پوزیشن کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔اس لیے وہ صبح کی پہلی کرنوں کا انتظار کرنے لگے۔تاکہ کل کا ابھرنے والا سورج بھی دشمنوں کا انجام دیکھ سکے۔

(__________________)

صبح کی پہلی کرن کے نکلتے ہی انہوں نے اس مورچے پہ حملہ کر دیا اور اس میں چھپے تین شر پسندوں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا

بریگیڈیر انور عثمان کی طرف سے حکم ملتے ہی مشن کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا۔

فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔دشمن اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے بوکھلا گیا لیکن اگلے ہی لمحے سنبھل گیا۔اس پہاری پر تربیت یافتہ شر پسند پہرہ دے رہے تھے۔ان کی طرف سے بھی بھرپور فائرنگ شروع کر دی گئی۔

چڑھائی کی جانب دشمن پر حملہ کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی مگر وہ پھر بھی ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہے تھے اور یہی بات شر پسندوں کے لیے پریشان کن تھی۔وہ پاکستان آرمی کو اچھی طرح سے جانتے تھے کہ جب تک یہ کامیاب نہ ہو جائے واپس نہیں جانے ولی۔

دشمن یکے بعد دیگرے دستی بم پھینک رہا تھا جس کی وجہ سے پاک فوج کی پیش قدمی رک چکی تھی اس لیے ایک نیا منصوبہ ترتیب دیا گیا جو کہ ''پلان بی'' تھا۔

" کیپٹن عابد ہم ایک ہی پوزیشن سے دشمن پر یوں مؤثر حملہ نہیں کر سکتے۔ ہم دو حصوں میں بٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ میں ان کو لیکر دائیں جانب سے جاتا ہوں جبکہ تم باقی سب کو لیکر بائیں جانب سے جاؤ گے۔'' میجر بلال نے پلان بی کے تحت صفیں ترتیب دیں۔

"موو"

حکم ملتے ہی وہ سب دو حصوں میں بٹ گئے۔ اور الگ الگ راستوں سے حملہ کرنے کے لیے آگے کی جانب بڑھ گئے۔

عطاءاللہ عمر کے اس حصے میں لڑنے کے قابل نہیں تھے لیکن وطن سے عشق نے انہیں وہ طاقت عطا کی تھی کہ وہ فوج کے شانہ بشانہ دشمن سے لڑ رہے تھے۔ وطن سے عشق عمر کہاں دیکھتا ہے۔ یہ تو بس دل میں موجود جذبے کو دیکھتا ہے۔

دشمن کے لیے ان ایک نئی صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ اسے اب دونوں طرف سے خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔ لیکن وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ مگر حق کے لیے مخالف کی نفری کا زیادہ ہونا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ آخر میں جیت ہمیشہ حق کی ہی ہوتی ہے۔

شر پسند ایک ایک کر کے اپنے اصل انجام کو پہنچ رہے تھے۔

سب کچھ کامیابی سے چل رہا تھا کہ اچانک سامنے سے گولی چلی اور میجر بلال کو اپنا سانس رکتے ہوئے محسوس ہوا۔ یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلیں اور سینے کے آر پار گزر گئیں۔ سامنے کا منظر سانس روک دینے کے لیے کافی تھا۔ عطاءاللہ غازی اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے نیچے کی جانب لڑھک رہے تھے۔ ان کے سینے سے خون بڑی تیزی کے ساتھ نکل رہا تھا۔

سرمئی وردی لال خون سے رنگنے لگی تھی۔

میجر بلال برق سی تیزی کے ساتھ ان کی جانب لپکے اور سہارا دیتے ہوئے انہیں نیچے کی جانب ایک محفوظ مقام پر لے گئے۔ انہوں نے عطاءاللہ غازی کا سر اپنی گود میں رکھا۔

صوبیدار زاہد۔'' میجر بلال نے تھوڑے ہی فاصلے پر پوزیشن سنبھالے صوبیدار زاہد کو آواز دی۔"

یس سر۔"صوبیدار زاہد ان کی جانب آئے۔"

"عطاءاللہ کو جلدی سے نیچے لے جاؤ اور انہیں جلد از جلد فرسٹ ایڈ دو۔"

میجر بلال کا سانس پھول رہا تھا۔

اتنی گولیاں لگنے کے باوجود بھی میجر بلال کو ان کے بچ جانے کی امید تھی۔

نہیں صاحب جی۔ میں آخری سانس تک یہ میدان نہیں چھوڑوں گا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یہیں جان دے دوں گا لیکن اپنے سے کیے گئے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ برسوں سے دیکھے گئے خواب کی تو تعبیر آج ملنے والی ہے۔

"اور آپ مجھے واپس بھیج رہے ہیں۔

میجر بلال کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہنے لگے۔

دیکھیں۔۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔۔۔ کہ۔۔۔ میرے سینے پر دشمن کی گولی لگی ہے"

اور میں شہادت کی منزل کے۔۔۔۔ بہت قریب۔۔۔ پہنچ چکا ہوں۔ درد کی شدت سے الفاظ بمشکل ادا ہو رہے تھے۔

اب میں عطاءاللہ غازی سے۔۔۔۔ عطاءاللہ شہید ہو۔۔۔ جاؤں گا۔۔۔ میں بہت خو۔۔۔ خوش ہوں کہ۔۔۔ آج میں نے۔۔۔ اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔۔۔۔ میری ہزار جا۔۔۔ جانیں بھی ہوتیں تو میں۔۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ اپنے ملک۔۔۔ پر۔۔۔ خوشی خوشی۔۔۔ قربان کر۔۔۔۔ دیتا۔۔۔ ایک وعدہ کریں کہ۔۔۔۔ دشمن کو زندہ واپس ۔۔۔۔ نہیں جانے دیں گے آپ۔۔

"۔۔۔ اللہ آپ سب کا مدد گار ہو۔۔۔ اللہ حافظ۔۔

اس کے ساتھ ہی عطاءاللہ نے میجر بلال کی ہی گود میں کلمہ پڑھتے ہوئے حق کو لٹادی۔

پروردگار نے اس عظیم انسان کو اپنے بندوں میں چن لیا تھا۔

سلام ہو عطاءاللہ شہید پر۔

سلام ہو ان کی عظمت پر۔

سلام ہو ان کی جرات پر۔

سلام ہو ان کے جذبے پر۔

سلام ہو ان کے سچے عشق پر۔

میجر بلال ان کے بے جان وجود کو گلے سے لگائے بے آواز رو دیے تھے۔

کیسے نہ روتے وہ اتنا۔ جان سے پیارا جو جدا ہوا تھا۔ اور کس شان سے جدا ہوا تھا۔

برسوں کا ساتھی بچھڑ چکا تھا۔

ایک مخلص دوست بہت دور چلا گیا تھا۔

صوبیدار زاہد سے وہ منظر برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میجر بلال آخری بار دیوانہ وار نائیک عطاءاللہ شہید کے ماتھے کو چوم رہے تھے۔ان کے وجود کو خود سے جدا کرنا میجر بلال کے لیے ایسا ہی تھا جیسے روح کو جسم سے جدا کرنا۔

وہ روح ہی تو تھے میجر بلال کی۔

عطاءاللہ شہید کے ساتھ گزرے پل آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔وہ شرماتا ہوا چہرہ شہادت کا تمغہ جیت کر چین کی نیند سو چکا تھا۔

صوبیدار زاہد کے تسلی دینے سے میجر صاحب نے عطاءاللہ کا وجود ان کے حوالے کر دیا اور اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنی پوزیشن کی جانب بڑھ گئے جبکہ صوبیدار زاہد ان کے جسد خاکی کو نیچے لے گئے۔

(-------------------------)

مدتوں پہلے دیکھے خواب کی تعبیر آج آئی ہے

سبز ہلالی پرچم میں لپٹی میری لاش آئی ہے

اے آنکھوں !اشکوں کو اب بہانا مت،سلام پیش کرنا

عدو کو سبق سکھا کر میری جسد خاک آئی ہے

عطاءاللہ شہید کے جسد خاکی کو سلامی پیش کرتے ہوئے ان کے آبائی گاؤں میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ہر آنکھ رو دی تھی۔

لیکن ہر دل نے فخر محسوس کیا تھا۔
وہ تھے ہی فخر کے قابل۔

پوری قوم عطاءاللہ شہید جیسے بیٹوں کو سلام پیش کرتی ہے۔

(----------)

اگلی صبح وہ جلدی ہی اٹھی گئی تھی۔اس لیے وہ تسلی کے ساتھ کالج جانے کے لیے تیار ہوئی۔آج اسے سڑک کی پھسلن کا بھی خیال تھا اور اس اجنبی کا بھی۔
وہ اسے دوبارہ کبھی بھی ہنسنے کا موقع نہیں دے گی۔ دوبارہ لفظ پر وہ چونک گئی۔

کیا اسے اس کے دوبارہ ملنے کی امید تھی؟

انہیں سوچوں میں غرق وہ کیچن میں آ گئی۔اس نے اپنے لیے ناشتہ بنایا۔اس کی چچی ابھی سو رہی تھیں ان کی طبیعت خرب تھی اور ملازمہ بھی اس وقت نہیں آتی تھی اس وجہ سے اسے خود ہی اپنے لیے ناشتہ بنانا پڑا۔

بریڈ کو بے دردی سے کھانے کے بعد اس نے چائے کے دو گھونٹ بھرے۔برتن سنک کے قریب رکھ کر وہ پاس پڑی اپنی کتابوں اور بیگ کو اٹھا کر کالج کی جانب چل دی۔

وہ دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔

نگاہیں کسی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ان نظروں کو ثبات تب حاصل ہوا جب قدم مخصوص سنگی بنچ کے سامنے رکے۔

وہ آج بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔کانوں میں ہینڈز فری لگائے وہ اپنی سانس کو بحل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ شاید وہاں جاگنگ کے لیے آتا تھا۔لیکن پہلے تو کبھی بھی نظر نہیں آیا تھا۔شاید وہ اس جگہ نیا آیا ہے۔""

وہ اسے یونہی ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی۔

اس کے یوں دیکھنے پر طلسمی شہزادہ حیران ہوا۔اور کانوں سے ہینڈز فری نکالتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔وہ ابھی بھی اسی جگہ کو دیکھے جا رہی تھی جہاں وہ کچھ دیر پہلے بیٹھا تھا۔

ہیلو میم !اینی پرابلم ؟اس نے حیرت سے پوچھا۔

لیکن اسے وہاں سن کون رہا تھا۔

طلسمی شہزادہ کچھ سوچتے ہوئے اس کے سامنے آیا اور اس کی آنکھوں کے آگے اپنے دائیں ہاتھ کو اوپر نیچے ہلانے لگا۔

وہ تو اس راج کمار کے ساتھ نا جانے کن جزیروں کی سیر کو نکل چکی تھی۔اس طلسمی شہزادے کے یوں ہاتھ ہلانے پر طلسمی دنیا کا سحر ٹوٹا اور اس نے خود سے کچھ ہی فاصلے پر اس راج کمار کو کھڑے پایا تھا۔

مس !خیریت؟اب کی بار وہ ذرا سا ہچکچایا تھا۔

نہیں۔۔۔۔ہاں۔اس نے پہلے نفی میں سر ہلایا اور پھر اپنی بے وقوفی کا احساس ہونے پر ہاں میں سر ہلانے لگی۔

طلسمی شہزادے نے مسحور کر دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جانے کے لیے راستہ دے دیا۔اور خود بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

کیا نام ہے تمہارا؟پوچھنے کا انداز ایسا تھا جیسے دونوں کے درمیان برسوں کی شناسائی ہو۔

اس کے یوں پوچھنے پر وہ رکی اور حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

بھئی ایسے کیوں دیکھ رہی ہو ؟نام ہی پوچھا ہے۔وہ اس کے دیکھنے پر دو قدم پیچھے ہٹا۔

آپ کو اس سے مطلب ؟ لہجے میں غصے کا عنصر نمایاں شامل تھا۔وہ اب مزید بے وقوفی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اچھا تو آپ کو غصہ بھی کرنا آتا ہے۔اچھی بات ہے ۔کبھی کبھی غصہ کر لینا چاہیے۔وہ اس کے تپتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

نہایت ڈھیٹ انسان لگ رہا تھا اس لیے وہ کوئی بھی جواب دیے بنا آگے بڑھ گئی۔

سوری میرا خیال ہے کہ آپ مائنڈ کر گئی ہیں؟وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے چہرے پر ناگواریت کے اثرات دیکھ چکا تھا۔

دیکھیے مسٹر۔۔۔اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کرنے کی کوشش کی۔

دیکھ ہی تو رہا ہوں۔چہرے پر قاتلانہ مسکراہٹ سجائے، سینے پر بازو باندھے وہ اس کی جھیل سی آنکھوں میں غوطہ زن ہونے لگا۔

اور اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے جس کی وجہ سے وہ رات بھر سو نہ سکی وہ اتنا فضول قسم کا انسان ہوگا اس کے وہم و گمان میں نہ تھا۔

مجھے کالج سے دیر ہو رہی ہے۔اور آپ ہیں کہ بدتمیزی پہ بدتمیزی کیے جا رہے ہیں۔اس نے اپنے لہجے کو ترش رکھا تا کہ مقابل پر اس کی کمزوری نہ ثابت ہوجائے۔

اچھا تو جو آپ پچھے پندرہ منٹس سے مجھے گھور رہی تھیں تب آپ کو کالج جانے کا خیال نہیں آیا تھا؟اسے توہین کا احساس ہوا تھا۔وہ بھی غصہ کرنا جانتا تھا۔اس کے چہرے پر سجی مسکراہٹ پل بھر میں غائب ہوچکی تھی۔

میں کب آپ کو گھور رہی تھی؟زندگی میں پہلی دفعہ اس سے اتنی بڑی غلطی ہوئی تھی اور وہ پکڑی بھی جاچکی تھی۔بہتر تھا کہ وہ انجان بن جاتی۔

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ یوں مکر جائیں گی تو میں اپنے آئی فون سے آپ کی وڈیو بنالیتا۔"اس نے اسے اپنا آئی فون دکھاتے ہوئے کہا جیسے وہ اس کے آئی فون سے مرعوب ہوجائے گی۔

ہونہہ۔وہ اس کے آئی فون کو ریجیکٹ کر کے جاچکی تھی۔جبکہ وہ اس توہین پر برا سا منہ بنا کر ہی رہ گیا۔

کالج میں بھی اس کا موڈ آف رہا اور گھر آ کر بھی۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنا سر کھول دے۔آخر کیا ضرورت تھی اسے یوں گھورنے کی۔

"جانے وہ کیا سوچ رہا ہوگا میرے بارے میں۔"

"تم اتنی بڑی بے وقوفی کیسے کرسکتی ہو؟"وہ اپنے بال نوچ رہی تھی۔یہ اس کی عادت تھی۔اسے جب بھی غصہ آتا تو وہ اسے اپنے بالوں پر ہی نکالتی تھی۔

اگر اس نے کل مجھے یوں تنگ کیا تو اس کا وہ حل کروں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔کچھ سوچتے ہوئے وہ سونے کے لیے چلی گئی۔

اگلے دن اس نے اسے پھر خود پر ہنسنے کا موقع دے دیا۔

وہ جب اس سنگی بنچ کے قریب سے گزری تو اسے پھر وہی قہقہہ سنائی دیا جو پہلے دن تو بہت بھلا لگا تھا مگر اب زہر لگا تھا۔

دل میں اس کا قتل کرنے کی ٹھان کر وہ اس کی جانب چلی گئی۔

میں آپ کو اگر کچھ کہہ نہیں رہی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ سر راہ یوں بدتمیزی پر اتر آئیں۔اس کے قریب پہنچ کر اس نے بنا سوچے سمجھے بولنا شروع کر دیا۔

جی۔کیا کہہ رہی ہیں آپ؟اس نے کانوں سے ہینڈز فری نکال دیئے اور اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

میں جانتی ہوں کہ آپ سن چکے ہیں۔اگر آپ دوبارہ میری طرف دیکھ کر ہنسے تو انجام کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔وہ اسے آخری بار دھمکی دیتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

دیکھیے مس ہنسنے کا موقع تو آپ خود دیتی ہیں۔وہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔

یہ بات سنتے ہی اس کے تن میں آگ لگ گئی۔وہ غصے سے پلٹی اور ہاتھ میں پکڑی بک پوری قوت کے ساتھ اسے دے ماری۔وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا کتاب اس کی ناک پر زور سے لگی اور ناک سے خون بہنا شروع ہوگیا۔اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور خون کو صاف کیا۔

اف۔۔۔یہ کیا ہوگیا۔اب اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کتاب اسے اتنی زور سے لگے گی۔وہ اس کے انجام سے پریشان بنے بنے اسے دیکھنے لگی۔

لیکن ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا جیسا وہ سوچ رہی تھی۔

اس راج کمار نے زمین سے کتاب اٹھا کر اسے تھمائی اور دوبارہ خون صف کرنے لگا۔

"میں اپنے دوست کی بات پر ہنس رہا تھا۔''یہ کہہ کر اس نے فون کے اسپیکر کو آن کر دیا۔

""او کے اشعر میں گھر جا کر تم سے بت کرتا ہوں۔

او کے بدتمیز انسان۔ فون سے اشعر کی آواز نے اسے ایک بار پھر طلسمی شہزادے کے سامنے شرمندہ کر دیا۔

اس نے سنگی بنچ سے پانی کی بوتل اٹھائی اور بغیر اسے کچھ کہے وہاں سے چلا گیا۔جبکہ وہ ایک بار پھر شرمندہ سی کالج کی چل دی۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے اس سے معافی مانگ لینی چاہیے۔"

وہ رات آٹھ بجے گھر کی چھت پر ٹہلتے ہوئے اپنے رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"آخر میری غلطی تھی۔مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

"" اگر اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو تو۔۔۔۔۔یہ خیال سب سے پریشان کن تھا۔

آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کل اس سے معافی مانگنے کے لیے لفظ ترتیب دینے لگی۔

لیکن وہ اگلے کئی دن تک وہاں نہیں آیا تھا۔اس کے نہ آنے پر اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔

وہ گھر سے دس پندرہ منٹ پہلے نکل جاتی اور اسی سنگی بنچ پر بیٹھ کر اس کا انتظا کرتی اور پھر مایوس ہو کر کالج چلی جاتی۔آج بھی وہ وہاں بیٹھی اس کا انتظا کر رہی تھی۔اور اوپر والے نے اس کی سن لی تھی۔وہ اپنے مخصوص انداز میں بھاگتا ہوا آرہا تھا۔اسے دیکھ کر وہ بنچ سے اٹھی اور اس کے قریب آنے کا انتظا کرنے لگی۔وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا۔کانوں میں ہینڈز فری لگائے ہوئے۔وہ اپنا سانس بحل کرنے لگا۔

اس کی ناک پر چوٹ کا نشان نمایاں نظر آرہا تھا۔وہ اس کے قریب یونہی کھڑی رہی جیسے بادشاہ کے سامنے کوئی باندی ہاتھ باندھے کھڑی ہو۔وہ اس کے بولنے کا انتظا کر رہی تھی لیکن وہ نہیں بولا۔انا کی بستی کا وہ بھی بادشاہ تھا۔

پھر اسے خود ہی آغذ کرنا پڑا۔

وہ میں آپ سے سوری کرنا چاہتی ہوں۔اس نے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے کہا۔

آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟یہ سچ تھا کہ اس نے اسے دور سے دیکھتے ہی میوٹ آف کر دیا تھا اور صرف بننے کے لیے ہینڈز فری لگائے ہوئے تھے۔

میں آپ سے سوری کرنا چاہتی ہوں۔آج اسے اپنی بات دہراتے ہوئے غصہ نہیں آیا تھا۔

کس بات کے لیے؟وہ اس بت کو بھول چکا تھا۔

وہ۔۔۔اس دن۔۔۔۔اس نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

بیٹھ جاؤ۔ مگر اس نے بات درمیان سے کاٹ دی۔راج کمار نے راج کماری کو اپنے بائیں پہلو میں بیٹھنے کی جگہ دی۔

وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔

اس دن جو میں نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی اس کے لیے۔وہ اپنی گود میں رکھی کتابوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

مگر وہ اس کی بات نظر انداز کر گیا۔اس نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ایک کتب کو اٹھایا اور اسے کھول کر اس کا پہلا صفحہ دیکھا۔پھر بند کر کے واپس اسے تھما دی۔

ہمم تو ابرش نام ہے تمہارا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

جی۔ابرش کو بہت حیرت ہوئی۔وہ کیا سوچ رہی تھی اور وہ کیا رہا تھا۔

نائس نیم۔۔

نام کو سراہا گیا تھا۔

کیا مطلب ہے اس نام کا؟وہ موضوع کو جان بوجھ کر بدل رہا تھا۔

اللہ کی رحمت وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

لیکن مجھے تو اللہ کی نعمت لگتی ہو۔اس نے شوخ سے انداز میں کہاآنکھوں میں شرارت واضح تھی۔

جی؟؟وہ نا سمجھی کے عالم میں اسے تکنے لگی۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ سوری کی کوئی ضرورت نہیں اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اگلے انسان کاحشر نشر کر دیتا۔وہ ٹیک چھوڑ کر سیدھا ہوا۔

لیکن کسی کی ناک کی ہڈی توڑ دینا کہاں کی شرافت ہے بھلا؟اس نے اپنی ناک کو سہلاتے ہوئے کہا۔

اس کے یوں کہنے پر ابرش کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

میرے ساتھ ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔میں ہوں ہی اتنا خوبصورت کہ ہر لڑکی کی حالت ایسی ہوجاتی ہے۔وہ بلاوجہ بات کرنے کی کوشش کرتی ہے۔اس نے شیخی بگاڑتے ہوئے کہا۔

جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔آپ کی طرف دیکھ کر ہر لڑکی کو غصہ آنا بنتا ہے۔اففف کن الفاظ میں تائید کی گئی تھی۔یہ بات سن کر طلسمی شہزادے کا قہقہہ فضا میں بلند ہوا جسے سننے کے لیے ابرش اتنے دنون سے بے تاب تھی۔بلا شبہ وہ ایک خوبصورت شخصیت کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت مسکراہٹ کا بھی مالک تھا۔

زندگی میں کبھی بھی کسی انسان کو اپنی ذات پر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہیے اگر کوئی ایسا کرے تو اس کے ناک ہڈی کیا پورا چہرا توڑ دینا چاہیے۔وہ اسے شرمندگی کے بھنور سے نکال رہا تھا۔

ہاہاہاہاہا۔جی بہتر آج کے بعد آپ کے ساتھ ایسا ہی کیا کروں گی۔اس نے فرمانبرداری دکھائی۔

مادام اب ہم آپ کے ہر وار کے لیے ہوشیار رہا کریں گے۔اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میرا خیال ہے کہ اب تمہیں کالج جانا چاہیے۔اس نے گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

آپ نے اپنا نام تو بتایا نہیں۔جانے سے پہلے وہ یہ سول کرنا نہیں بھولی تھی۔

تو تم نے کونسا بتایا تھا۔شرارت سے کہتا وہ وہاں سے چلا گیا۔

)۔(______________________

حصہ سوم

چلو اَب لَوٹ آؤ تُم____
سُنو تُم نے کَہا تھا نا
مُجھے جَذبہ مُحبّت سے کَبھی

جو تُم پُکارو گے
میں اُس دِن لَوٹ آؤں گا
تو دَیکھو نا
کَئی لَمحُوں
کَئی سالُوں
کئی صَدِیُوں
سے تَیرا رَستہ تَکتی
یہ مَیری مُنتظِر آنکھیں
مَیرے دِل کی یہ دَھڑکَن اَور سانسیں
بَس تُمہارا نام لَیتی ہیں
وَہی اِک وِرد کَرتی ہیں
مَیری آنکُھوں کے ساحِل پَر
تَیری خَواہِش کی مَوجُوں نے
بَڑی ہَلچَل مَچائی ہے
تَیری تَصوِیر، سُوکھے پُھول اَور تحفے
تَیری چاہَت کی خُوشبُو میں
اَبھی تک سانس لَیتے ہیں
وہ سَب رَستے کہ جِن پَر تُم ہَمارے ساتھ چَلتے تھے
وہ سَب رَستے جَہاں تَیری ہَنسی کے پُھول کِھلتے تھے
جَہاں پیڑوں کی شاخُوں پَر
ہَم اَپنا نام لِکھتے تھے
اُداسی سے بَھرے مَنظَر
تُمہارے لَوٹ کَر آنے کی اُمیدَیں دِلاتے ہیں
سُنو کُچھ بھی نَہیں بَدلا
تُمہارے پاؤں کی آواز سُننے کی
مَیرے کَمرے کی بے تَرتِیب چِیزیں مُنتظِر ہیں
سُنو!
تکمِیل پاتی چاہتُوں کَو یُوں اَدھورا تَو نَہیں چھوڑَو
مُجھے مَت آزماؤ تُم

چلو اَب لَوٹ آ ؤ تُم

.

وہ آج بھی آیا تھا۔ہاتھوں میں پھولوں کی پتیوں والا شاپر تھامے۔

حسبِ معمول وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان دو قبروں کے پاس پہنچ گیا جن میں سے ایک کی مٹی ابھی تازہ ہی تھی۔ان قبروں پر سوکھے ہوئے پھولوں کی پتیاں تھیں جو شاید وہ کل ان پر نچھاڑ کر کے گیا تھا۔اس نے جیب سے ایک خالی شاپر نکالا اور ان سوکھی پتیوں کو چن کر اس میں ڈالنا شروع کر دیا۔

''ان پھولوں کی قسمت بھی عجیب ہوتی ہے خوش نصیب ہوں تو خوبصورت ہاروں کا اور اگر بدقسمتی اپنی دھول ان پر جما دے تو قبروں مزاروں کی چادروں کا حصہ بن جاتے ہیں۔''

ایک ایک پتی کو شاپر میں ڈالنے کے بعد وہ شاپر کو گرہ لگا کر وہیں قبروں کے نزدیک رکھ گیا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی کی بالٹی تھی جو وہ قریب ہی کسی نلکے سے بھر کر لایا تھا۔اس نے ہاتھ سے قبروں پر پانی چھڑ کا اور بالٹی کو واپس رکھ ادیا۔اس عمل کے بعد اس نے شاپر سے تازہ پھولوں کی پتیاں ان قبروں پر نچھاڑ کیں یہ عمل کرتے ہوئے وہ بہت ٹوٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

اگربتیاں جلانے کے بعد اس نے باری باری دونوں قبروں پر فاتحہ خوانی کی۔اس کے بعد وہ داہنی جانب والی قبر کے قریب بیٹھ گیا۔

آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں سے امڈ آیا تھا۔

کتنا دکھ ہوتا ہے نا جب جان سے پیارا ہمیشہ کے لیے منوں مٹی تلے دفن ہو جائے اور آپ اس صورت کو کبھی دیکھ نہ سکیں جسے آپ دیکھ کر جیتے ہوں۔

کچھ ہی فاصلے پر موجود ایک سائیں بابا اسے روز ایسا کرتے دیکھتے تھے۔قبر کے قریب بیٹھے اس اجنبی جوان کا چہرہ تر ہو رہا تھا۔وہ وہاں آ کر بہت روتا تھا لیکن زبان سے کچھ نہ کہتا تھا صرف اس قبر کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔خاموشی کی یہ زبان صرف وہ قبر ہی سمجھ سکتی تھی۔

سائیں بابا سے رہا نہ گیا۔وہ جاننا چاہتے تھے کہ اس کا ان قبروں سے کیا تعلق تھا؟

وہ ''حق اللہ'' ''حق اللہ''بلند آواز میں کہتے ہوئے اس کے پاس آ گئے۔وہ رو رہا تھا۔

مسلسل۔۔۔

بے پناہ۔۔۔۔

اس کے رونے میں شدت آ چکی تھی۔وہ سر نیچے کیے ہوئے تھا اور ہچکی بندھنے سے اس کا جسم پوری طرح سے لرز رہا تھا۔

''بیٹا۔''

انہوں نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا۔

اجنبی نے دھیرے سے اپنا تر چہرہ اٹھایا تو سامنے ایک نورانی چہرے والا فرشتہ صفت انسان نظر آیا۔

وہ آنسو صف کرتے کھڑا ہو گیا۔انہوں نے اس کا کاندھا دباتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''بیٹا۔''

انہوں نے اسے دوبارہ پکارا۔

''جی سائیں بابا۔''

وہ سر سے رومل کھول رہا تھا جسے اس نے فاتحہ پڑھنے کے لیے سر پر باندھا تھا۔

''آہ۔افسوس کے موت تمہارے بہت ہی پیاروں کو تم سے چھین کر یہاں لے آئی۔''

سائیں بابا کے کہنے پر اس نے ان قبروں کو بے بسی سے دیکھا اور پھر رخ موڑ کر آنسو ضبط کرنے لگا۔

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ ان قبروں میں تم نے اپنے کن پیاروں کو اتارا ہے؟''

ان کا ہاتھ ابھی بھی اس کے کندھے پر تھا۔

وہ کچھ دیر تک لب وا کرنے کے لیے ہمت جمع کرتا رہا۔

''اس لحد میں میری زندگی مقید ہے سائیں بابا۔''

دائیں جانب والی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ ایک دفعہ پھر اپنا ضبط کھو بیٹھا تھا آنکھ میں آب کو روکنے کے لیے جو اس نے بند اونچے کیے تھے، لمحہ ہی تو لگا تھا ان کو ریت کی دیوار کی طرح بیٹھنے میں۔سائیں بابا نے کچھ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اسے دعا دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

(---------------)

''میں اس ہفتے اپنی ماما کو تمہارے گھر بھیجنا چاہ رہا ہوں۔''

کالج چھوڑنے جاتے ہوئے میجر بلال نے اپنے دل کی بات ابرش کے سامنے رکھ دی۔کیونکہ وہ بنا کسی جائز رشتے کے اس سے مزید یوں نہیں مل سکتے تھے۔وہ اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور بے پناہ محبت کا دوسرا نام ہی نکاح ہے جو مرد نکاح نہیں کر سکتا وہ اس لڑکی سے سچی محبت بھی نہیں کرتا کیونکہ سچی محبت ہمیشہ ایک جائز رشتہ مانگتی ہے۔

''وہ کیوں؟''

برش نے نا سمجھنے کا ناٹک کیا۔

''ویسے ہی،وہ آپ لوگوں کا گھر دیکھنا چاہ رہی ہیں۔ ہم لوگ نیا گھر بنوا رہے ہیں اس کے لیے وہ آپ لوگوں کے گھر کی طرز تعمیر دیکھنے آنا چاہتی ہیں۔''

میجر بلال نے مصنوعی خفگی سے راستے میں پڑے ایک پتھر کو پاؤں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ہاہاہا۔۔۔ٹھیک ہے موسٹ ویلکم۔''

اسے میجر بلال کو تنگ کرنے میں عجب سا مزا آتا تھا۔

''ابرش۔''

انہوں نے رک کر ہولے سے اسے پکارا۔

وہ پلٹی تو پیچھے میجر بلال ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر اور دوسرا کھڑا کیے سڑک کے کنارے بیٹھے تھے۔ہاتھ میں ایک سرخ مخملی ڈبیا تھی جس میں سے انہوں نے ایک انگوٹھی نکالی۔

''کیا تم ایک خوبصورت فوجی کی ہمسفر بننے کا اعزاز لینا چاہو گی؟''

انگوٹھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے اسے نہایت خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ پرپوز کیا۔

وہ کچھ پل کے لیے حیرت میں ڈوبی رہی۔

"مس ابرش! میں اپنی بات دہراتا ہوں۔ کیا آپ ایک خوبصورت فوجی کی ہمسفر بننے کا اعزاز لینا چاہیں گی؟"

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

ابرش ارد گرد دیکھنے لگی۔ اسے میجر بلال سے ایسی حرکت کی توقع نہ تھی۔ مگر میجر بلال کب کسی کی توقع پر پورا اترتے تھے۔

"آپ کی اسٹیٹمنٹ ہی غلط ہے۔"

اس نے لبوں تلے مسکراہٹ چھپائی۔

"مطلب؟"

وہ حیران ہوئے۔

"مطلب یہ کہ آپ ایسے کہیں تو زیادہ بہتر ہو گا کہ۔۔۔"

وہ رکی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"کہ مس ابرش۔ کیا آپ ایک پاگل فوجی کی خوبصورت ہمسفر بننے کی سزا لینا چاہیں گی؟"

وہ بازو سینے پر باندھے کسی مہارانی کی طرح کھڑی تھی۔ جس کے آگے کسی سلطنت کا بادشاہ شکست مان کر گھٹنے زمین پر ٹکائے اس کے سامنے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو اور اس کا سر غرور سے بلند ہو رہا ہو۔

"فوجی اپنی کہی گئی بات میں ردوبدل نہیں کرتے لیکن اب تم کہہ رہی ہو تو میں اپنے جملے میں ان الفاظ کا اضافہ کر ہی لیتا ہوں۔"

گلا صاف کرتے ہوئے انہوں نے اس پر احسانِ عظیم کیا۔

"مس ابرش! کیا آپ ایک خوبصورت فوجی کی پاگل ہمسفر بننے کا اعزاز لینا چاہیں گی؟" وہ اپنے مقابلے میں کسی کو خوبصورت نہیں کہہ سکتے تھے۔

"ہاہاہاہا۔"

وہ دایاں ہاتھ منہ پر رکھتے ہوئے کھلکھلا دی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی بات نہیں بدلنے والے تھے۔

وہ کچھ دیر سوچنے کے لیے رکی۔ اور توقف سے بولی۔

"میں یعنی مس ابرش مسٹر بلال احمد کے زندان میں خود کو مقید کرنے کے حکم پر سر تسلیم خم کرتی ہوں۔"

جتنا قول خوبصورت تھا۔۔۔

اتنا ہی اقرار دلفریب تھا۔

فضائیں رقص کرتی میجر بلال کو مبارک باد دینے آنے لگیں۔

مہارانی کے اقرار سے بادل جھومنے لگے۔

کلیاں سر اٹھانے لگیں۔ اور بہارِ عشق کی آمد پر مبارک باد پیش کرنے لگیں۔

میجر بلال نے اپنی محبت کی نشانی اس کے خوبصورت ہاتھ کی انگلی کے سپرد کر دی۔

"تھینک یو ابرش۔"

خوشی سے بس وہ اتنا ہی کہہ سکے۔ فرط جذبات سے ایک ننھا سا آنسو ان کی آنکھ سے بہہ نکلا تھا۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جس نے ابرش کے دل کی سلطنت کو فتح کیا تھا۔

ابرش سر جھکائے کھڑی تھی سرخ ہوتے گالوں کے ساتھ۔

تیز ہوتی شور مچاتی دھڑکنوں کے ساتھ۔۔۔

کتنے ہی لمحے تھے جو خاموشی سے گزر گئے تھے۔ وہاں شور تھا تو صرف دونوں کے دلوں کی بڑھتی ہوئی دھڑکنوں کا۔

دونوں کی نگاہیں اس انگوٹھی پر تھیں جو ان کی محبت کی پہلی نشانی بننے پر نازاں تھی۔

(-------------------)

آج وہ بہت خوش تھی کیونکہ میجر بلال کی والدہ اس کے گھر آنے والی تھیں۔ اس نے کالج سے چھٹی لے لی تھی۔ صبح سے ہی تیاریوں میں مصروف تھی۔ گھر میں اِدھر اُدھر بھاگ کر وہ کام نمبٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

چچا جان تو اپنی پری کو یوں خوش دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ جبکہ چچی جان بار بار ماشاءاللہ کہتیں تاکہ بیٹی کو نظر نہ لگ جائے۔ اس نے ماں باپ جیسے اپنے چچا جان اور چچی جان کو میجر بلال کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ انہیں اپنی بیٹی کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے میجر بلال کی والدہ کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔

اس نے چائے کے ساتھ سرو کیے جانے والے تمام لوازمات خود تیار کیے تھے۔ اس کے بعد وہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بالکل تیار کھڑی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی کلیوں والی فراک، جس کے ساتھ وائٹ پاجامہ تھا، زیب تن کیے وہ اسی رنگ کا حصہ نظر آرہی تھی۔ سر پر سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے وہ ابرش کا کوئی اور ہی روپ تھا۔ ایسا روپ کہ جس پر ملکہ حسن بھی رشک کیے بنا نہ رہ سکے۔

"چچی جان میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

تیار ہونے کے بعد لونگ روم میں آ گئی، جہاں چچا جان اور چچی جان مہمانوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔ میری بیٹی تو آج چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے۔ انہوں نے اس کی بلائیں لیں۔"

"میری بیٹی تو ہمیشہ سے ہی چاند کا ٹکڑا ہے۔" چچا جان نے اسے پیار سے اپنے پہلو میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی بیٹی ہوں ناں اس وجہ سے۔" مسکراتے ہوئے اس نے اپنا سر چچا جان کے کندھے پر ٹکا دیا۔

"ہاہاہاہا۔ یہ تو ہے شکر کرو کہ تم اپنی چچی پر نہیں چلی گئی۔" انہوں نے چچی جان کی طرف تیر چلاتے ہوئے کہا۔

"میری بیٹی میرے جیسی ہی ہے۔" وہ ابھی اٹھ کر ان کے پاس چلی آئیں۔

"میں آپ دونوں جیسی ہوں۔ اسی لیے تو اتنی خوبصورت ہوں۔" اس نے دونوں کو پیار سے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔" بیٹی کو اتنا خوش دیکھ کر چچا جان کے دل سے بس یہی دعا نکل رہی تھی۔

"آمین، ثم آمین۔" چچی جان نے بھی دل سے دعا دی۔

(-----------------)

باہر ڈور بیل بجی تو وہ کیچن میں آ گئی۔ جبکہ چچا جان دروازہ کھولنے چلے گئے۔ دروازہ کھولا تو سامنے میجر بلال اور ان کی والدہ مہرالنساء کھڑی تھیں۔

''السلام علیکم۔''مسکراتے ہوئے انہوں نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' چچا جان نے نہایت خوش دلی سے جواب دیا۔

میجر بلال نے بھی اپنی ماں کی پیروی کرتے ہوئے سلام کیا۔ چچا جان نے انہیں گلے سے لگایا اور ان سے خیریت دریافت کی۔

''آیئے،اندر آیئے۔'' چچا جان نے انہیں اندر آنے کیلئے راستہ دیا۔

ہال میں داخل ہوتے ہی چچی جان نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔

ہرش کیچن کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی جو کہ ہال کی طرف کھلتی تھی۔۔ میجر بلال بلیک کلر کے تھری پیس میں ملبوس تھے۔کوٹ کی جیب میں سرخ رنگ کا رومال تکون کی شکل میں آدھا باہر کو نکلا ہوا تھا۔اس روپ میں وہ انہیں پہلی دفعہ دیکھ رہی تھی۔

''اگر میں انہیں پہلی دفعہ اس روپ میں دیکھ لیتی تو خود کو ہارٹ اٹیک کروالیتی۔ماننا پڑے گا کہ اس طلسمی شہزادے میں کچھ تو طلسم ہے۔''

وہ خود سے ہمکلام ہورہی تھی۔

چچی جان نے انہیں صوفوں پر بٹھایا۔ چچی جان پھولے نہ سمارہی تھیں۔

''بھا بھی آپ کو یہاں آنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟'' چچی جان مہرالنساء بیگم کے ساتھ بیٹھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''ارے نہیں،بلال کے ہوتے ہوئے کیسا مسئلہ۔ ویسے بھی اپنی بیٹی سے ملنے آرہے تھے اس لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔وہ بھی اپنے بیٹے کی طرح ایک شائستہ شخصیت کی ملک تھیں۔

''ہمیں اس وقت جتنی خوشی ہورہی ہے وہ ہم بیان نہیں کرسکتے۔'' چچی جان کی خوشی ان کی باتوں سے چھلکتی نظر آہی تھی۔

''یہ تو آپ لوگوں کا خلوص ہے جو ہمیں یہاں کھینچ لایا۔'' کتنی عاجزی تھی مہر النساء بیگم کے لہجے میں۔

''برخودار! آپ سنایئے،کیا کرتے ہیں؟'' چچا جان نے میجر بلال کے کندھے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

''اس ملک کی خدمت وحفاظت۔''ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے انہوں نے نہایت دھیمے مگر پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''ماشاءاللہ،بڑے مقدر والے ہو برخودار۔'' چچا جان کا لہجہ ستائش بھرا تھا۔

''جی انکل،بس اللہ تعالی کی مہربانی ہے''۔وہ خود کو کم بولنے پر مجبور کررہے تھے۔ورنہ وہ اس موضوع پر سانس لیے بنا تقریر کرسکتے تھے۔

''بھئی ہماری بیٹی کو بلائیں کب سے بے تاب ہورہی ہوں اسے دیکھنے کے لیے۔ ''مہر النساء بیگم میجر بلال سے بھی زیادہ بے تاب نظر آرہی تھیں۔

''جی،جی۔ میں ابھی بلا کرلائی۔''یہ کہتے ہوئے چچی جان وہاں سے چلی گئیں۔ کیچن میں آتے ہی انہوں نے ابرش کو ہال میں چائے لانے کا کہا۔

اس نے ٹرالی میں تمام لوازمات پہلے سے ہی سیٹ کر لیے تھے۔

''چچی جان میں بہت کنفیوز ہورہی ہوں''۔وہ ہاتھوں کی انگلیاں مسل رہی تھی۔

''کیوں بیٹا؟''انہوں نے پریشان ہو کر اسے کندھوں سے تھاما۔

''اگر ان کی ماما کو میں اچھی نہ لگی تو؟''یہ سوال اس کے دل میں کب سے کھٹک رہا تھا۔

''تمہیں دنیا کی کوئی بھی ماں اپنے بیٹے کے لیے ریجیکٹ نہیں کرسکتی۔''انہوں نے اس کے گال کو نرمی سے چھوا۔

''چلو شاباش اب جلدی سے چائے لیکر آؤ،مہمان انتظار کررہے ہیں۔''محبت سے کہتیں وہ باہر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد اس نے ایک نظر اپنا جائزہ لیا اور آہستہ آہستہ ٹرلی کو دھکیلتے وہ ہال میں آ گئی۔ہرش کے یوں داخل ہونے پر میجر بلال نے اپنی ٹائی کی ناٹ کو درست کیا جس کی ضرورت بھی نہ تھی۔

''ماشاءاللہ۔''ہرش پر نظر پڑتے ہی مہرالنساء بیگم کے منہ سے یہی الفاظ نکلے تھے۔

''السلام علیکم۔''ٹرالی ایک طرف کھڑی کر کے وہ ان کی والدہ کے پاس آگئی مہر النساء بیگم نے اسے گلے لگاتے ہوئے اپنی تمام ممتا اس پر نچھاوڑ کردی تھی۔

میجر بلال احمد کو سلام کرتے ہوئے وہ کپوں میں چائے انڈیلنے لگی۔چائے سب کو پیش کرنے کے بعد وہ مہرالنساء بیگم کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''ہمم۔چائے تو بہت اچھی بناتی ہے ہماری بیٹی۔''چائے کا پہلا سپ لیتے ہوئے ان کی والدہ نے اسے داد دی۔اس نے سر جھکائے بس مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

ہال میں خوش گپیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ میجر بلال کی والدہ کے سوالوں کے وہ بس مختصر سے جواب دے رہی تھی۔ جبکہ میجر بلال احمد نہایت خاموشی سے چائے پی رہے تھے۔

''شکر ہے ہڈیاں توڑنے کے علاوہ مادام کو چائے بھی اچھی بنانی آتی ہے۔'' وہ خود سے ہمکلام ہوتے ہوئے چائے کی تعریف کرنے لگے۔اس وقت وہ خود سے ہمکلام ہونے کے علاوہ او کسی سے بھی بات نہیں کرسکتے تھے۔

''برخودار! لگتاہے کہ آپ بہت کم گو ہیں''؟ چچا جان نے ان کی کافی دیر سے خاموشی کو محسوس کیا تھا۔

''نہیں انکل،ایسی بات نہیں۔ میں تو بس آپ سب کی باتیں سن رہا ہوں۔''اسی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے جواب دیا۔

''مجھ سے پوچھ کر دیکھیں کہ یہ کتنے کم گو ہیں۔'' وہ دل ہی دل میں کڑھی۔

''اسے یوں بیٹھا دیکھ کر کوئی کہہ سکتاہے کہ یہ وہی ابرش ہے جس نے اپنے ہونے والے مجازی خدا پر کئی بار حملے کیے ہیں اور وہ بھی جان لیوا۔'' میجر بلال نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوچا جو کہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ حیا کا پیکر بن کر مشرقی لڑکیوں کی شان بن کر۔

''بھئی مجھے تو اپنے بیٹے کی پسند پر فخر ہو رہا ہے۔''ان کی والدہ نے اس کے ماتھے پر ایک شفقت بھرا بوسہ دیا۔

''بھائی صاحب اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو کیا میں اپنی بیٹی کو انگوٹھی پہنا سکتی ہوں؟'' ان کی والدہ نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگوٹھی اتارتے ہوئے اس کے چچا جان سے اجازت چاہی۔

''جی ضرور بہن جی اب یہ آپ کی ہی امانت ہے۔ہمیں بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''ان کو اعتراض ہو بھی کیسے سکتا تھا۔اتنا اچھا رشتہ تو مقدروں سے ہی ملتا ہے۔

''لاؤ، بیٹا ہاتھ لاؤ۔ یہ ہماری خاندانی انگوٹھی ہے۔ یہ میری ساس نے مجھے دی تھی اور آج میں یہ تمہارے سپرد کررہی ہوں۔ابرش نے اپنا بایاں ہاتھ ان کی جانب بڑھایا جس کے درمیان والی انگلی میں میجر بلال کی پہنائی ہوئی انگوٹھی تھی۔ان کی والدہ نے انگوٹھی اس کے سپرد کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اس کی جبیں پر بوسہ دیا۔

''مبارک ہو برخودار۔'' چچا جان نے اٹھ کر میجر بلال کو گلے لگایا۔

''شکریہ انکل،شکریہ آنٹی اور شکریہ ماما۔'' ابرش کا شکریہ وہ بہت پہلے ہی ادا کر چکے تھے۔ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی ماما کو بانہوں میں لیکر گول گول گھمائے جیسا کہ وہ خوشی میں کیا کرتے تھے مگر زماں ومکاں ہر دفعہ موقع نہیں دیتے۔

ہرش ان کے دل کی حالت سے بہت محظوظ ہوئی تھی۔

''بھئی آنسہ بیگم! مہمانوں کا منہ میٹھا کرواؤ۔'' اس کے چچا کے کہنے پر اس کی چچی نے سب کا منہ میٹھا کروایا۔

کافی دیر تک ان کے درمیان باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔

''اچھا،آنسہ بہن اب ہم چلتے ہیں۔'' ان کی والدہ نے اٹھتے ہوئے اجازت چاہی

''بھابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔کھانا کھا کر جایئے گا۔'' چچی جان نے انہیں کھانے پر روکنا چاہا۔

'' کھانا پھر کبھی سہی۔اب تو آنے جانے کا سلسلہ لگا رہے گا''سہولت سے انکار کرتے ہوئے انہوں نے میجر بلال کو چلنے کا کہا۔

''ہم آپ لوگوں کا انتظار کریں گے۔'' وہ چچی جان کے گلے ملیں۔

''میں بہت خوش قسمت ہوں بیٹا کہ تمہارے جیسی بیٹی میرے گھر کی رونق بننے آرہی ہے۔''انہوں نے ابرش کو محبت سے گلے لگایا۔

''ٹھیک ہے برخودار۔اب تو ملاقاتوں کا سلسلہ رہے گا ہی۔ان شاءاللہ۔'' گلے سے لگاتے ہوئے انہوں نے میجر بلال کی کمر پر تھپکی دی۔

وہ سب انہیں دروازے پر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔میجر بلال نے مڑ کر ایک نظر ابرش کے چہرے پر ڈالی تھی اور اس کے شرماتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ان کے لبوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ رینگ گئی۔برش ان کے یوں دیکھنے پر اپنی چچی جان کے پیچھے چھپ گئی۔حقیقت میں وہ ان سے بہت شرما رہی تھی۔اس کی اس حرکت پر میجر بلال بالوں میں ہاتھ پھرتے ہوئے دروازے سے نکل آئے۔انہیں الوداع کہنے کے بعد وہ سب دوبارہ ہال میں آ گئے جبکہ ابرش اپنے کمرے میں چلی گئی

( )----------------

محبت کا پنچھی اب اڑنے لگا تھا۔محبت کی دھنک کے ساتوں رنگ بارانِ عشق کے بعد چاہت کی سنہری دھوپ میں آسمانِ الفت پر بکھر چکے تھے۔محبت کا آزاد پنچھی ان رنگوں کو چھونے کے لیے اڑان بھر چکا تھا۔

ہر آنے والا لمحہ انہیں محبت کے اور قریب کر رہا تھا۔

میجر بلال ابرش کو اس کی چچی جان کی اجازت سے پہلی با کسی ریسٹورنٹ میں لیکر آئے تھے۔میجر بلال اس کے سامنے میز پر کہنیوں کو ٹکائے ٹھوڑی کو ہاتھوں پر رکھے اسے بغور دیکھ رہے تھے۔اور وہ ان کے یوں دیکھنے پر کنفیوز سی ہو رہی تھی۔وہ اس وقت انہیں کتنی پیاری لگ رہی تھی شاید اس بات کا اندازہ اسے نہیں تھا۔

''مادام اگر آپ نے جی بھر کر شرما لیا ہو تو کچھ کھانے کا آرڈر کریں؟'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولے۔

''جی بالکل،اگر آپ نے میرا جی بھر کر جائزہ لے لیا ہے تو کر دیں آرڈر۔''وہ خفا ہوئی تھی۔

''ہاہاہاہا۔۔۔میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ تم کنفیوز کیوں ہو رہی ہو؟ہم کونسا پہلی بار مل رہے ہیں۔''وہ کہنیوں کا سہارا چھوڑتے ہوئے پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

برش نے پل بھر کے لیے ان کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔اسکائی بلیو شرٹ پہنے،آستین کہنیوں تک موڑے،فوجی ہیئر کٹ میں وہ اسے اور بھی کنفیوز کر رہے تھے۔

'میں کب کنفیوز ہو رہی ہوں؟'' اس نے حقیقت سے انکار کرنا چاہا۔

''پھر شاید میں کنفیوز ہو رہا ہوں۔''ٹیبل کو ایک ہاتھ کی انگلیوں سے آہستگی سے بجانے لگے۔

''آپ مجھے یہاں ایسی باتیں کرنے کے لیے لیکر آئے ہیں؟'' وہ اپنی ٹون میں آ رہی تھی۔

''میں ایسی باتیں کر رہا ہوں یا تم؟ کولڈ ڈرنک کا ایک سپ لیتے ہوئے وہ حیران ہوئے تھے۔

''ظاہری سی بات ہے کہ آپ۔'' اس نے سارا الزام ان پر ڈال دیا۔

''ہاں،ہاں۔سارا الزام میرے سر ڈال دیا کرو۔''

''اچھاناں۔اب لڑتے ہی رہیں گے یا کچھ منگوائیں گے بھی۔'' اسے زبردست بھوک لگی ہوئی تھی۔

'میں کب لڑائی کر رہا؟''انہوں نے دونوں ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھاتے ہوئے حیرت سے استفسار کیا۔

''تو آپ کا مطلب ہے کہ میں لڑ رہی ہوں؟'' بازو سینے پر باندھ کر خفگی سے کہتے وہ رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔

''تمہارا کچھ نہیں بننے والا ابرش۔''ایک لمبا سانس لیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''تو آپ نے میرا کچھ بنانا ہی کیوں ہے؟'' اس نے رخ موڑے ہی کہا۔

''اچھا بابا،سوری۔''انہوں نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑتے ہوئے کہا۔

''ایک شرط پر معاف کروں گی۔''وہ ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

''اللہ۔۔۔ کیسی شرط؟ ''وہ واقعی چڑ گئے تھے۔

''پہلے اس بات کا حلف اٹھائیں کہ میں یعنی میجر بلال آج کے بعد مس برش کو کبھی تنگ نہیں کروں گا۔اور اگر میں نے ایسا کیا تو مس ابرش جو بھی سزا تجویز کریں گی میں اس کا پابند ہوں گا۔ مہارانیوں کی طرح وہ اپنا حق جتوا رہی تھی۔

''ہاہاہاہا۔۔۔ تم واقعی پاگل ہو۔''میجر بلال کے لبوں پر اس کی یہ بات سن کر ہنسی رینگ گئی۔ابرش نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ٹھیک ہے میں حلف اٹھاتا ہوں کہ میں،یعنی میجر بلال آج کے بعد مس ابرش کو کبھی تنگ نہیں کروں گا اور اگر آج کے بعد میں نے ایسا کیا تو مس ابرش جو بھی سزا تجویز کریں گی میں اس کا پابند ہوں گا۔ایک وہی تو تھی جو انہیں لمحوں میں شکست دے سکتی تھی۔اور ایک وہی تو تھی جس کے آگے فوج کے ایک ناقابل شکست سپاہی کو بار بار ہارنا اچھا لگتا تھا۔

''یہ ہوئی نہ اچھے فوجیوں والی بات۔''وہ مسکراتے ہوئے انہیں کچھ جتا گئی تھی۔جواب میں وہ بس مسکرائے ہی تھے۔

''اچھا اب بتاؤ بھی کیا آرڈر کرنا ہے۔مجھے بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔'' برش کی ضد کی وجہ سے وہ اپنی بھوک کو بمشکل قابو کیے ہوئے تھے۔

''جو آپ کا دل کرتا ہے منگوالیں۔میں بھی تو دیکھوں کہ جناب کو کونسی ڈشز زیادہ پسند ہیں۔'' وہ اب نارمل ہو چکی تھی۔کیفیوز بیٹھی ابرش کہیں اڑن چھو ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے جناب۔آج اپنی پسند کا کھا لیتا ہوں پھر ساری عمر آپ کی ہی پسند کا کھانا ہے۔""

میجر بلال نے ایک ٹھینڈی آہ بھری۔

"ہاہاہا۔۔۔سمجھدار ہوتے جا رہے ہیں۔"

اس نے کولڈ ڈرنک کا گلاس منہ کو لگاتے ہوئے کہا۔

"جی بس آپ کی صحبت کا اثر ہے۔"

مینیو کارڈ واپس میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے ویٹر کو بلایا۔اور اپنا آرڈر اسے لکھوایا۔ویٹر مینیو کارڈ لیکر چلا گیا۔

میری فرینڈز کہتی ہیں کہ آرمی والے خوبصورت ہوتے ہیں"

لیکن آپ کی طرف دیکھ کر ایسا لگتا نہیں ہے۔"آج وہ جتنے حساب لے سکتی تھی،لے رہی تھی۔

آرمی والے خوبصورت نہیں ہوتے بلکہ بہت بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔"

مگر یہ خوبصورتی بھی صرف خوبصورت لوگوں کو ہی نظر آتی ہے۔"وہ بھی میجر بلال تھے۔حساب اسی وقت چکا دینے کے عادی۔

اور یہ خوش فہمی بھی صرف خوش فہم لوگوں کو ہی ہوتی ہے۔"وہ بھی چوٹ لگا رہی تھی۔"

ہاہاہاہا۔۔۔"جواباً میجر بلال کا کانوں میں رس گھولتا قہقہہ فضا میں ابھرا۔"

کھلکھلا کر ہنسنے سے میجر بلال کی آنکھوں کے کونے نم ہو گئے۔

انہوں نے ہاتھ سے آنکھیں صاف کیں۔

تب تک ویٹر کھانا لے آیا۔اس نے سلیقے سے ٹیبل پر کھانا چنا اور چلا گیا۔وہ دونوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

اور محبت کا پنچھی منزل کے مزید قریب پہنچنے والا تھا۔

(__________________)

وائلن کی وہی آواز قریب تر ہو رہی تھی۔وہ قدم قدم آگے بڑھ رہی تھی۔وائلن کی وہ آواز اسے اپنے سحر میں جکڑ کر اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔اد گرد کا منظر واضح تھا۔وہ یہاں پہلے بھی کئی بار آچکی تھی شاید۔اونچے اونچے پہاڑ جو آسمان سے سرگوشیاں کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ایک طرف بہتا دریا وائلن کی دھن سے مسحور ہو رہا تھا اور اسی دھن میں مگن اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔بائیں جانب آٹھ سے نو سال کی بچیاں سفید رنگ کی پوشاک پہنیں دھن پہ محو رقص تھیں۔سامنے ہی ایک اجنبی سفید رنگ کے کپڑوں میں وائلن بجا رہا تھا۔وہ آج بھی اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی کیونکہ اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ایک سحر طاری کر دینے والی دھن فضا کی نذر ہو رہی تھی۔وہ خاموشی سے یہ تماشا دیکھنے لگی۔آٹھ سے نو سال کی ان پریوں کو اس کے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی وہ اسی طرح رقص میں مگن تھیں۔وہ کبھی ایک پاؤں اوپر اٹھاتیں تو کبھی دوسرا۔کبھی ایک دوسرے کے قریب آ کر دائرے کو تنگ کر دیتیں تو کبھی گول گول گھومتے ہوئے ایک دوسرے سے دور چلی جاتیں۔اجنبی بھی اس کی آمد سے بے خبر تھا۔شائد وہاں موجود ہر چیز اس سے بے خبر تھی۔اس جنت کے ٹکڑے کی ایک ایک چیز اس وقت صرف و صرف اس اجنبی کی دھن کو سن رہی تھی۔جو شوخ سی باتیں اپنی دھن کی صورت میں ان کی سماعتوں کی نذر کر رہا تھا۔

وہ بھی اس دھن میں جکڑنے لگی جیسے کسی طلسم میں کوئی شہزادی جکڑی جائے یا پھر پرستان کی کوئی پری کسی جن کے جادو کے جنگلے میں آجائے۔جس سے رہائی ناممکن ہو۔

لیکن یہ کیا منظر پھر بدلنے لگا تھا۔نیلے آسمان کو کالی گھٹا گھیرنے لگی۔بچیاں جو پہلے اپنے رقص میں محو تھیں ننھے ننھے ہاتھ سینے پر رکھ کر سامنے کی جانب سے اٹھنے والی گھٹا کو دیکھنے لگی۔وائلن کی دھن میں بہتا دریا خون کی ندی بن گیا تھا۔وہ شوخ سی دھن جو اس پر سحر طاری کر رہی تھی اب ماتم میں بدل گئی تھی۔وہاں موجود ہر زرے کو فرق پڑا تھا مگر اجنبی ویسے ہی کھڑا تھا۔وائلن کو کندھے اور سر کے درمیان ٹکائے۔گھٹا آگے بڑھنے لگی۔بچیوں نے بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔جیسے وہ جانتی ہوں کہ کیا ہونے والا ہے۔اور شاید کچھ بہت ہی برا ہونے والا ہے گھٹا اجنبی کی جانب بڑھ رہی تھی۔بچیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔وہ وہاں کھڑی اس اجنبی کو آواز دے رہی تھی۔مگر بچیوں کے رونے کے شور میں وہ اسے نہیں سن پا رہا تھا۔بچیاں اب بہت دور جا چکی تھیں مگر ان کے رونے کی آوازیں ابھی بھی آ رہی تھیں۔وہ کانوں پر ہاتھ رکھے انہیں چپ ہونے کا کہہ رہی تھی۔اس نے اجنبی کو بلند آواز میں پکارنا شروع کیا۔

گھٹا اجنبی کے سر پر پہنچ چکی تھی۔اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی گھٹا نے اجنبی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔وہاں اب کچھ نہیں تھا۔نہ ہی وہ بچیاں، نہ ہی ان کے رونے کی آواز اور نہ ہی وہ دھن بجاتا اجنبی۔وہاں تھی تو صرف ایک غائبی آواز جو نجانے کس سمت سے آ رہی تھی۔

"یہاں آؤ گی تو ماتم بن جاؤ گی۔"

بار بار انہیں لفظوں کی پکار۔وہ پاگل ہو رہی تھی شاید۔اس نے بے سمت بھاگنا شروع کر دیا۔وہ بھاگ رہی تھی مگر زمین پھیلتی جا رہی تھی۔اچانک کسی پتھر سے ٹھوکر لگنے سے وہ گہری کھائی میں جا گری۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے میں تھی اپنے بستر پر۔وہ پسینے سے شرابور تھی۔اور اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز چل رہی تھی۔اور تنفس بھی بگڑ چکا تھا۔اس نے وال کلاک پر دیکھا تو رات کے دو بج رہے تھے۔وہ ہاتھ سے چہرہ صاف کرتی بیٹھ گئی۔سائیڈ ٹیبل سے اس نے پانی کا جگ اٹھایا اور کانپتے ہاتھوں سے پانی گلاس میں انڈیلنے لگی۔

دونوں ہاتھوں سے گلاس کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے اس نے گلاس کو منہ سے لگایا اور دو گھونٹ پینے کے بعد گلاس کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

یہ خوب کس چیز کی جانب اشارہ کر رہا ہے؟اگر میں وہاں گئی تو میری زندگی ماتم میں ڈوب جائے گی مگر کہاں؟یہ خواب جب بھی اسے آتا تو سوالوں کا ایک انبار اپنے ساتھ لاتا۔اور اسے ان سوالوں کے بھنور میں دھکیل کر چلا جاتا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی کھڑکی کے پاس آ گئی جو باہر کی جانب کھلتی تھی۔اس نے پردہ سرکایا تو ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے جسم میں سرائیت کر گیا۔سامنے لندن کی خاموش گلیاں تھیں۔نیم روشنی میں ڈوبی ہوئیں۔اور دھند میں لپٹا آسمان جس پر ستارے بھی اسے اپنے خواب کی طرح مبہم نظر آ رہے تھے سردی اپنے عروج پر تھی مگر اس خواب سے زیادہ سرد نہیں جس کی سل پر وہ لیٹ گئی تھی۔جس کے ساتھ اسے زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا اور ہر دفعہ صرف ایک مبہم سا اشارہ دیا جاتا تھا رہا ہونے کے لیے۔وہ سوچ کے بھنور میں پھنسی تاریکی میں ڈابے آسمان کو تکنے لگی جہاں سے نجانے کونسا فیصلہ آنے والا تھا۔

(___________________)

صبح گیارہ بجے اس کی آنکھ کھلی۔اس کا یونی جانے کو دل نہیں کر رہا تھا اس لیے وہ بیڈ پر سستی سے لیٹی رہی۔اچانک موبائل کی بیپ بجی تو اس کی سکرین پر آسٹن کا نمبر جگمگا رہا تھا۔اس نے کوئی پیغام بھیجا تھا۔اس نے نیم وا آنکھوں سے میسج چیک کیا تو اس میں آسٹن نے اسے پاکستان کی ٹکٹس بک ہونے کی اطلاع دی۔آسٹن نے سب کے لیے اگلے ہفتے کی ٹکٹس بک کروائی تھے۔اس نے موبائل کو واپس رکھا اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

مجھے آسٹن کے ساتھ اپنی اس بات کو شیئر کرنا چاہیے۔شاید وہ اس کا کوئی حل نکال لے۔وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔میری اس پریشانی کا اس کے پاس ضرور کوئی حل ہو گا۔اور وہ اسے حل کرنے کی ضرور کوشش کرے گا۔

وہ آسٹن کو اس خواب کے بارے میں بتانے کا ارادہ کرنے لگی۔

(__________________)

میرا دل تیری محبت کا ہے جان بخش دیار
میرا سینہ تیری حرمت کا ہے سنگین حصار
میرے محبوب وطن تجھ پہ اگر جان ہو نثار
میں یہ سمجھوں گا ٹھکانے لگا سرمایہ تن

کیپٹن عاطف اور ان کے دو ساتھی سپاہی سرمایہ تن کو ٹھکانے لگا چکے تھے۔حوصلے اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے وہ دشمنوں کی پہلی صفوں کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔دشمن کے قریب پہنچ کر انہوں نے شدید حملے کیے۔بہت سے درندہ صفت انسانوں کو وہ ٹھکانے لگانے کے بعد مزید آگے بڑھ تھے۔ میجر بلال کی ہدایت پر انہوں نے بائیں جانب سے دشمن پر حملہ کیا تھا اور چوٹی کی

جانب پیش قدمی کی تھی۔دشمن پوری طرح سے بوکھلا چکا تھا۔ میجر بلال اور ان کی یونٹ کے تمام جوانوں نے دشمن کی کمر توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ایک ایک کر کے دشمن کے ساتھی اپنے اپنے انجام کو پہنچ رہے تھے۔اتنے میں ہی ایک دستی بم دشمن کی طرف سے آیا اور کیپٹن عاطف اور انکے ساتھیوں کے قریب پھٹ گیا۔بم پھٹنے کی وجہ سے کیپٹن عاطف اور ان کے قریب دشمن کی جانب بڑھتے ہوئے دو سپاہی اپنی جان کا نذرانہ وطن کی خدمت میں پیش کر چکے تھے۔

"سر کیپٹن عاطف شہید ہو گئے ہیں۔"

میجر بلال کو وائرلیس پر یہی سنا تھا۔ کیپٹن عابد کی آواز انہیں اس وقت پرنم لگی تھی۔

اللہ اکبر۔" میجر بلال صرف یہی کہہ سکے۔"

کیپٹن عاطف میجر بلال کے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھے۔ جن کے ساتھ انہوں نے پانچ سال کا عرصہ گزارا تھا۔

ہمت رکھو جوانوں۔ وہ بہت خوش قسمت ہیں کہ شہادت جیسا مرتبہ ہم سے پہلے حاصل کر گئے ہیں۔"

اللہ کا نام لو اور آگے بڑھتے رہو۔ دشمن بہت جلد ختم ہونے والا ہے۔" وائرلیس کے ذریعے میجر بلال نے کیپٹن عابد کی ہمت بندھائی جن کا حوصلہ جواب دے گیا تھا کیپٹن عابد اور کیپٹن عاطف بچپن کے دوست تھے۔ وہ زندگی کے ہر میدان میں ایک ساتھ رہے تھے۔ انہوں نے آرمی بھی اکٹھے ہی جوائن کی۔ ہر آپریشن پر وہ ہمیشہ ایک ساتھ گئے۔ مگر قدرت کو ان کا مزید ساتھ قبول نہیں تھا۔ اس لیے اس نے کیپٹن عاطف کو شہادت کا جام پیش کر دیا تھا۔

ان شاءاللہ سر۔ بوجھل دل سے رابطہ ختم کرنے کے بعد کیپٹن عابد آگے بڑھ گئے۔ کیونکہ یہ وقت وطن کے دشمنوں کا صفایا کرنے کا تھا۔

(   )_______________

سر فروشی ہے ایماں تمہارا
جرتوں کے طلبگار ہو تم
جو حفاظت کرے سرحدوں کی
وہ فلک بوس دیوار ہو تم

دشمن اگر تین ہزار بزدلوں کا لشکر لیکر نکلا تھا تو پہلی پیش قدمی میں اس ملک کے تیس ہزار بیٹے اپنی دھرتی ماں پر اپنا تن من قربان کرنے سر پر کفن باندھ کر نکلے تھے۔ یہ تو سیلِ رواں تھا، جسے روکنے کے لیے دشمن میں دم نہیں تھا۔ یہ تو جذبہ تھا وطن سے عشق کا کہ جس کی آنچ لہو کو گرما رہی تھی۔ وطن کی طرف اٹھنے والی ہر میلی آنکھ کو پھوڑنے کے لیے یہ بیٹے کسی بھی خوف سے بالا تر ہوکر مقتل گاہ پہنچ گئے تھے۔ یہ مقتل گاہ اس ملک کے بیٹوں کے لیے جنت کی بشارت تھی جب کہ دشمن کے لیے جہنم واصل ہونے کا سندیسہ۔ موت دونوں کے لیے بازو پھیلائے ان سنگلاخ پہاڑیوں میں کھڑی تھی لیکن اس ملک کے بیٹوں کے لیے وہ دائمی حیات کا فرشتہ بن کر آئی تھی اور دشمن کے لیے عبرت کا نشان۔

ے جس دھج سے کوئی مقتل گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی چیز ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں

مادرِ گیتی کے بیٹے جس دھج سے مقتل گاہ گئے تھے موت حیران رہ گئی۔ زمان و مکان حیرت سے ایک دوسرے کا چہرا تکنے لگے۔ ناقابلِ تسخیر فوج عزم لیے دشمن کا منہ توڑنے میدان جنگ پہنچ چکی تھی اور پہلی ہی کاروائی میں میجر بلال کی قیادت میں 031 کے قریب دشمنوں کو جہنم جانے کا راستہ دکھا چکے تھے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

آنکھوں میں موت کے خوف کی جگہ وطن سے عشق کی چمک نے لے لی تھی جو کہ دشمن کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ تاریخ لکھی جا رہی تھی۔ اس ملک کے بیٹوں کے نام، جو اس پر اپنا سب کچھ قربان کر گئے تھے، کے نام بڑی شان سے اس میں رقم ہو رہے تھے عبرت کا نشان بنے دشمن تاریخ کے ابواب میں اپنا نام سیاہ صفحوں پر لکھوا چکے تھے کہ جن پر سیاہی کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

(   )_______________

گفتگو اچھی لگی، ذوقِ نظر اچھا لگا
مدتوں کے بعد کوئی ہمسفر اچھا لگا
اپنی اپنی چاہتیں ہیں لوگ اب جو بھی کہیں
ایک پری پیکر کو اک آشفتہ سر اچھا لگا
میر کے مانند اکثر زیست کرتا تھا
تھا تو وہ دیوانہ سا شاعر مگر اچھا لگا

" گڈ مارننگ۔"

اس غزل کے ساتھ گڈ مارننگ کا میسج میجر بلال کے موبائل کی سکرین پر جگمگا رہا تھا۔ ابرش کا میسج دیکھ کر میجر بلال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ بیڈ سے اٹھ کر وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئے اور میسجز کا فولڈر کھنگالنے لگے۔ ان کے پاس شاعری کی اتنی کلیکشن تھی مگر اس وقت انہیں کوئی میسج نہیں ملا۔

پھر بھی جلدی ریپلائی کرنے کے لیے انہوں نے ایک شعر کے نیچے جو ابھی ابھی ان کے دماغ میں آیا تھا، کے نیچے گڈ مارننگ مائی لو لکھا اور ابرش کو فارورڈ کر دیا۔

ے کچھ خاص نہیں بس اتنی سی ہے داستانِ محبت میری
ہر رات کا آخری خیال، ہر صبح کی پہلی سوچ ہو تم

" گڈ مارننگ مائی لو!۔"

میسج کھولتے ہی ابرش کا انگ انگ اک نئے احساس میں ڈوبنے لگا۔ اس نے محبت بھری ایک نگاہ موبائل پر ڈالی اور پھر کالج جانے کی تیاری کرنے چلی گئی۔

(   )_______________

حصہ چہارم

پاکستان آنے سے پہلے ماریہ اور آسٹن کو ایک دفعہ پھر ٹریفلگر اسکوائر آنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن اس دفعہ وہ میوزیم میں نہیں آئے تھے اور نہ ہی ان اسٹریٹس میں بنے تھیٹرز اور سینیما ہالز میں آئے تھے۔ بلکہ اس دفعہ ان کی یونیورسٹی کے تمام اسٹوڈنٹس اپنے آئرش فیلوز کے کہنے پر ان کی تقریب دیکھنے آئے تھے۔ جو کہ ہر سال لندن میں ہوتی تھی۔

نیلسن کے عظیم الشان مجسمے کے نیچے ایس۔ ٹی۔ پیٹرک ڈے منایا جا رہا تھا۔ ماریہ پہلی فعہ کسی ایسی تقریب میں شرکت کرنے آئی تھی۔ اور وجہ اس کا نیا بننے والا دوست تھا جو اسے دنیا گھمانے کی ٹھان چکا تھا۔

لندن کی چند گلیوں تک محدود رہنے والی وہ لڑکی دنیا کی تمام گزر گاہوں پرسفر کررہی تھی۔کائنات کے حسین رنگ وہ پہلی دفعہ اپنی زندگی کے پھیکے کینوس پر بکھرے دیکھ رہی تھی۔بلاشبہ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

چند لمحوں کے بعد پریڈشروع ہونے والی تھی۔جسے دیکھنے کے لیے لوگوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔

"ماریہ دیکھنا بہت مزا آنے والا ہے۔"شور کی وجہ سے آسٹن چیخ کر کہہ رہا تھا۔ماریہ اس کی بات پر مزید پرجوش ہوگئی۔

ٹریفلگر اسکوائر ہرے،نلجی اور سفید رنگ میں ڈوبا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔یہ رنگ آئرلینڈ کے جھنڈے کی نمائندگی کررہے تھے۔

اتنی ہی دیر میں تین لڑکیاں جنہوں نے نارنجی رنگ کے لباس زیب تن کیے تھے،پریڈ کے روٹ پر نمودار ہوئیں۔انہوں نے یک زبان ہو کر وہاں پرموجود تمام لوگوں کااستقبال کیااور پریڈ کے باقاعدہ آغاز کااشارہ کرتے ہوئے جس جذبے سے آئی تھیں اسی جذبے کے ساتھ لوٹ گئیں۔

ان کے پیچھے ہی میوزک چلنے کی آواز آئی،جسے ایک دستہ سننے والوں کی نذر کررہا تھا۔ایک آدمی سینٹ پیٹرک کا پورٹریٹ لیے اس پریڈ کا باقاعدہ آغذ کرنے کے لیے سب سے آگے تھا۔

ماریہ جنگلے سے لگے وہ سب منظر بڑی گرم جوشی سے دیکھ رہی تھی۔

آئرلینڈ کے جھنڈے کی نمائندگی کرتے ہوئے آدمی کے پیچھے تین لمبی قطاریں موجود تھیں جن میں مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ان سب نے ایک جیسے لباس پہن رکھے تھےموسیقی کی لے پر وہ پریڈ کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔وہ کبھی ایک پاؤں زمین پر مارتے تو کبھی دوسرا کبھی بانہوں کا گھیر اتنگ کرتے تو کبھی بازو آکاش کی وسعت کے لیے کھول دیتے۔کبھی ہاتھ میں پکڑی چھڑیوں کو گھماتے تو کبھی بغل میں دبا کر سر پر اڑھی ٹوپیوں کو عزت سے درست کرتے۔

میوزک بدلا اور وہ پاؤں زمین پر مارتے،بازوں کو مخصوص انداز میں ہلاتے چلے گئے۔اس کے پیچھے ایک بڑا ساجھنڈ اٹھامے ایک گروہ نمودار ہوا۔جھنڈے پر سینٹ پیٹرک کے لیے عقیدانہ جملے لکھے گئے تھے۔

ہلکی ہلکی بارش برس رہی تھی جس سے سامنے کا منظر اور بھی دلکش ہو رہا تھا۔

ماریہ۔۔۔

لندن کی شاطر گلیوں سے نکلی۔۔

ایک معصوم سی لڑکی۔۔۔

ہر منظر کو یادوں کے قید خانوں میں مقید کررہی تھی۔

وہ ہر بدلتےمنظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی لمحوں میں منظر بدلا اور سامنے ہری ٹوپیاں اوڑھے،گردنوں میں چھوٹے ڈرم لٹکائے مرد اور عورتوں کا ایک گروپ نمودار ہوا۔

وہ دو تین دفعہ ہاتھ میں پکڑی چھڑی ڈرم پر مارتے اور پھر ہاتھ فضامیں بلند کرکے مخصوص آوازیں نکالتے۔وہ آوازیں ماریہ لندن میں رہتے ہوئے بھی پہلی دفعہ سن رہی تھی۔

نیلسن ان چیزوں کا عادی ہو چکا تھا۔اسی لیے وہ ٹریفلگر اسکوائر کے ٹاور پر ایک شان سے کھڑا بے نیاز نظر آرہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تین خوبصورت لڑکیاں منظر پر آئیں اور آئرش ڈانس پیش کرنے کے بعد منظر سے ہٹ گئیں۔

آسٹن کی نیلی آنکھیں بھوری آنکھوں والی لڑکی کو دیکھنے میں محو تھیں۔اس کے لیے لندن کے تمام حسین رنگ ان بھوری آنکھوں میں نہاں تھے۔

وہاں آئرلینڈ کی ہر ایسو سی ایشن کی نمائندگی ایک مخصوص گرہ کررہا تھا۔ہر گروہ کا اپنا انداز تھا اور ہر انداز دلکش تھاہر گروہ کے ساتھ ایک دستہ تھا اور ہر دستہ ایک الگ دھن کا مالک تھا۔

نیلسن کے مجسمے تلے ہزاروں لوگ جمع تھے

ٹاور کے نیچے چاروں کونوں میں بنے شیروں کے مجسمے آج بھی اتنے ہی ہیبت ناک تھے۔لیکن آج ماریہ ان کی جانب متوجہ نہیں تھی۔اس کا توجہ کا مرکز تصویر میں ابھرنے والا ایک بہت بڑا انسانی مجسمہ بن چکا تھا،جس کے نمودار ہوتے ہی موسیقی کی دھنیں دہشت پھیلانے لگیں۔وہ ایک بہت ہی خوفناک شکل کا مالک تھا۔جسے ایک انجن کی مدد سے چلایا جارہا تھا۔اس کا چہرہ جھری دار تھا جس پر لمبے لمبے بال لٹک رہے تھے اور آنکھیں کسی دہکتے سرخ انگارے کی طرح تھیں۔وہ گردن ہلاتا کبھی دائیں جانب دیکھتاتو کبھی بائیں جانب۔

جنگلے کے ساتھ لگی وہ لندن کی ڈپوک لڑکی آسٹن کے قریب ہوگئی۔دونوں کے کندھے ایک دوسرے کے ساتھ مس کرنے لگے۔اس پل آسٹن کو لگا تھا اس کی ساری دنیا اس لمحے میں اس کے قریب ہوگئی تھی۔وہ دہشت ناک چہرے والا مجسمہ آسٹن کو کتنا اچھا لگا تھا یہ بات ماریہ نہیں جانتی تھی۔

آسٹن دل میں چھوٹی چھوٹی دعائیں کرنے لگا کہ کاش وہ لمحہ ہمیشہ کے لیے ٹھہر جائے اور وہ اس کے قریب یونہی رہے ہمیشہ،آخری سانس کے آنے تک۔لیکن قدرت شاید یہ نہیں چاہتی تھی۔اس لیے وہ لمحہ گزر گیا اور جدائی ان کے درمیان آ گئی۔

آسٹن نے لاشعوری طور پر مڑ کے نیلسن کے مجسمے کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر بکھری تفخرانہ مسکراہٹ آسٹن کو لب بھینچنے پر مجبور کرگئی تھی۔نیلسن سے پھسلتی نگاہیں ماریہ کے چہرے سے ٹکرائی تھیں جو کہ ان رنگوں میں کہیں گم ہوتی جارہی تھی۔شام کے سایے اس کی خوشیوں پر پھیلتے جارہے تھے۔

پریڈ اپنے اختتام کی جاب تھی۔اس لیے لوگ اپنے گھروں کی جانب لوٹ جانے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔

آئرش جھنڈے کو جسم پر لپیٹے ایک خوبصورت لڑکی نے تمام لوگوں کا تقریب میں آنے کے لیے شکریہ ادا کیااور ایک خوبصورت مسکراہٹ لندن کے باسیوں کی نذر کرتی ایک ادا سے چلتے ہوئے چلی گئی۔

آسٹن ماریہ کی جانب پلٹا لیکن ایک دھکا لگا تھا اور ماریہ لوگوں کے سیلاب میں بہہ گئی۔وہ لوگوں کو دھکیلتے ماریہ کی جانب بڑھنے لگا۔

"ماریہ"

"ماریہ"

اس نے خود کو چیختے ہوئے پایا تھا مگر لندن کے باسیوں کا سیلاب اس کی ماریہ کو اپنے ساتھ بہانے لگا۔ماریہ بھی اسے پکار رہی تھی لیکن آواز لوگوں کے ہجوم میں ہی کہیں کھوئے جارہی تھی۔

آسٹن کو اپنی سانس رکتی ہوئی نظر آئی جب ایک ذور کا دھکا ماریہ کو لگا اور وہ لندن کے باسیوں کے پیروں کے رحم و کرم پر آ گئی۔وہ نیچے گری تھی۔

نیلسن کے مجسمے کے سامنے سے بے رحم لوگ گزر رہے تھے۔

گروہ در گروہ۔

ماریہ کو روندتے ہوئے۔

آسٹن کی ماریہ کو روندتے ہوئے۔

آسٹن آگے بڑھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن لوگوں کا سیل اس کی مخالف جانب بہہ رہا تھا۔وہ لوگوں کے ساتھ پیچھے کی جانب دھکیلا بجارہا تھا۔

اس کی نظریں ابھی بھی اسی جگہ پر تھیں جہاں وہ جان سے پیاری لندن کی بے رحمدلی کا شکار ہوئی تھی۔وہ ساری قوت جمع کرتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ کرچیڑ کر بمشکل آگے بڑھا۔

اس جگہ کے قریب پہنچ کر اس نے ماریہ کو آواز دی۔ جواب میں اسے کسی نے بے بسی سے پکارا تھا۔ لیکن پھر منظر ٹھہر گیا۔ ٹریفلگر اسکوائر پر خاموشی کی چادر چھا گئی لوگ دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اور زمین پر پڑے اس بے جان وجود کو دیکھنے لگے جو کہ خون آلود ہو چکا تھا۔ آسٹن ایک آئرش لڑکے کو دھکیلتے ہوئے دائرے میں داخل ہو گیا۔

موت کی تکلیف کسے کہتے ہیں یہ کوئی نیلسن کے بے رحم مجسمے کے سامنے کھڑے آسٹن کی آنکھوں سے واضح چھلک رہا تھا۔

لندن کا عظیم ٹاور ایک جانب لڑھکا اور نیلسن کا مغرور مجسمہ ٹوٹ کو زمین بوس ہو گیا۔ اور اس کا سارا ملبہ آسٹن پر گر گیا۔

اس کے قدم ک چکے تھے۔ ماریہ کے وجود کے پاس۔ جس سے زندگی کی رمق ختم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر دیوانہ وار اس کے وجود کو گلے سے لگایا۔ نیلی آنکھوں سے غم کے چشمے پھوٹ رہے تھے جن کا پانی آسٹن کے گالوں سے ہوتا ہوا ماریہ کے بالوں میں جذب ہو رہا تھا۔

اد گرد پھیلی خاموشی چہ مگوئیوں سے شکست کھانے لگی۔ ٹریفلگر اسکوائر کے کبوتر پھڑ پھڑانے لگے۔ دھ کہیں گاڑیوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ دینے کے قریب تھا۔ آسٹن ان آوازوں کو سن پا رہا تھا۔ وہ پولیس کی گاڑیاں تھیں اور ان میں ایمبولینس کا آلارم واضح سنائی دے رہا تھا۔

ایمبولینس کے قریب آنے سے لوگ پیچھے ہٹنے لگے اور جگہ بنانے لگے۔ کاش وہ یہ جگہ پہلے بنا دیتے۔

ایمبولینس سے دو آدمی نکلے اور اس کی ماریہ کو اس سے چھینتے ہوئے دور لے گئے۔ وہ ایمبولینس کو جاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

"اگر ماریہ کو کچھ ہوا تو میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے غصے سے ایک خالی کین نیلسن کی جانب پھینکا۔ اور پھر ایک ٹیکسی کی جانب لپکا۔ اسے ہاسپٹل جانا تھا اپنی زندگی کے پیچھے۔

(————————)

میجر بلال کی شادی کی خوشی میں ان کی یونٹ کے جوانوں نے بون فائر کیا ہوا تھا۔ ٹھٹھرتی راتوں میں گرما دینے والے لمحے کتنی خوشی دیتے ہیں اس بات کا اندازہ صرف پاک فوج کے جذبے سے لگایا جا سکتا ہے۔

کھلے آسمان تلے آگ کا آلاؤ روشن کیے وہ سب میجر بلال کو شوخ سوالوں سے زچ کر رہے تھے۔ مگر میجر صاحب بھی ان کے میجر تھے، آسانی سے ان کی باتوں کے جواب نہیں دے رہے تھے۔

ایک طرف باربی کیو تیار کیے جا رہے تھے جبکہ دوسری طرف سیکنڈ لیفٹیننٹ دانیال ساقی ایک خالی کین کو بجاتے ہوئے خوبصورت آواز میں مختلف علاقائی گیت پیش کر رہے تھے۔ جبکہ باقی جوان تالیاں بجا کر ایک نئی دھن تشکیل دے رہے تھے۔ میجر ارتضی حدید بھی چائے کا بھاپ اڑاتا کپ لیے وہیں آ گئے۔

"سر سنا ہے کہ شادی کے بعد کی زندگی بہت عبرت ناک ہوتی ہے؟" دانیل کو نا جانے کیا سوجھا تھا جو میجر صاحب کو یہ سوال داغ دیا۔

"ہاہاہاہا۔" میجر بلال کا ایک خوبصورت قہقہہ اس سرد رات کی نذر ہوا تھا۔

"شادی کے بعد کا پتا نہیں لیکن میں تو شادی سے پہلے بھی عبرتناک زندگی گزار چکا ہوں۔" ناک پر لگی چوٹ کا نشان سہلاتے ہوئے انہوں نے میجر ارتضی سے چائے کا کپ چھین لیا۔ میجر ارتضی کو ان سے ایسی ہی امید تھی اسی لیے انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

"یار آج تو بتا ہی دو کہ اس چوٹ کے پیچھے کیا راز ہے؟" میجر ارتضی نے راز داری دکھائی۔

"راز کی باتیں ہیں، راز ہی رہنے دو۔" اب وہ اتنے بھی پاگل نہیں تھے کہ ابرش سے پٹنے کا راز میجر ارتضی کے سامنے کھول دیتے اور وہ بی بی سی کی نیوز کی طرح دنیا بھر میں ان کی تشہیر کرتے پھرتے۔

"کوئی بات نہیں، وہ تو میں پتا لگوا ہی لوں گا۔" انہوں نے میجر بلال سے کپ واپس لے لیا۔

"کیا ہے یار تھوڑی اور پینے دو۔" لہجہ منت سماجت سے بھرپور تھا۔

"تو جاؤ، اپنی لے آؤ۔" مزے سے سپ لیتے ہوئے انہوں نے میجر بلال کا دل جلایا تھا۔

ویسے یار میری زندگی کا بھی ایک دور عبرت ناک گزرا ہے۔" چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے انہوں کرسی کی ٹیک چھوڑ دی۔

"اچھا، مگر کب؟" میجر بلال کو میجر ارتضی کے راز جاننے کا بہت شوق تھا۔

"تم یہ سول کرتے اچھے نہیں لگتے۔" انہوں نے میجر بلال کو کچھ جتایا۔

"میں ہر سول کرتا اچھا لگتا ہوں۔" دلکش چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجی تھی۔

جس کی چمک بہت شوخ تھی۔

جو خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔

"یار پی۔ایم۔اے کے ابتدائی دن، کیا کسی قیامت سے کم تھے؟" مٹھی کے اوپر ٹھوڑی رکھتے ہوئے انہوں نے ایک سرد "آہ" بھری۔

"ہاہاہاہا۔" آگ کے آلاؤ کے قریب سے قہقہے ابھرے تھے۔

"ہاہاہاہا۔۔۔وہ بھی کیا دن تھے۔" میجر بلال نے ماضی کو یاد کرنے کی کوشش کی۔

"سر ہم نے تو سنا ہے کہ آپ کو سوارڈ آف آنر ملی تھی۔ پھر بھی آپ کو اپنے وہ دن عبرتناک لگتے ہیں؟" دانیال ایک دہکتی سیخ اٹھا کر لائے جس پر چند بوٹیاں لگی ہوئی تھیں جو کہ آگ کی بے رحمی کا شکار ہو کر بھن چکی تھیں۔

"کچھ نہ پوچھو کہ یہ اعزازی شمشیر کیسے ملی تھی؟" میجر ارتضی نے کانوں کی لو کو ہاتھ لگایا۔

"ہاہاہاہاہا۔۔۔" میجر بلال گردن پیچھے گرا کر ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

"اف۔۔۔ارتضی کی تمنا۔" آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے وہ پھر ہنس دیے۔

"میجر صاحب کی تمنا؟" دانیال ساقی باربی کیو کھاتے ہوئے متوجہ ہوئے۔

"تمناڈپ کی بات کر رہے ہیں آپ کے میجر صاحب۔" میجر بلال کو ہنسی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ماضی ان کی یادوں کی سکرین پر بالکل شفاف نظر آ رہا تھا۔

"سر ہمیں بھی بتائیں ناں۔" کیپٹن خاور تجسس لیے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"یہ کیا بتائے گا۔ سوارڈ آف آنر ملی ہے۔ کہاں تمنا جی کی باتیں بتائے گا۔" میجر بلال بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو قابو کر رہے تھے۔

"نہیں، بتایئے ناں سر۔" کیپٹن خاور میجر ارتضی سے مخاطب تھے جو ہتھیلی پر گال رکھے میجر بلال کو گھور رہے تھے۔

"اسے تمناڈپ میں کوئی ہزار دفعہ سزا ملی ہے۔" میجر بلال کہاں باز رہنے والے تھے۔

"سچ؟" یونٹ کے باقی جوانوں کی طرح کیپٹن خاور کے لیے بھی یہ بات ناقابل یقین تھی کیونکہ وہ اس فیلڈ میں میجر ارتضی کو پرفیکٹ سمجھتے تھے۔

"ہاں یار۔ اور اتنی دفعہ ملی ہے کہ تمناڈپ میں ڈپ ہو کر تیری تمنا، میری تمنا، ہائے تمنا ہائے تمنا کہہ کہہ کر میری زبان پر ہر وقت تمنا تمنا رہتا تھا۔ گھر جا کر جب میں دادی ماں کو سلام کرتا تھا تو السلام علیکم دادی ماں کی جگہ السلام علیکم تمنا نکلتا تھا اور بس پھر کیا دادی ماں کی چپل ہوتی تھی اور آپ کے میجر صاحب۔" کانوں کی لو کو چھوتے ہوئے مرمرا کے سمندر کے بھنور گہرے ہوئے تھے۔

"ہاہاہاہاہا۔" میجر بلال پیٹ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ جبکہ باقی نوجوان بھی بے یقینی سے ہنسنے لگے۔

"ایک دفعہ ارتضی کو تمناڈپ میں سزا ملی۔ اس نے کئی دفعہ تمناڈپ کا نعرہ لگایا اس گدلے پانی میں سے ابھگت کر جب باہر نکلا تو سر نے پوچھا ہاں بھئی جواں! مزا آیا؟ تو اس نے یس سر کی جگہ یس تمنا کہہ دیا۔ سر نے اسے پھر تمناڈپ میں ڈال دیا کہ لو اب اچھی طرح سے تمنا جی کے مزے۔" پیٹ پکڑ کر میجر بلال نیچے

زمین پر بیٹھ گئے۔ ہنس ہنس کر گالوں میں درد ہونے لگا تھا۔ میجر بلال کی بات پر سب نے خوب قہقہے لگائے جبکہ ڈمپلاز والا وہ اسٹرانگ مین سب کو خفگی سے دیکھتا رہا۔

''خود کو تو بیلٹ تک نہیں لگانی آتی تھی۔''میجر ارتضی نے بھی ان کے پول کھولنے کی ٹھان لی تھی۔

''ابے یار۔ہاتھ جوڑتا ہوں تیرے آگے۔غلطی ہو گئی معف کردے۔'' میجر بلال جانتے تھے کہ میجر ارتضی سب کچھ کھول کر سامنے رکھ دیں گے۔

''واہ،واہ۔کیا کہنے آپ کے۔''میجر ارتضی کرسی چھوڑ کر میجر بلال کے پاس ہی نیچے آ کر بیٹھ گئے۔

''خود پر بات آئی تو جناب ہاتھ جوڑنے پر آگئے۔ہاں۔''میجر ارتضی نے ان کی گردن دبوچ کر زور سے دبائی۔

''اچھے بھائی نہیں ہو میرے۔'' میجر بلال نے گردن چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔

''ناں۔ میں اچھا نہیں ہوں،اچھے تو صرف میرے بڑے بھائی میجر بلال احمد صاحب ہیں۔''میجر ارتضی نے مزید زور ڈالا، جس سے میجر بلال کراہ کر رہ گئے۔

''چلیں سر، چھوڑیں،ادھر آئیں کوئی گانا ہی سنادیں۔'' کیپٹن عمار کین اٹھا لائے تھے بجانے کے لیے جسے پہلے سیکنڈ لیفٹیننٹ دانیال بجا رہے تھے۔

''چلو چھوڑ دیا۔ کیا یاد کرو گے۔''میجر ارتضی نے ان کو چھوڑتے ہوئے شاہانہ انداز اپنایا۔کھڑے ہو کر انہوں نے میجر بلال کی جانب ہاتھ بڑھایا جسے تھام کر وہ کھڑے ہو گئے۔

''چلو،جواد احمد کا ایک گانا سناتا ہوں۔اور یہ گانا میری یونٹ کے تمام جوانوں کی دوستی کے نام۔''

میجر ارتضی نے گلہ صاف کیا۔

رہے ناں رہے
یہ جیون کبھی
بنی رہے یہ دوستی

سب تالیاں بجانے لگے۔

ہے تیری قسم
او یار امیرے
جدا ہم نہ
ہوں گے کبھی

میجر بلال نے میجر ارتضی کے کندھے دایاں بازو رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے چٹکی بجانے لگے۔

ہمیشہ رہے تو ساتھی میرا
یہ بندھن رہے یوں سدا
یہ طاقت تیری

یہ قوت تیری
بڑھے یہ میری ہے دعا

کیپٹن عمار نہایت عمدگی سے کین بجا رہے تھے۔ کچھ جوان آگ کے آلاؤ کے گرد خٹک ڈانس کرنے لگے۔اردو گیت پر خٹک ڈانس کا حسین امتزاج۔

او میرے یار
تو میرا پیار
صدا رہے تو سلامت
تیری میری یہ دوستی
یونہی رہے تاقیامت

سب یک زبان ہو کر میجر ارتضی کے ساتھ گانے لگے۔

دوستی کا جذبہ ان بیابانوں میں پروان چڑھنے لگا۔دوست یار جینے مرنے کی قسمیں کھانے لگے۔رات کی چاندنی دوستی کے جاوداں ہونے کی دعا کرنے لگی۔

مل کے بتائیں جو پل ہم کبھی
فضائیں یہ کھل سی اٹھیں
جواں مردی،ہمت سے ہے تند گی
ہوائیں یہ کہنے لگیں

میجر بلال، میجر ارتضی کو لیکر دائرے میں شامل ہو گئے۔

حسیں یہ سماں
جھومے جہاں
گائیں زمیں آسماں

کیپٹن خاور نے ان سب پر ہاتھ سے خیالی پیسے نچھاور کیے۔

او میرے یار
تو میرا پیار

سدا رہے تو سلامت

تیری میری یہ دوستی

یونہی رہے تا قیامت

وہ کبھی ہاتھ آگے لے جا کر تالی بجاتے تو کبھی کمر کے پیچھے لے جا کر چٹکی بجاتے۔

آسمان نہ رہے

یہ زمین نہ رہے

چاہے مرضی خدا کی ہو

کچھ نہ رہے

پر رہے دوستی اور محبت سدا

دنیا میں صرف پیار زندہ رہے

میجر ارتضی کی آواز مدھم ہوتے ہوئے ختم ہوگئی۔رقص کرتا دائرہ تھم گیا۔سب نے تالیاں بجا کر میجر ارتضی کو داد دی۔ میجر بلال نے ہمیشہ کی طرح فرط جذبات میں آ کر میجر ارتضی کو گلے لگایا۔ایک انجانے احساس کے تحت دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔سب نے ہاتھ اٹھا کر ان کی دوستی کی سلامتی کے دعائیں کیں۔

''آہم، آہم۔مجنوں جی لیلی کو چھوڑ دیں۔'' کیپٹن خاور نے شرارت سے کہتے ہوئے میجر بلال کو میجر ارتضی سے الگ کیا۔ وہ دونوں آنسو صف کرتے ہوئے مسکرا دیے۔

''اف، اتنا جذباتی منظر۔یقین جانیے سر میں نے کبھی ایسے کسی گرل فرینڈ کو اپنے بوائے فرینڈ کے گلے لگتے نہیں دیکھا۔'' کیپٹن عمار کین ایک طرف رکھتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔

''اچھا تو کیا تم لوگوں کی گرل فرینڈز پر نظر رکھے ہوئے ہو۔'' میجر بلال نے آستین اوپر چڑھانے کے انداز میں بازوؤں پر ہاتھ میرے۔

''نہیں ہیر ایہ مطلب نہیں تھا۔'' چوری پکڑی گئی تھی۔

'' تو پھر کیا مطلب تھا؟'' میجر ارتضی کلاس لینے کے موڈ میں آ گئے۔

''سر میرا مطلب یہ تھا کہ۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔''چوری پکڑی جانے پر فوری بہانہ کیوں نہیں سوجھتا۔

''اٹس لاسٹ وارننگ فار یو کیپٹن عمار۔'' میجر ارتضی نے شہادت کی انگلی دکھاتے ہوئے کیپٹن عمار کو وارن کیا۔

''سوری سر۔'' کیپٹن عمار سر جھکا کر کھڑے ہوگئے۔

میجر ارتضی کو غصے میں دیکھ کر سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ میجر بلال بھی سانس روک کر کھڑے ہوگئے۔

''ڈیشنگ بوائے، میں نے لاسٹ وارننگ اس لیے دی ہے کہ آئندہ کین اچھے سے بجانا ورنہ میں تمہیں بجا دوں گا۔'' شرارت بھنوروں سے واضح چھلک رہی تھی۔یہ سن کر سب نے اپنا سانس بحال کیا۔

''یس سر۔'' کیپٹن عمار نے خوش ہوتے ہوئے میجر راضی کو سلوٹ کیا۔

''تجھے کیا ہو گیا ہے؟'' میجر بلال کو سانس روکے کھڑے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔

''آں۔۔۔کچھ نہیں۔'' ہنسی کو چھپاتے ہوئے وہ باربی کیو کی جانب آ گئے۔ میجر ارتضی بھی ان کی جانب لپکے۔جبکہ کیپٹن عمار لوگ آپس میں خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے اور باربی کیو کے بننے کا انتظا کرنے لگے۔

(________________)

ٹریفلگر اسکوائر سے لیکر ہسپتال تک کا وہ سفر کسی بھی بڑی تکلیف سے کم نہ تھا۔

کرچیوں پہ ننگے پاؤں چلنے کا احساس کیا ہوتا ہے وہ آسٹن سے بڑھ کر کوئی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جب تک ہسپتال پہنچا تب تک ماریہ کو ایمر جنسی وارڈ میں لے جایا جا چکا تھا۔ریسیپشنسٹ سے پوچھ کر وہ دیوانہ وار ایمر جنسی وارڈ کی جانب بھا گا تھا۔وہ بہت سے لوگوں کو دھکے دے کر گزر رہا تھا۔ہاں اسے یہی لگ رہا تھا۔

آسٹن، لندن کا بہادر انسان۔

آسٹن جو نیلسن کے مجسمے سے بھی زیادہ مضبوط تھا، لمحہ ہی تو لگا تھا اسے ریت کی دیوار کی طرح بیٹھنے میں۔

وہ بھاگتے ہوئے لندن کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔لندن نے اس کے وجود کو توڑا تھا اور وہ اب لندن کے ان اصولوں کو توڑ رہا تھا، جنہوں نے اس سے اس کی ماریہ چھیننے کی کوشش کی تھی۔

وہ ایمر جنسی وارڈ کے قریب پہنچا مگر دروازہ بند ہو چکا تھا۔

تو کیا قدرت اس طرح جسم اور روح کے درمیان آتی ہے؟

تو کیا اس طرح روح اور جسم کا ساتھ چھوٹتا ہے؟

کیا لندن اتنا بے رحم ہو سکتا تھا؟

وہ سکتے کی حالت میں کھڑا تھا۔ بے رحم لندن کی سرزمین پر بنے ہسپتال کے فرش پر۔ جو شاید ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔

اسے اپنے گالوں پر پانی کے پھسلنے کا احساس ہو رہا تھا تو کیا وہ رو رہا تھا؟ ہاں، وہ رو رہا تھا۔لندن کا آسٹن رو رہا تھا۔وہ جو کبھی اپنے لیے نہیں رویا تھا، آج ماریہ کے لیے رو رہا تھا۔نہیں، وہ اپنے لیے ہی رو رہا تھا۔ہاں، وہ اپنے لیے ہی رو رہا تھا۔

لندن نے اسے رلا دیا تھا۔

اس مضبوط اعصاب کے مالک کو لندن کی بے رحمی نے رلا ڈالا تھا۔

اس نے روتے ہوئے خود کو دعا کرتے ہوئے پایا تھا۔ماریہ کی زندگی کے لیے یا شاید اپنی زندگی کے لیے۔

اس کا ماریہ کے ساتھ روح اور جسم کا رشتہ تھا۔روح اور جسم ایک دوسرے کے بغیر مردہ ہی تصور کیے جاتے ہیں۔تو کیا وہ بھی اپنی روح کے بغیر مردہ تصور کیا جائے گا؟

نہیں، قدرت اتنی بے رحم نہیں ہوسکتی۔

قدرت واقعی اتنی بے رحم نہیں ہوسکتی۔

ہسپتال کی سفیدی میں ڈوبی دیواریں، سفید پتھر کا فرش، سفید کپڑوں میں ملبوس ڈاکٹرز اور نرسیں۔سفید رنگ اتنا دہشت ناک تو اسے کبھی بھی نہیں لگا تھا۔

وہ ہسپتال کے سفید فرش پر ڈھے گیا تھا۔قیمتی متاع لٹ جائے تو بادشاہ وقت بھی ڈھے جاتے ہیں۔ یہی وقت کی ستم ظریفی ہوتی ہے۔

اس کی نیلی آنکھیں ابھی بھی ایمر جنسی وارڈ کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں جہاں امید کی مدھم کرن ابھی بھی باقی تھی شاید۔

ہ گڑ گڑانے لگا تھا۔ ہسپتال کے سفید فرش پر گرا وہ گڑ گڑا رہا تھا۔ وہ خدا سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ اس نے کبھی یوں گڑ گڑا کر دعا مانگی ہو۔

مگر زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ ہمیں گڑ گڑانا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں رو کر دعا مانگنی ہی پڑتی ہے۔ چاروناچار سہی۔ لیکن یہی زندگی کا اصول ہے۔ زندگی اسی طرح آزماتی ہے۔ کچھ تو اس آزمائش میں پرنم ہو جاتے ہیں اور کچھ شیشہ دل لوگ پتھرا جاتے ہیں۔ آسٹن بھی پتھرا گیا تھا۔ لیکن وہ بہادر تھا اس لیے ٹوٹنے سے پہلے رو دیا تھا۔ اگر وہ نہ روتا تو پتھر کا مجسمہ ڈھے جاتا۔

وقت سیکنڈوں میں پھر منٹوں میں گزرنے لگا۔ اس نے وقت کو گھنٹوں میں گزرتے بھی دیکھا تھا۔

کاش اس وقت کوئی آسٹن سے پوچھتا کہ تکلیف کی انتہا کیا ہوتی ہے؟ تو وہ بتاتا کہ اسٹریچر پر زندگی اور موت کی کشمکش میں لیٹے ہوئے کسی اپنے بہت ہی پیارے کو دیکھنا ہی تکلیف کی انتہا ہے۔

(——————)

ماریہ کو ہوش نہیں آ رہا تھا لیکن اس نے دعا مانگنا نہیں چھوڑی تھی۔ ایک جان لیوا انتظار کے بعد ایمرجنسی وارڈ کا دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر چہرے سے ماسک ہٹاتے اس کے قریب آیا۔ وہ ابھی سر جھکائے، ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں بھینچے سسک سسک کر دعا مانگ رہا تھا۔

اپنے کندھے پر مہربان ہاتھ کا وزن محسوس ہونے سے اس نے سر دھیرے سے اوپر اٹھایا۔ ڈکٹر پر نظر پڑتے ہی وہ سرعت سے کھڑا ہوا۔

وہ ڈاکٹر کے چہرے کو کھوجنے لگا جہاں پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ڈکٹر نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور ایک جاندار مسکراہٹ سے زندگی کی نوید سنائی۔ اس نے جھک کر ڈکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ اسے اس وقت یہی طریقہ سوجھا تھا۔

دعائیں تڑپ سے مانگی جائیں تو قبول ہو ہی جاتی ہیں۔

غم کے آنسوؤں کو خوشی کے آنسوؤں نے مات دے دی تھی۔ ڈکٹر رابرٹ نے اسے کچھ ہدایات دینے کے لیے اپنے ساتھ لے لیا۔

(——————)

ڈاکٹر سے ملاقات کے دوران ماریہ کو کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ آسٹن ڈاکٹر سے ملنے کے بعد برق سی تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے تک پہنچا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے وہ کچھ لمحوں کے لیے رکا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے ہینڈل کو گھمایا اور کلک کی آواز سے لک کھل گیا۔

سامنے بیڈ پر لندن کی معصوم پری بےسدھ سی لیٹی تھی۔ جگہ جگہ پر بینڈیج کی گئی تھی۔ جسم کا زیادہ حصہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ آسٹن کو وہ ایسے پڑی بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ اسے تو ماریہ ٹریفلگر اسکوائر کے کبوتروں کو پاپ کارن ڈالتے اچھی لگتی تھی۔ لندن برج پر خوشی سے اچھلتی اچھی لگتی تھی۔ میوزیم میں کی گئی پینٹنگز کی نمائش کو بغور دیکھتے ہوئے اچھی لگتی تھی۔ مگر اس حالت میں تو بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔

وہ بیڈ کے قریب آ گیا۔ وستی کا شفقت بھرا ہاتھ اس نے ماریہ کی پیشانی پر رکھا جس کے دائیں جانب کونے میں بینڈیج لگی ہوئی تھی۔

اک شناسا لمس محسوس ہونے پر ماریہ نے اپنی آنکھیں دھیرے سے وا کر دیں۔

سامنے محبت کا مجسمہ چہرے پر پریشانی کے تاثرات لیے بیٹھا تھا۔ آسٹن پر نظر پڑتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے پاگل روتے نہیں۔" کتنا تڑپا تھا وہ اسے یوں روتے ہوئے دیکھ کر۔

"اور ایسے تو بالکل بھی نہیں روتے۔" اس نے آگے بڑھ کر ماریہ کے آنسو صاف کیے جو اسے بالکل پسند نہیں تھے۔

اس کے رونے میں کمی نہیں آئی تھی۔

"اگر میں مر جاتی تو؟" لندن کی وہ بزدل لڑکی شدت سے رونے لگی۔

"ماریہ مر ہی نہیں سکتی۔" کتنا یقین تھا لہجے میں۔

"کیوں؟" رونا بھول کر وہ اس کے یقین پر حیران ہوئی تھی۔

"کیونکہ آسٹن کی دعائیں ماریہ کو مرنے نہیں دے سکتیں۔" وہ ماریہ کو نہیں بچا سکتا تھا لیکن اس کی دعائیں ماریہ کو کبھی نہیں مرنے نہیں دے سکتی تھیں۔ یہ ہی سنا تھا ماریہ نے اس کے لبوں سے۔

"آسٹن تم بہت اچھے ہو۔" چہرے پر مشکور مسکراہٹ لیے اس نے آسٹن کو دیکھا تھا۔

"ہمم۔ یہ تو ہے۔" ماریہ کہ چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اسے تسلی ہوئی تھی۔

"مجھے تمہارا ہاتھ نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔" تو کیا اسے احساس ہوا تھا۔ وہ چونک گیا۔

"آئندہ کبھی نہ چھوڑنا۔" وہ کتنی ذو معنی باتیں کرنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" آنکھیں موندتے ہوئے اس نے حامی بھری تھی کبھی نہ ہاتھ چھوڑنے کی۔ وہ نیند کی آغوش میں جا رہی تھی۔ ڈکٹر نے اسے پرسکون نیند کیلیے دوائی دی تھی۔ جو شاید اثر کر چکی تھی۔

وہ اس کے سرہانے بیٹھا تھا اور اس کے سر میں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔

"کاش ماریہ تم کبھی بھی میرا ہاتھ نہ چھوڑو۔" اس کے پرسکون چہرے کو دیکھتے ہوئے آسٹن کے دل سے دعا نکلی تھی۔

لیکن ساری دعائیں کہاں قبول ہوتی ہیں بھلا۔

(——————)

ماریہ کے زخمی ہونے کی وجہ سے انہوں نے پاکستان جانے کے لیے سیٹس لیٹ کروالی تھیں۔ ماریہ اپنے اچھے دوستوں کہ وجہ سے بہت جلدی ری کور کر رہی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زخم بھر ہی جاتے ہیں۔

ماریہ کی پیکنگ ٹالی نے کی تھی۔ اور اس کے شاپنگ بھی ان سب نے مل کر کی تھی۔ پاکستان جانے کا جو اسے جوش چڑھا تھا وہ ماند پڑ گیا تھا۔ اس کی دلچسپی اس حادثے کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ خاموش ماریہ اور خاموش ہو چکی تھی۔

(——————)

روانگی کا دن آن پہنچا تھا۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ لیکن لندن سے جدائی کا غم ان سب کو افسردہ بھی کر رہا تھا۔ جیسے جیسے پرواز کا وقت قریب آ رہا تھا، ماریہ کے دل کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ دل کا یوں دھڑکنا کس لیے تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ ایک گھنٹہ پہلے ایئر پورٹ پر پہنچ چکے تھے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اسپیکر ز سے ایک شائستہ لہجے میں اعلان گونجا جس کے سنتے ہی تمام مسافروں نے جہاز میں جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ لگیج کو دھکیلتے ہوئے وہ سب نئی امنگیں لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ کوئی لندن سے ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا تو کوئی صرف وقتی قیام کے لیے۔

جہاز نے اڑان بھری اور ماریہ کا لندن اس کے قدموں تلے آ گیا جیسے وہ آئی تھی کچھ دن پہلے لندن کے قدموں تلے۔ لیکن وہ روندنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ تو اڑنے والوں میں سے تھی۔ لندن کی فضاؤں کے سنگ اڑنے والوں میں سے۔

(——————)

فضاؤں کو چیرتے ہوئے جہاز نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔

یہاں انہیں دو دن کا قیام کرنا تھا۔ائیرپورٹ سے باہر قدم رکھتے ہوئے سب کے دل کی حالت بدلی تھی۔ماریہ کا تیزی سے دھڑکتا دل یکدم پرسکون ہو چکا تھا۔اس زمین سے اس کا جیسے برسوں سے رشتہ ہو۔ جیسے اس کا خمیر اسی مٹی سے اٹھا ہو۔اور برسوں بعد وہ لوٹ آئی ہو اور دل کو قرار آ گیا ہو۔

کچھ ایسی ہی حالت آسٹن کی بھی تھی لیکن اس کی بے چینی کم ہونے کی بجائے بڑھ رہی تھی۔

جبکہ ان کے برعکس ٹالی،آرنلڈ اور چارلس بہت خوش تھے۔انہوں نے جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر کا وقت بہت قریب تھا۔

انہوں نے قریبی ہوٹل جانے کے لیے دو ٹیکسیاں کرایے پر لیں۔ایک ٹیکسی میں فرنٹ سیٹ پر آسٹن براجمان تھا جبکہ پچھلی سیٹ پر ٹالی اور ماریہ تھیں۔دوسری ٹیکسی میں چارلس اور آرنلڈ تھے۔

آسٹن لوگوں کی ٹیکسی آگے تھی۔ ٹیکسی کے سڑک پر بھاگنے سے منظر تیزی سے بدل رہے تھے۔ماریہ اسلام آباد کی صاف ہوا کو اپنے نتھنوں کے ذریعے اپنی روح کے اندر تک اتارنے لگی۔وہ ان ہواؤں کو پہلے بھی کہیں محسوس کر چکی تھی لیکن کہاں؟ یہ ماریہ بھی نہیں جانتی تھی۔

بلاشبہ وہ لندن سے بھی زیادہ خوبصورت شہر تھا۔

قدرت ہر منظر پر براجمان نظر آ رہی تھی۔اونچے اونچے پہاڑوں کی اوٹ سے کالے بادل بلند ہو رہے تھے۔روئی کے گالوں کی طرح ہلکے پھلکے ایک سمت سے دوسری سمت جا رہے تھے۔گیلی گیلی سڑکیں بارش ہونے کا پیغام دے رہی تھیں۔

قدرت کا ایک مکمل شاہکار۔

اسلام آباد۔

دنیا کے خوبصورت شہروں میں سے ایک شہر۔

ٹیکسی فراٹے بھرتے آگے بڑھ رہی تھی۔ بہت سے منظر پیچھے رہ چکے تھے۔اب نئے منظر ان کے منتظر تھے۔

(　　　　——————　)

محرمِ زیست! کوئی بات ہے یہ
دور ہوتے نہیں خیالوں سے
ہر گھڑی آس پاس رہتے ہو
آنکھ لگتی ہے سوچتے تم کو
آنکھ کُھلتے ہی یاد آتے ہو
خواب بھی تم سجائے رکھتے ہو
ساری دنیا بُھلائے رکھتے ہو
یاد کر کے تمہاری باتوں کو
بات بے بات مسکراتا ہوں
خود سے لگتے نہیں جُدا مجھ کو
اپنے اندر رہی تم کو پاتا ہوں
تم مری سوچ میں خیالوں میں
میرے جینے کے سب حوالوں میں

میری تاریکیوں، اُجالوں میں
میری مستی بھری دھمالوں میں
میری ہر اک دُعا میں رہتے ہو
ابتدا انتہا میں رہتے ہو
خامشی مین صدا میں رہتے ہو
تم مری ہر ادا مین رہتے ہو
محرمِ زیست کوئی بات ہے یہ
جانے کیسے ہے یہ کیا تم نے
مجھ کو میرا پتا دیا تم نے
تھک گیا تھا تلاش میں اپنی
مجھ سے مجھ کو ملا دیا تم نے
کچھ بھی اپنا نہیں رہا باقی
تم ہی تم بھر گئے ہو اب مجھ میں
محرمِ زیست کوئی بات ہے یہ

سورج مغرب کی جانب بڑھ رہا تھا۔دور نیلا آسمان سرخی مائل ہو رہا تھا۔وہ بالکونی میں کھڑی پرندوں کو اپنے گھروں کی جانب لوٹتا دیکھ رہی تھی۔لیکن حقیقت میں وہ کسی اور کے آنے کی منتظر تھی۔وہ جو فرض کی پکار پر چلا گیا تھا جس کی طرف سے دل ہر وقت انجانے خوف سے دھڑکتا رہتا تھا۔ جسے گئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے۔شاید ایک ماہ سے اوپر کا عرصہ ہو چکا تھا اور یہ عرصہ وقت کی لمبی مسافت پر پھیل چکا تھا۔

انتظار کی گھڑیاں تو ویسے بھی صدیوں پر محیط ہوتی ہیں۔لیکن اگر یہی انتظار محرم کے لوٹ کر آنے کا ہو تو یہ صدیاں کئی ہندسوں سے ضرب کھا کر گنتی کے دائرے سے نکل جاتی ہیں۔

طویل ہوتی جاتی ہیں۔

طویل سے طویل تر۔

کبھی نہ ختم ہونے والے انتظار کے کٹھن سفر پر چلنے والوں کو چلنا ہی پڑتا ہے۔

ہجر کی آگ میں جلنے والوں کو جلنا ہی پڑتا ہے۔

شام کی اداسی اس کی روح میں اترنے لگی تھی۔

ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے وہ بالکونی سے کیچن میں آ گئی جہاں اسے رات کے لیے کھانا تیار کرنا تھا۔

(　　　　——————　)

ڈور بیل مسلسل بج رہی تھی۔وہ کیچن میں رات کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔ آنچ دھیمی کر کے وہ دروازہ کھولنے آ گئی۔

لیکن کوئی گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا تھا شاید۔اس لیے اسے ابرش کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"آ گئی ہوں بابا۔کیا ہو گیا ہے؟" تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ بھاگنے کے انداز میں چل رہی تھی۔

"کون ہے بھئی؟" مگر جواب میں صرف گھنٹی بجتی ہی سنائی دے رہی تھی۔غصے سے اس کے عارض سرخ ہونے لگے۔

اس نے جھنجلاتے ہوئے دروازہ کھولا لیکن دروازہ کھلتے ہی سارغصہ کہیں غائب ہو گیا تھا۔آنکھیں یقین کرنے سے انکاری ہوچکی تھیں۔سامنے وہ کھڑا تھا جس کے ملن کی اس نے صبح دعامانگی تھی۔

کیا دعائیں اتنی جلدی بھی قبول ہوجاتی ہیں۔

"السلام علیکم۔" لیکن ابرش کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔

"کب سے بیل بجارہاہوں۔کہاں تھی؟" وہ ہنوز اسی حالت میں کھڑی تھی۔

"ابرش۔" اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجا کرانہوں نے اسے واپس ہوش کی دنیامیں کھینچا۔

"جی۔" سکتہ ٹوٹا تھا۔

"کدھر پہنچ گئی ہو؟" شوخ سی مسکراہٹ لبوں پرپھیلی تھی۔

کتنے دن ہو چکے تھے آنکھوں کو وہ مسکراہٹ دیکھے ہوئے۔کانوں کو وہ آواز سنے ہوئے۔

"آپ۔۔؟" وہ ابھی بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔

"جی میں۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے ہال میں لے آئے کیونکہ ابرش تو وہاں مجسمہ بنے ساری رات کھڑی رہ سکتی تھی اور یہ کام میجر بلال کے بس سے فی الحال باہر تھا۔

"کہاں تھے اتنے دن؟" چاہنے والوں کی زبان پر شکوے آ ہی جاتے ہیں۔

"اپنی دوسری بیوی کے پاس۔" فین آن کرتے ہوئے انہوں نے اس کے تپتے ہوئے چہرے پرنظر ڈالی۔۔جواب میں انہیں ابرش کی جانب سے کشن ملا تھا جو اس نے قریبی صوفے سے اٹھا کر میجر بلال کو زور سے دے مارا تھا۔

"بھئی کیسی بیوی ہو؟ پانی تک نہیں پوچھا۔" ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے انہوں نے خشک گلے سے تھوک نگلا تھا۔

"کیوں آپ کی دوسری بیوی نے آپ کو پانی پلا کر نہیں بھیجا تھا؟" وہ سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ سے پانی لینے کیلئے پلٹی۔جس میں برف کے ٹکڑے ابھی بھی تیر رہے تھے۔

"نہیں۔اس نے کہا تھا کہ اپنی پہلی بیوی کے گھر سے پی لینا۔" گھڑی کلائی سے اتار کرانہوں نے آستین کہنیوں تک موڑے۔

"یہ لیں پانی۔" گلاس انہیں تھما کر وہ ان کے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔

"ارے،کیا کر رہی ہو؟" گلاس لبوں سے ہٹاتے ہوئے انہوں نے اسے منع کیا تھا۔

"شوز اتار رہی ہوں۔" ان کا ہاتھ پیچھے ہٹا کر اس نے اپنا کام جاری رکھا۔

"چھوڑو، میں خود اتار لوں گا۔"انہیں ابرش اپنے قدموں کے قریب بیٹھی بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔"شوز اتار کر وہ ان کی چپل لینے چلی گئی۔چپل لا کر اسے نے ان کے پیروں کے قریب رکھ دی۔سا کس اتارتے ہوئے وہ کچھ پریشان ہوئی تھی۔کیونکہ بائیں پاؤں کے انگوٹھے پر ناخن کے قریب زخم بگڑی حالت میں نظر آرہا تھا۔

"اف۔اتنا سا بھی خیال نہیں رکھ سکتے آپ اپنا۔"وہ زخم کو ٹٹولنے لگی۔

"آپ ہیں ناں ہمارا خیال رکھنے کے لیے۔" وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے جبکہ نگاہیں ابرش کے فکر مند ہوتے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ٹھہریں۔میں بینڈ تج لگا دیتی ہوں۔"شوز اور سا کس لیکر وہ چلی گئی۔

"پاگل ہے بس۔اتنے سے زخم کے لیے اتنا پریشان ہو رہی ہے۔" مسکراہٹ اٹھکھیلیں کرتے ہوئے پھر لبوں پر آ کر براجمان ہوگئی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس آگئی تھی۔اس کے ہاتھ میں ایک پانی کا بڑا سا برتن تھا۔پانی کے برتن کو زمین پر رکھ کر اس نے بینڈ تج،اسپرٹ اور ٹاول کو میجر بلال کے قریب ہی صوفے پر رکھ دیا۔

"پاؤں ڈالیں اس میں۔" کسی بریگیڈئیر کی طرح اس نے حکم چلایا تھا۔

"او کے سر۔" میجر بلال تھوڑا سا آگے کی جانب ہوئے اور پاؤں برتن میں ڈال دیے۔ابرش مساج کرنے کے سے انداز میں ان کے پاؤں دھونے لگی۔

"کیا یہ میری عبادتوں اور ریاضتوں کا صلہ ہے۔" اس کے شفاف چہرے پرنظریں جمائے انہوں نے دل میں سوچا تھا۔

"اب نکالیں۔" ان کے پاؤں نکالنے کے بعد اس نے پانی کا برتن ایک طرف کیا۔صوفے سے ٹاول اٹھا کر ان کا دایاں پاؤں اچھی طرح سے صاف کیا۔اس کے بعد اس نے ان کا بایاں پاؤں اٹھا کر احتیاط سے اپنی گود میں رکھا۔زخم والی جگہ کو احتیاط سے صاف کیا۔کاٹن کے ٹکڑے پر اسپرٹ لگا کر اس نے زخم پر لگایا۔اچھی طرح اسپرٹ لگانے کے بعد اس نے نرمی سے انگوٹھے کے گرد بینڈ تج لپیٹ دیا۔اور پھر سب چیزوں کو احتیاط سے اٹھاتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر رکھنے کے لیے چلی گئی۔

"میں ماما کو آپ کے آنے کی اطلاع دے آئی ہوں۔" واپسی پر وہ ان کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"شکریہ۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے گردن اس کی جانب گھمائی۔

"لیکن میں آپ سے ابھی بھی ناراض ہوں۔" نروٹھے پن سے کہتے ہوئے وہ میجر بلال کی آنکھوں کے راستے سے دل میں اتری تھی۔

"ابرش۔" انہوں نے اسے ہولے سے پکارا۔

وہ جب بھی اسے اس طرح پکارتے تھے اس کے دل کی زمین زیروزبر ہونے لگتی۔

"تمہیں کچھ محسوس ہو رہا ہے؟" چہرہ اس کے قریب لاتے ہوئے انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"کیا؟" تیز ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے بھی میجر بلال کی آنکھوں میں غوطہ زنی کی تھی۔

"ہنڈیا جلنے کی بو۔" سنجیدگی چہرے پر سجائے انہوں نے اس سے تائید چاہی تھی۔

آنکھوں کا سحر ٹوٹا۔

"او میرے خدایا۔" وہ تیزی سے کیچن کی جانب لپکی،جہاں وہ ہنڈیا آگ پر رکھ کر بھول آئی تھی۔

"ہاہاہاہاہا۔۔" ایک شرارت سے بھرپور قہقہے نے اس کا پیچھا کیا۔

کاش یہ قہقہے ساری عمر اس کا پیچھا کرتے رہیں۔

(__________)

رات کو کھانا کھانے کے بعد میجر بلال قریبی مسجد میں عشاء کی نماز ادا کرنے چلے گئے۔واپسی پر وہ کمرے میں آئے لیکن ابرش کمرے میں موجود نہیں تھی۔انہوں نے واش روم کے دروزازے کی نب کو گھمایا۔دروازہ کھلا ہوا تھا۔ابرش واش روم میں بھی نہیں تھی۔انہوں نے ٹیرس پر جھانکا لیکن اسے وہاں بھی نہ پا کر وہ اپنی ماما کے کمرے میں آگئے۔ان کے کمرے کی لائٹ بند تھی۔جسکا صاف مطلب تھا کہ وہ سو چکی تھیں۔

"کہاں چلی گئی؟" وہ کیچن کی جانب آئے مگر کیچن کا دروازہ بھی بند تھا۔ہال میں سرسری نظر دوڑا کر وہ اوپر چھت پر آگئے۔سامنے وہ کھلے آسمان تلے رکھے جھولے پر براجمان تاروں بھرے آسمان میں مگن تھی۔اسے دیکھ کر میجر بلال نے سکون کا سانس لیا۔

”آہم، آہم۔“انہوں نے اسے اپنے مخصوص انداز میں متوجہ کیا۔وہ شانوں پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”کیا دیکھاجا رہا ہے بھئی؟“ اس کے قریب ہی جھولے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے پاؤں کی مدد سے جھولے کو حرکت دی۔

”شائننگ اسٹارز۔“بالوں کی لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے وہ مسکرائی۔

”برائٹ مون کے ہوتے ہوئے بھی۔“ دنیا کی خوبصورت مسکراہٹ میجر بلال کے لبوں پر رینگی تھی۔

مسکراتے ہوئے وہ دوبارہ تاروں کی جانب متوجہ ہوگئی۔

”ان شائننگ اسٹارز کو یوں اتنا محو ہو کر دیکھنے کی وجہ؟“برائٹ مون کو اپنی موجودگی کا نظر انداز کیا جانا تھوڑا سا ناگوار گزرا تھا۔

”میں جب بہت چھوٹی ہوتی تھی تب میں نانو سے اکثر ایک سوال کیا کرتی تھی۔“ وہ لمحہ بھر کو رکی۔

”کہ مرنے کے بعدلوگ کہاں چلے جاتے ہیں؟“وہ اپنے معصوم سے سوال پر مسکرائی تھی۔

”تو نانو ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ مرنے کے بعدلوگ اوپر آسمان پر تارا بن کر چمکنے لگتے ہیں۔“ وہ محو سی بول رہی تھی۔

’میں جب بہت چھوٹی ہوتی تھی تب میں نانو سے اکثر ایک سوال کیا کرتی تھی۔“ وہ لمحہ بھر کو رکی۔

”کہ مرنے کے بعدلوگ کہاں چلے جاتے ہیں؟“وہ اپنے معصوم سے سوال پر مسکرائی تھی۔

”تو نانو ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ مرنے کے بعدلوگ اوپر آسمان پر تارا بن کر چمکنے لگتے ہیں۔‘ اس کی نظریں ابھی بھی تاروں پر تھیں جو تعداد میں اتنے تھے کہ اس کہ ایک نظر میں نہیں سما رہے تھے۔جانے کتنے پیارے لوگ تارا بن گئے تھے۔میجر بلال اسے بولنے دے رہے تھے۔

”میں یہ دیکھ رہی تھی کہ اس چھت سے کونسا تارا واضح نظر آتا ہے۔جب میں بھی تارا بن جاؤں گی تو آپ بھی یہاں بیٹھ کر دیکھیے گا سب سے واضح نظر آنے والا تارا آپ کی ابرش ہوگی۔“ وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔

”ابرش۔“انہوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔وہ ان کے چہرے پر غصے اور رنج کے ملے جلے تاثرات دیکھ سکتی تھی۔

”ہاہاہاہا۔۔مذاق کر رہی ہوں۔“ اس نے اپنا سر میجر بلال کے کندھے سے ٹکا دیا۔

”آئندہ ایسا مذاق نہ کرنا۔“ خفگی سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کی کلائی تھامی تھی جس میں اس نے سرخ رنگ کی چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔

”بلال احمد دنیا کا ہر مذاق برداشت کر سکتا ہے۔مگر یہ والا تو ہرگز نہیں۔“ وہ چوڑیوں کو ایک ایک کر کے جدا کرنے لگے۔

”اچھا بابا۔۔نہیں کروں گی آئندہ ایسا مذاق۔“ہوا چل رہی تھی۔ابرش کے گھنے بال اڑ کر میجر بلال کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔

”گڈ گرل۔“ چوڑیاں جدا کرتے ہاتھ نے اس کے ناک کو چٹکی میں لیتے ہوئے نرمی سے کھینچا تھا۔

”آپ کے پاؤں کا زخم ٹھیک ہوگیا؟“ اس نے چہرے پر آئے بال ہٹائے۔

”میری پہلی بیوی نے اتنی محبت سے مرہم لگایا تھا،ٹھیک تو ہونا ہی تھا۔“ الٹا جواب دینے پر ابرش کی طرف سے انہیں کندھے پر مکا ملا تھا۔

”اوئی۔“ مکا بہت زور سے لگا تھا۔

”اتنا ظلم تو ہم پر بریگیڈئر صاحب نہیں کرتے جتنا تم کرتی ہو۔“ وہ ابھی بھی کندھا سہلا رہے تھے۔

”تو آپ ان کے سامنے اوٹ پٹا نگ باتیں بھی نہیں کرتے ہوں گے۔“ وہ بالوں کو گول گول گھماتے ہوئے جوڑے کی شکل دینے لگی۔چوڑیوں کی کھنک فضا میں بھر کر منظر کو سحرزدہ کر رہی تھی۔

”ہاااااا۔۔۔تو میں کیا اوٹ پٹا نگ باتیں کرتا ہوں؟“ ٹھوڑی پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے وہ بے یقین نظر آئے تھے۔

”نہیں جناب۔بالکل بھی نہیں۔“ اس نے سر دائیں بائیں ہلایا۔

”تو یہ مرہم میری پہلی بیوی نہیں ہی لگا یا ہے۔اس میں اوٹ پٹا نگ والی کیا بات ہوگئی؟“انہوں نے شرارت سے اس کے جوڑے کو دوبارہ کھول دیا۔

”ایسی باتیں صرف اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ہی کیا کریں۔“ وہ خفا سی اٹھنے لگی لیکن میجر بلال نے زمین پر پاؤں ٹکا جھولے کو تیز کر دیا۔

”کیوں، پہلی کے ساتھ نہیں کرسکتا؟“لہجہ شرارت سے بھرپور تھا۔

”ابرش دنیا کا ہر مذاق برداشت کر سکتی ہے لیکن یہ پہلی دوسری بیوی والا تو ہرگز نہیں۔“ اس نے ان کے انداز میں ہی کہا۔

”ہاہاہاہا۔۔۔۔ٹھیک ہے۔“ انہوں نے جھولے کی رفتار بڑھا دی۔ جھولا لرزنے لگا۔

”روکیں اسے۔“ اس نے جھولے کے بازو کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”پہلے اپنا بیان واپس لو۔“ وہ ہنوز اسی طرح سے بیٹھے تھے۔

”نہیں لوں گی۔“ حتمی فیصلہ سنایا گیا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ساری رات جھولتی رہو میرے ساتھ۔“ شانِ بے نیازی سے کہتے وہ شرارت سے مسکرا دیے۔

وہ مسکراہٹ چھپائے،اس سے بے نیاز بیٹھے رہے۔جھولے کی رفتار میں ذرا کمی نہیں آئی تھی۔

آخر ابرش کو ہی ہار ماننا پڑی۔

”اوکے۔۔۔کرلیا کریں ایسی اوٹ پٹا نگ باتیں۔“وہ میجر بلال کی ضد سے اچھی طرح واقف تھی۔

میجر بلال نے دونوں پاؤں زمین پر جماتے ہوئے جھولے کو روک دیا۔

”تو پہلے ہی پیار سے مان جایا کرو۔“ شائننگ اسٹارز میں برائٹ مون کی مسکراہٹ چمکی تھی جس نے تاروں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔

”آپ کی صحبت کا اثر ہے بس۔“اب کی بار وہ بھی مسکرائی تھی۔

”ہاہاہاہاہا۔۔۔۔“وہ گردن پیچھے گرا کر ہنس دیے۔

”چلو۔۔رات بہت ہوگئی ہے۔صبح مجھے جلدی جانا بھی ہے۔“ کھڑے ہوتے ہوئے انہوں نے اپنا ہاتھ ابرش کی جانب بڑھایا جسے تھام کر وہ کھڑی ہوگئی۔

دو پیلد کرنے والے ہاتھ تھام کر چل دیے تھے۔دور آکاش پر چمکتے تارے اس جوڑے کی خوشیوں کے لیے دعا مانگنے لگے تھے۔لیکن تاروں کی بھی ساری دعائیں کہاں قبول ہوتی ہیں بھلا۔

(________________)

رات بھر پرسکون نیند لینے کے بعد وہ دس بجے کے قریب اٹھ گئی تھی۔لمبے بالوں کو کیچر میں مقید کرتے ہوئے وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی جو کہ ہمیشہ سے اس کی عادت تھی۔کھڑکی کا پٹ وا ہوتے ہی اسلام آباد کی خنکی میں ڈوبی ہوائیں اسے صبح بخیر کہنے آئی تھیں۔ لمبا سانس لیتے ہوئے اس نے اس خوبصورت شہر کی صحت افزا ہوا کو اپنے اندر اتارا تھا۔

اس نے ایک نظر ٹالی پر ڈالی جو کہ ابھی بھی سو رہی تھی۔ٹالی سے پھسلتی ہوئی نگاہ سامنے منظر سے ٹکرائی۔سامنے سبز قطعوں میں گھری ہوئی سفیدی میں ڈوبی ہوئی فیصل مسجد نظر آرہی تھی۔

اور اس کے پیچھے اطراف میں بلند سبز پہاڑ ایک دلکش سماں پیش کر رہے تھے۔بادل ابھی بھی آسمان پر تیر رہے تھے۔خوبصورتی کے اس عظیم شاہکار کو دیکھتے ہوئے وہ لندن کو لمحہ بھر بھولی تھی۔

کچھ دیر باہر کا نظارہ کرنے کے بعد وہ کھڑکی بند کر کے واش روم میں چلی گئی۔آسٹن،آرنلڈ اور چارلس دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔

نئے ملک کی نئی صبح ان کی منتظر تھی مگر وہ اس بات سے بے خبر ابھی بھی نیند کی بانہوں کے حصار میں تھے۔

ماریہ جینز کے اوپر گھٹنوں تک آتے کوٹ کو پہن کر نیچے ہوٹل کے ہال میں چائے پینے کی غرض سے آ گئی۔

ہال ہیٹرز کی وجہ سے گرم تھا لیکن سانسوں کو خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ہال میں لگے ٹیبلز میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئی جو کہ گلاس وال کے ساتھ تھا۔ باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اسے ہارڈ راک کیفے یاد آیا جس کی گلاس وال کے ساتھ وہ اکثر بیٹھا کرتی تھی۔ وہ وہاں پر گلاس وال کے قریب باہر کی جانب رکھے پھولوں کے گملے دیکھا کرتی تھی مگر یہاں ایک لامحدود منظر گلاس وال سے باہر دیکھا جا سکتا تھا۔

بلاشبہ وہ ایک خوبصورت شہر تھا۔

"گڈ مارننگ میم۔" ویٹر کی آواز نے اسے چونکایا۔

"گڈ مارننگ۔" ایک پیاری سی اسمائل کے ساتھ اس نے چائے کا آرڈر کیا۔ ویٹر آرڈر لیکر چلا گیا جبکہ وہ دوبارہ اس منظر میں کھو گئی۔

(————————)

چائے پینے کے بعد وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ ٹالی تب تک اٹھ چکی تھی۔

"کہاں گئی تھی مادام؟" کمبل پرے پھینکتے ہوئے وہ بیڈ سے اتر آئی۔

"میں نیچے چائے پینے گئی تھی۔" گرم کوٹ اتار کر اس نے دیوار پر ایک طرف لگی کھونٹی سے لٹکا دیا۔

"آہاں۔۔۔" آنکھیں ملتے ہوئے وہ مسکرائی تھی۔

"تم سو رہی تھی تو میں نے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" اس نے شکوے سے پہلے صفائی دی تھی۔

"ہمم۔۔۔" چپل پہنتے ہوئے اس نے وال کلاک کو دیکھا جس پر ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔

"جو کر زاٹھ گئے؟" اس نے آسٹن لوگوں کا پوچھا۔

"پتا نہیں۔ شاید ابھی نہیں اٹھے۔ ان کا کمرہ لاکڈ تھا۔" اس نے اپنا موبائل آن کیا جو کل سے بند تھا۔

"میں اٹھاتی ہوں ان کو۔" ٹالی کمر پر ہاتھ رکھ کر باہر چلی گئی۔

"شامت آ گئی ان کی۔" موبائل چارجنگ پر لگاتے ہوئے وہ مسکرائی تھی۔

(————————)

یہ گولیاں کیوں چلائی جاتی ہیں
یہ کتنا شور مچاتی ہیں
صفِ ماتم بچھاتی ہیں
ہنستے ہنستے آنگن اجاڑ دیتی ہیں
کوئی دشمن نہیں ان کا
نہ کوئی دوست ہوتا ہے
کوئی بتائے ان آگ اگلتی مشینوں کو
تم میں سے جو عجب آگ نکلتی ہے
یہ چراغِ زندگی کو گل کرتی ہے

یہ آگ احساس سے عاری ہوتی ہے
جو نہ تیری ہوتی ہے
نہ میری ہوتی ہے
اور جب بچھڑ جاتا ہے
کوئی بہت پیارا اپنا
کتنا کہرام مچتا ہے
کوئی زار اقطار روتا ہے
معصوم بچوں کے سر سے
سایہ چھین لیتی ہیں
دنیا جنہیں یتیم کہتی ہے
ماں کا لختِ جگر دفن ہو جاتا ہے
ایک عورت پاگل سی دکھتی ہے
سفید لبادے میں ملبوس ہوتی ہے
وہ بیوہ کہلاتی ہے
ساتھ جینے مرنے کے وعدے
جب اس بیوہ کو یاد آتے ہیں
کسی کو کیا معلوم کہ دل پر
کتنے نشتر چل جاتے ہیں
سب ٹوٹ جاتا ہے
زمانہ جیسے روٹھ جاتا ہے
سب قصے پرانے ہو جاتے ہیں
مگر ایک سوال ہے
جو سب اٹھاتے ہیں
یہ گولیاں کیوں چلائی جاتی ہیں
یہ کتنا شور مچاتی ہیں
صفِ ماتم بچھاتی ہیں

کاش کہ گولیاں چلانے والے یہ بات سمجھ جائیں کہ جب یہ سینے کے آر پار گزرتی ہیں تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ جب یہ بے گناہ معصوموں کا نشانہ لیتی ہیں تو انسانیت کتنا تڑپتی ہے جب کسی باپ کو مٹی کے حوالے کرتی ہیں تو بچے کتنا بلکتے ہیں۔ جب یہ سہاگ اجاڑتی ہیں تو نئی نویلی دلہن اپنی قسمت کو کس طرح نوچتی ہے۔

جب ماں اپنے لختِ جگر کو خون میں لت پت دیکھتی ہے تو اس کا کلیجہ کیسے پھٹتا ہے۔ جب بوڑھا باپ اپنے جوان بیٹے کے جنازے کو ناتوں کندھوں پر اٹھاتا ہے تو قدم کتنے بھاری ہو جاتے ہیں۔

جب بہنوں کے بھائی تابوتوں میں لپٹے آتے ہیں تو بہنیں کس طرح صبر کرتی ہیں۔

لیکن گولیاں چلانے والے یہ بات کہاں سمجھتے ہیں۔ یہ درندہ صفت لوگ کہاں اس درد کو محسوس کر سکتے ہیں کہ جب کوئی گھر سے بن سنور کر جائے اور واپس کفن میں لپٹا آئے تو دل کیسے پھٹتا ہے۔

جب اپنے جان سے عزیز تر کا سینہ چھلنی دیکھا جائے تو آنکھیں کیسے خون بہاتی ہیں۔

مگر یہ نہیں جانتے۔یہ صرف دہشت پھیلانا جانتے ہیں۔ گلی ہو یا بازار ہوں۔ دفتر ہوں یا اسٹیڈیمز ہوں۔ غریب کی جگی ہو یا امیر کے محل۔ ان کا کام بس زندگی کو ختم کرنا ہوتا ہے۔یہ کہاں سمجھ سکتے ہیں کہ جب کسی پیارے کی آنکھوں کے سامنے تڑپتے ہوئے جان نکلتی ہے تو بے بسی کیسے دم توڑتی ہے۔

یہ گولیاں چلانے والے کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اب ان کو یہی سمجھانے مادرِ وطن کے بیٹے گھروں سے نکلے تھے۔انہیں یہ سمجھانے کہ گولی جب سینے پر لگتی ہے تو روح کیسے کانپتی ہے۔ گھر میں جب بے جان لاش جاتی ہے تو ندگیوں میں صفِ ماتم کیسے بچھتا ہے۔مشین گن جب چلتی ہے تو دہشت کیسے پھیلتی ہے۔خون کی بوندیں جب زمین پر گرتی ہیں تو موت کیسے لینے آتی ہے ۔ہاں اب ان کو یہ سب سمجھانے کا وقت آ گیا تھا۔ ملک بھر میں آپریشن راہِ نجات شروع کر دیا گیا تھا۔گولیاں چلانے والوں کا گولیوں سے تڑپ تڑپ کر مرنے کا وقت آ گیا تھا۔

(__________)

)جاری ہے۔(

حصہ پنجم

میرے وطن کے شیر دل جوانو
کیا تم پہ لکھوں
تمہیں کیسے سراہوں
کیسے اپنے جذبات بتاؤں
کہ تمہاری عظمت کے سامنے
الفاظ سارے چھوٹے ہیں لگتے
کہ تم جرأتوں کے وہ نشاں ہو
ارض پاک کی سرحدوں کے
فولادی ستون اور سائباں ہو
کہ قوم کی امیدِ وفا ہو تم
کہ تمہاری آنکھوں میں روشن
جانثاری کے جگنو چمکتے
بجھ سکے نہ اغیار کی ہوا سے

بہادری کی ایسی کہکشاں ہو

۱۹ جون ۲۰۰۹ کی صبح مادرِ گیتی کے شیر دل بیٹوں نے دشمنوں سے اپنے علاقے واپس لینے کیلیے آپریشن راہ نجات شروع کیا۔جس کا بنیادی مقصد وہاں پر موجود دشمنوں کے بڑے لیڈروں کو ختم کر کے علاقے کو دشمنوں کے چنگل سے آزد کرانا تھا۔اس آپریشن کو شمالی وزیرستان اور پشاور کے علاقوں میں شروع کیا گیا۔

مادِ گیتی کے بہادر جوان اس آپریشن کو کامیاب بنانے کے لیے پہلے سے ہی تیار تھے۔ان کی رگوں میں وطن سے عشق کا لہو دوڑ رہا تھا۔تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس پاک دھرتی کے بیٹے اس کی حفاظت کے لیے سر پر کفن باندھ کر نہ نکلیں۔

ہراول دستے میں کیپٹن عمار اور کیپٹن خاور پاک فورسز کے دیگر جوانوں کے ساتھ آگ اور پانی کی اس جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

کیپٹن عمار کی شادی انہیں دنوں میں طے پائی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنے فرض سے نہیں پھرے تھے۔جانے سے پہلے ان کی والدہ نے انہیں جلد لوٹ کر آنے کو کہا تھا کیونکہ وہ جلد از جلد اپنے بیٹے کو دلہا بنا دیکھنا چاہتی تھیں۔

''امی میں اسی دن لوٹ کر آؤں گا آپ فکر نہ کریں۔آپ مجھے جلد دلہا بنے دیکھیں گی۔ان شاءاللہ۔'' وہ شرارتی سا جون کس دل کے ساتھ اپنی ماں کو حوصلہ دے گیا تھا یہ بات صرف وہی جانتا تھا۔

آپریشن پر جانے سے پہلے ان سجیلے جوانوں نے رب کائنات کے آگے سجدے کیے۔ پھر ان سب نے مل کر آپریشن کی کامیابی اور دھرتی ماں کی حفاظت کے لیے خصوصی دعائیں کیں۔

(__________)

آپریشن کامیابی سے چلتا رہا۔اس آپریشن میں آرمڈ فورسز ،ائیر فورسز اور اسپیشل سروس گروپ نے خود کو وطن کی حفاظت کے لیے پیش کیا۔ کچھ ہی دنوں میں بہترین حکمت عملی کے تحت کی جانے والی کارروائی کے نتیجے میں بہت سے علاقے کو دشمن کے چنگل سے آزد کروا لیا گیا۔

اس مقصد کے لیے دو دستے بنائے گئے۔جن میں سے ایک دستہ کیپٹن عمار کو سونپ دیا گیا اور دوسرا دستہ کیپٹن خاور کی قیادت میں دے دیا گیا۔

شمالی وزیرستان میں دشمنوں کے ٹھکانوں کی صفائی کے دوران پاک فورسز کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے دشمن اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے جبکہ باقی ابھی اپنی بلوں میں موت کے منتظر دبکے بیٹھے تھے۔

اس آپریشن کے دوران بہت سے جوان اپنی دھرتی ماں کی عصمت پر قربان ہو گئے تھے۔ لیکن جانوں کی پرواہ کسے تھی۔وہ تو بس آگے بڑھتے جا رہے تھے دشمنوں کو اپنے بھاری بوٹوں تلے روندتے۔ایک کشش تھی جو ان کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ سب کسی ڈور سے بندھے کھنچتے چلے جا رہے تھے۔

'' کیپٹن عمار آپ کا اکیلے آگے جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' کیپٹن عمار کو اپنے وائرلیس سے کیپٹن خاور کے الفاظ سنائی دیئے۔

''لیکن میں کامیابی کے قریب پہنچ کر اب واپس نہیں جا سکتا۔میری غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ دشمن کے سر پر پہنچ کر میں جان بچانے کے لالچ میں واپس آجاؤں۔میرے ہیرو میجر راتضی نے کہا تھا کہ دشمن کے ساتھ مقابلہ کیے بنا بھاگ جانے سے بہتر ہے کہ آپ دشمن کو روندتے ہوئے امر ہو جائیں۔'' پھولتے ہوئے سانس سے انہوں نے یہ الفاظ وائرلیس کے سپرد کیے۔وہ میجر راتضی کو اپنا ہیرو مانتے تھے۔پاکستان آرمی کا ہر جوان محبِ وطن تھا لیکن جو جذبہ انہوں نے میجر راتضی میں دیکھا تھا وہی انہیں میجر راتضی حدید کا گرویدہ کر گیا تھا۔

''لیکن کیپٹن عمار۔۔۔۔۔'' کیپٹن خاور انہیں منصوبہ بندی کے تحت لڑنے کا کہہ رہے تھے۔

''نہیں کیپٹن خاور ، میں اب منزل کے بہت قریب آ گیا ہوں۔اگر لوٹ گیا تو کبھی فخر سے جی نہیں پاؤں گا۔ ''

گولیوں کی گھن گرج جاری تھی۔

بم سروں پر وقفے وقفے سے پھوٹ رہے تھے۔

"میرے لیے دعا کرنا کہ میر انذرانہ قبول ہوجائے۔اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔اللہ اکبر۔'' یہ آخری الفاظ تھے جو کیپٹن خاور کو سنائی دیئے ے تھے۔اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔

(———————)

کیپٹن عمار بہت آگے نکل آئے تھے۔مورچوں کے قریب پہنچ کر انہوں نے دشمن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا اور دشمن کے کئی ٹھکانے کچھ ہی لمحوں میں نیست و نابود کر دیئے۔

پھر بھی آگے بڑھنے کی چاہ ختم نہیں ہو رہی تھی۔

کشش تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔

عشق کا یہ راہی اپنی منزل کی جانب گامزن تھا کہ موت نے پیچھے سے آ کر بانہوں میں لے لیا۔

آہ۔۔۔۔بزدل موت کے بزدل وار۔

کیپٹن عمار کو اپنے سینے میں کچھ چبھتا محسوس ہوا۔وہ جس کی تکلیف سے ان کی رگیں پھول گئی تھیں۔اس کے بعد ایک اور چیز آئی جو ان کے کندھے میں پیوست ہوئی تھی۔

وہ گولی تھی شاید۔

ہاں وہ گولیاں ہی تھیں جو یکے بعد دیگرے ان کے چٹان جیسے مضبوط جسم میں گھس رہی تھیں۔لیکن وہ پہاڑ گرا نہیں تھا۔

انہوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے رخ موڑا تو پیچھے بزدلوں کا سردل کھڑا تھا۔

"پیچھے سے وار۔۔۔۔تف ہے تم پر'' یہ کہتے ہی کیپٹن عمار نے مشین گن کا ٹریگر دبا دیا اور ساری گولیاں اس درندہ صفت انسان کے اندر اتار دیں۔

وہ بزدل انسان کب جانتا تھا کہ پاکستان آرمی پیچھے سے وار کو معیوب سمجھتی ہے مومن ہمیشہ آگے سے وار کرتا ہے اور آگے سے گولی کھانے کو ہی فخر سمجھتا ہے۔

اس درندے نے کیپٹن عمار پر پیچھے کی جانب سے وار کیا تھا۔لیکن کیپٹن عمار نے سامنے آ کر اس کے سینے میں گولیاں اتاری تھیں جن کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ کیپٹن عمار کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا تھا۔اور پھر منہ کے بل گر کر دھرتی ماں کے بیٹے کے آگے زندگی ہار گیا تھا۔

انہوں نے اپنے کندھے پر لگے پاکستان کے سبز و سفید پرچم کو کپکپاتے ہونٹوں سے چوما اور حق کا کلمہ کہتے ہوئے جان حق کو لٹا دی۔

آسمان نے کیا دیکھا تھا؟

دھرتی نے کیا محسوس کیا تھا؟

"فخر۔"

کائنات کی ہر چیز نے اس بیٹے پر فخر محسوس کیا تھا۔یہ فخر ہی تو ہیں اس زمین کے۔

ہاں،یہ فخر ہی ہیں۔

(———————)

تیری محبت میں موت آئے
تو اس سے بڑھ کر
نہیں ہے خواہش

یہ ایک جان کیا
ہزار ہوں تو
ہزار تجھ پہ نثار کروں
میرے وطن یہ عقیدتیں
اور پیار تجھ پہ نثار کروں
محبتوں کہ یہ سلسلے
بے شمار تجھ پہ نثار کروں
میرے وطن،
میرے وطن

دھرتی ماں کے پرچم میں لپٹا وہ جسم اپنی محبتیں،چاہتیں،عقیدتیں حتی کہ اپنی جان بھی اپنے وطن پر قربان کر آیا تھا۔

آج ان کی شادی کا دن تھا۔ہر طرف چراغاں کیا گیا تھا۔پورے گھر کو گلابوں کی خوشبو سے مہکایا گیا تھا۔ساری تیاریاں مکمل تھیں۔انتظار تھا تو صرف دلہے کے آنے کا۔جو آنے میں ناجانے کیوں تاخیر کر رہا تھا۔

دوپہر تک دلہا آ گیا تھا۔اپنے وعدے کے مطابق وہ لوٹ آیا تھا۔

لیکن یہ کیا اسے تو پیروں پر چل کر آنا چاہیے تھا۔

لیکن یہ تو۔۔۔۔۔۔لیکن یہ تو تابوت میں لپٹا،چار کندھوں کے آسرے پر چلا آرہا تھا۔

اس کے لیے تو کل کو سجایا گیا تھا۔مگر یہ کیسا دلہا تھا جو خوبصورت سجی کل کو چھوڑ کر بند تابوت میں سفر کرتا آرہا تھا۔

اس دلہے نے تو آ کر پاؤں زمین پر مار کر اپنی ماں کو فوجی انداز میں سلام کرنا تھا۔جیسے یہ بیٹے سلام کرتے اچھے لگتے ہیں۔

اپنی چھوٹی بہن کی پونی کھینچنی تھی۔چھوٹے بھائی کو پیار سے ڈانٹنا تھا کہ وہ ان کی گڑیا کو تنگ کیوں کرتا ہے۔دروازے پر ان کے گھر والے کھڑے ان شرارتوں کے منتظر تھے۔لیکن ایسا تو وہاں کچھ نہیں ہوا تھا۔

منظر میں تو ایسا کچھ بھی نہیں ابھرا تھا۔

اس کی جگہ ان جوانوں نے پاؤں زمین پر مار کر سیلوٹ کیا تھا،جو اس دلہے کے بھاری تابوت کو اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھا کر لائے تھے۔

ان تابوتوں کو اٹھانا بھی کتنا مشکل ہوجاتا ہے۔یہ کتنے بھاری ہوجاتے ہیں کہ ساری توانائی و طاقت ہمت ہار جاتی ہے۔

اس دلہے کی ماں نے کتنا سوچا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ایسے دلہا بنائے گی۔اس کی شادی پر اپنے سارے ارمان پورے کرے گی۔اپنے بیٹے کا سہرا خود اپنے ہاتھوں سے سجائے گی۔لیکن وہ سارے ارمان ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔کیپٹن عمار کو پہلے ہی دلہا بنا دیا گیا تھا۔ان کا سہرا پہلے ہی سجا دیا گیا تھا۔

تابوت کو زمین پر رکھا گیا اور عظیم بیٹے کے عظیم والدین کو بیٹے کی شہادت پر مبارکباد دی گئی۔

سلام ہو ان والدین پر جنہوں نے سارے ارمان دل میں دفنا کر صرف "الحمد اللہ'' کہا۔

سلام ہے ان حوصلوں پر۔

سلام ہے ان والدین پر۔

اور سلام ہے ایسے بیٹوں پر۔

فوجی دستے کی سلامی میں اس مٹی کے بیٹے کو مٹی کی آغوش کی سپرد کر دیا گیا تھا۔

جوان دلہا ابدی نیند سو چکا تھا۔

(——————)

اس آپریشن کو میجر بلال لیڈ کر رہے تھے۔اور اس آپریشن کے دوران انہیں کئی بار دھمکی بھرے پیغامات مل چکے تھے۔

آج بھی جب وہ ڈیوٹی سے واپس اپنے فلیٹ میں جا رہے تھے تو انہیں دہشت گردوں کے سردار کی جانب سے ایک کال موصول ہوئی۔

"ہیلو میجر۔" آواز شناسا نہیں تھی۔

"کون؟" راہداری سے گزرتے ہوئے وہ پل بھر کو رکے تھے۔

"تمہارا اباپ۔" آواز نخوت بھری تھی۔

"ہاہاہاہا۔۔۔مذاق اچھا کر لیتے ہو۔" کیپ کو اتار کر انہوں نے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"مذاق تو تم بھی اچھا کر لیتا ہے میجر۔لیکن تمہیں اس مذاق کا بہت بڑا قیمت چکانا پڑے گا۔" فون سے دھمکی بھری آواز سنائی دی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ تمہارے دھمکی دینے سے میں ڈر جاؤں گا؟" وہ حیرت زدہ دکھائی دیئے۔

"نہیں میجر،اس دفعہ ہم دھمکی نہیں دے گا۔ مگر ہاں ایک تحفہ ضرور دے گا۔امید ہے کہ پسند آئے گا۔" ایک بھیانک سا قہقہہ میجر بلال کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

"یہ تحفہ کس خوشی میں؟" میجر بلال ٹھٹھکے۔

"ہمارا بات نہ ماننے کا خوشی میں۔" وہ جو کوئی بھی تھا، پشتو لہجہ رکھتا تھا۔

"کیسی بات؟" راہداری عبور کر کے وہ اپنی گاڑی کے پاس آ گئے۔

"میجر تم نے ہمارے علاقے میں اپنے ان ناپاک ساتھیوں کو بھیج کر بہت بڑا غلطی کیا ہے۔" خباثت سے مدعا بیان کیا گیا تھا۔

"اچھااااا۔۔۔سمجھ گیا کہ کون ہو تم۔وہی ناں جنہیں دنیا دہشت گرد کے نام سے جانتی ہے؟" انہوں نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر استفسار کیا۔

"تم جیسا کافر ہم جیسا مسلمان کو یہی کہتا ہے۔" رگ پر ہاتھ پڑتے ہی وہ بھنا اٹھا تھا۔

"ہم نہیں کہتے، بلکہ یہ تم لوگوں کی درندگی ہی ہے جو تم لوگوں کو یہ نام بخشتی ہے۔" لہجے کی تلخی باتوں سے چھلکنے لگی تھی۔

"تم جیسے بزدل سوائے دھمکیوں کے اور ہتھیاروں سے دہشت پھیلانے کے اور کر بھی کیا سکتے ہو۔

اور ہاں، میری ایک بات یاد رکھنا وطن کے قدم کبھی بھی کافروں کی خالی دھمکیوں سے لڑکھڑاتے نہیں ہیں۔

ہم نے اس دھرتی ماں کی حفاظت کی قسم اٹھائی ہے سر کٹا لیں گے لیکن تمہارے جیسے گھٹیا انسانوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ ہمارے قدم اٹھ چکے ہیں۔ ہمارا جذبہ پرواز بھر چکا ہے، بادِ مخالف بھی چلا لو تو بھی ہمیں گرا نہیں پاؤ گے۔

ہم اس ملک کے بیٹے ہیں اور اس ملک کی حفاظت کے لیے ہی پیدا کیے گئے ہیں۔ دہشت کے خلاف جنگ امن کا فرض ہوتی ہے۔اور ہم امن کے رکھوالے اس جنگ کو جیت کر دکھائیں گے ان شاءاللہ۔

تم جیسے لوگ تو آرمی کا نام سن کر ہی کانپ جاتے ہو، لڑائی کیا خاک لڑو گے؟" وہ لحظہ بھر رکے۔

"ملا صاحب شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے شیر جیسی طاقت چاہیے ہوتی ہے۔ بلی اگر شیر کا مقابلہ کرنے نکل پڑے تو نتیجہ صاف نظر آتا ہے کہ موت بلی کی ہی ہوگی۔فون رکھتا ہوں۔" ایک اطمینان بھری مسکراہٹ چہرے پر حق جتانے آئی تھی۔

"میجر صاحب یہ بات تمہیں بہت بھاری پڑے گا۔" یہ آخری الفاظ تھے جو میجر صاحب کو اپنے آئی فون سے سنائی دیئے تھے۔

ایک نظر آئی فون کی سیاہ سکرین پر ڈال کر انہوں نے ایک لمبا سانس ہوا میں چھوڑا۔فون کو ڈیش بورڈ پر رکھ کر انہوں نے گاڑی ریورس کرتے ہوئے پارکنگ ایریا سے نکالی۔

"بچے ہیں۔لیکن خود کو ہمارا باپ سمجھتے ہیں۔لو بھئی یہ کیسے باپ ہوئے پھر جو بچوں کا نام سن کر ہی کانپ جاتے ہیں۔" گہری ہوتی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا تھا۔

(——————)

"اچھا دوست، اب کیا ارادے ہیں تم لوگوں کے؟" ناشتہ کرنے کے بعد وہ لوگ اسلام آباد کا نظارہ کرنے نکلے تھے جب ٹالی نے یہ سول کیا۔

"کل کا دن ادھر ہی رکیں گے۔ پھر پرسوں ہم ہڑپہ کے روٹ میں آنے والے تمام تاریخی مقامات کو وزٹ کریں گے۔ ہم یہاں سے کسی گائیڈر کو ہائر کر لیں گے۔اور ہاں، ڈرون کیمرے کا میں نے انتظام کر لیا ہے۔ ہم ساری ریکارڈنگ اس کے ذریعے کریں گے ماریہ۔کیونکہ یہاں اسلام آباد کے قریب علاقوں میں تو موسم ٹھیک ہے لیکن باقی علاقوں میں گرم ہے۔ ہم وہاں سے ریکارڈنگ کر کے کسی پہاڑی علاقے میں ہی قیام کریں گے۔ تم وہاں پھر آرام سے اپنا تھیسس مکمل کر لینا۔" آرنلڈ نے اب تک کے تمام پلانز ان کے سامنے رکھے۔

"ہمم۔۔۔۔ٹھیک ہے۔" ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"واؤ کتنا خوبصورت منظر ہے۔" ایک پہاڑ پر چڑھتے ہوئے قدرت ٹالی کو اپنے شاہکار سے حیران کر گئی۔

"ہاں، شکر ہے کہ ہم نے صحیح انتخاب کیا ہے۔" پہاڑ پر چڑھنے سے چارلس کا سانس پھول رہا تھا۔

"اتنا خوبصورت شہر ہے۔یہاں ہی پہلے شوٹنگ کر لیتے ہیں۔" ماریہ جس دن سے آئی تھی اس دن سے ہی اس شہر کی خوبصورتی سے متاثر تھی۔

"نہیں، اسے ہم واپسی پر شوٹ کریں گے۔" بیگ میں سے پانی کی بوتل نکل کر منہ کو لگاتے ہوئے اس دفعہ جواب آسٹن نے دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مایوس ہوئی تھی۔

"ویسے یہ ملک اجنبی نہیں لگ رہا۔ ہے نا؟" خوشی سے چلاتے ہوئے اس نے تائید چاہی تھی۔

وہ سب حیرت سے اس کی جانب متوجہ ہوئے۔کیونکہ وہ ایسی لڑکی تھی جو اپنے گھر کے سوا ہر جگہ کو اجنبی مانتی تھی۔

"ہاہاہا۔۔۔دیکھ لینا کہیں تم برسوں سے ادھر ہی تو نہیں رہتی آ رہی۔" چارلس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"ہاں شاید۔" وہ اپنے داہنے شوز کے ڈھیلے پڑتے تسمے باندھنے کے لیے جھکی۔

"لیں جی ہمیں کسی گائیڈر کی کیا ضرورت ہے ہمارے ساتھ تو اس ملک کی دیوی موجود ہیں۔" آرنلڈ بھی مذاق کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

"ہاہاہاہا۔۔۔" اب کی بار آسٹن نے بھی قہقہہ لگایا۔

"مگر میں تو خود اس قطعے کی تلاش میں ہوں جس سے میرا برسوں سے تعلق ہے۔" وہ پہیلیاں بجھانے لگی تھی۔ آسٹن نے ابرو سکیڑے۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو ماریہ، تم یہاں پہلی دفعہ آئی ہو۔" ٹالی کو اس کی دماغی حالت پر شک ہوا۔

"ہاں شاید۔لیکن میری روح انہیں فضاؤں میں گھومتی رہی ہے۔" وہ کھونے لگی۔لندن کی وہ لڑکی اسلام آباد کی ہواؤں میں تحلیل ہونے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں مزید آرام کی ضرورت ہے۔" آسٹن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپسی کی راہ لی۔وہ ان باتوں کو اس کی تھکن کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔ جواباً اس نے کوئی احتجاج نہ کیا۔وہ گم صم سی اس کے ساتھ کھنچنے لگی تھی۔

(——————)

”جناب اس دفعہ کب آنے کے ارادے ہیں؟“ وہ کیچن میں مصرف تھی جب میجر بلال کا فون آیا۔ لہجہ بہت خوشگوار تھا۔

”ابھی تین ہفتے پہلے تو آیا ہوں۔“ لاڈلی بیوی کی بات سن کر وہ شاکڈ ہی تو رہ گئے۔

”تو اب کیا تین ہفتے بعد آنے کا ارادہ ہے؟“ ساری خوشگواریت فضا میں تحلیل ہوگئی۔

”شاید تین ماہ بعد۔تمہیں تو پتا ہے کہ آپریشن چل رہا ہے۔حالات بہت سنگین ہیں۔اب تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں، میں آسکتا ہوں؟“ انہوں نے اسے پیار سے سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

”بیوی کا ذرا خیال نہیں۔“ وہ بھنائی۔

”ارے بیوی کا ہی تو خیال رہتا ہے ہر وقت۔“ وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

”کاش اس وقت آپ میرے سامنے ہوتے۔“ اس نے ساس پین کو مارنے کے خیال سے اٹھایا لیکن دوری ہونے کی وجہ سے ارادہ ترک کرنا پڑا۔

”مجھے یقین ہے کہ تم نے کچھ نہ کچھ مجھے دے مارنا تھا۔“ وہ ساس پین کے پٹخنے کی آواز سن چکے تھے۔ابرش خاموش رہی۔

”ویسے سنا ہے کہ ہٹلر صاحب مر چکے ہیں۔لیکن مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔میرے گھر میں تو ایک عدد ہٹلر صاحب اب بھی موجود ہیں،میری بیوی کے روپ میں۔“ وہ جانتے تھے کہ ابرش کی کیا حالت ہو رہی ہو گی اور وہ ہمیشہ کی طرح اس کی اس حالت سے محظوظ ہو رہے تھے۔لبوں تلے مسکراہٹ شرارت سے رینگ رہی تھی۔

”ہٹلر ہوتی تو آپ اب تک میرے ہاتھوں مر چکے ہوتے۔“ وہ برتنوں کو پٹخنے کے انداز میں شیلف پر رکھ رہی تھی۔ میجر بلال کا غصہ وہ بے چارے برتنوں پر نکال رہی تھی۔

”ظالم بیوی۔۔۔اگر مجھے اسی دن پتا چل جاتا جس دن تم نے میری ناک کی ہڈی توڑی تھی کہ میرا واسطہ اس قدر ظالم لڑکی سے پڑنے والا ہے تو۔۔۔۔۔“ انہوں نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑا۔

”تو۔۔۔؟“ دوسری جانب سے ایک سوالیہ نشان ابھرا۔

”تو۔۔۔۔۔۔۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے ”تو“ کو لمبا کھینچا کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔

”ہاں تو؟“ وہ سچ اگلوانا چاہ رہی تھی۔

”تو۔۔۔۔تو میں اسی دن تمہیں پرپوز کر دیتا۔“ فی الحال یہی بات ان کے دماغ میں آئی تھی۔

”ہاہاہاہا۔۔۔اچھا؟“ وہ استہزائیہ ہنسی۔

”اب دوبارہ اس نمبر پر کال مت کیجیے گا۔اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

”سنو تو۔۔۔“ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن رابطہ منقطع ہو گیا۔

انہوں نے دوبارہ کال ملائی لیکن ایک دو بیل جانے کے بعد نمبر بند ہو گیا۔

”اف۔۔۔میں کیا کروں اس لڑکی کا۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

(———————)

”کیا ہو رہا ہے؟“ وہ ہوٹل کے ٹیرس پہ کھڑی تھی جب اسے اپنے عقب سے آسٹن کی آواز سنائی دی۔

”کچھ نہیں۔“ جواباً وہ مسکرائی تھی۔

”قدرت کے شاہکار دیکھ رہی ہو؟“ وہ جانتا تھا کہ ماریہ قدرت کی کتنی دلدادہ تھی۔ماریہ نے بس ”ہاں“ میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”بہت خوبصورت شہر ہے یہ۔“ حقیقت میں وہ اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔

”ہاں۔“ پھر مختصر جواب۔

”تمہیں یہاں سب سے اچھا کیا لگا؟“ وہ بے ترتیب باتوں کی کڑیاں ملانے لگا۔

”سب کچھ۔“ انداز وہی کھویا سا تھا۔

”کہیں یہیں رہنے کے ارادے تو نہیں ہیں؟“ وہ شرارت سے بولا۔

”نہیں،بالکل بھی نہیں۔“ اس نے سرعت سے سر دائیں بائیں ہلایا کہ کہیں ارادہ عیاں نہ ہو جائے۔ آسٹن کی نیلی آنکھیں سکڑی تھیں۔

”میرا مطلب ہے کہ اب میں اپنے لندن کو تو نہیں چھوڑ سکتی نا۔“ اس نے وضاحت کی۔

”ماریہ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟“ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے اس نے عجیب سا سوال کیا تھا۔

”مطلب؟“ وہ اس کے سوال کو سمجھی نہیں تھی۔

”مطلب وہ کونسی چیز ہے جس کی چاہ میں تمہاری روح ان فضاؤں میں پرواز بھرتی رہی ہے؟“ تو کیا اس دن اس نے ماریہ کی بات کو مذاق میں نہیں لیا تھا۔اس کے دوسرے دوستوں کی طرح۔ آسٹن واقعی اس کے دوسرے دوستوں کی طرح نہیں تھا۔بالکل بھی نہیں۔

”وہ۔۔۔۔۔“ وہ اسے بتانا چاہتی تھی لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔وہ ڈرتی تھی شاید ایک اچھے دوست کے کھو جانے سے۔

وہ اس کے بولنے کا منتظر ہوا۔

”وہ شاید تھکن کی وجہ سے۔ پتا نہیں کیا عجیب عجیب سا دماغ میں آ رہا تھا۔ “مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے آسٹن کو مطمئن کرنا چاہا۔

”اچھا۔ یہ ہی بات ہے؟“ اس نے سوالیہ انداز میں ابرو اچکائے۔

”ہاں یہ ہی بات ہے۔“ وہ اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی تھی۔ لیکن چہرے کے تاثرات اور مسکراہٹ ایک دوسرے کا ساتھ دینے میں ناکام تھے۔

”یہ تم نے جھوٹ بولنا کب سے شروع کر دیا؟“ وہ اسے پرسکون رکھنے کے لیے اب اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی آسٹن۔“ اس نے آسٹن کو یقین دلانا چاہا۔

”جھوٹ بھی اپنی ایک پہچان رکھتا ہے ماریہ۔“ وہ اس کی بات پر یقین کرنے پر مائل نظر نہیں آ رہا تھا۔

”یہ تمہارا وہم ہے آسٹن۔“ وہ اس کی جانب پلٹی۔

”کاش یہ میرا وہم ہی ہو۔“ وہ مزید گفتگو کے لیے نہیں رکا اور اس کے سرخ ہوتے چہرے پر ایک نظر ڈال کر چلا گیا۔

”کاش آسٹن میں تمہیں اپنے اندر کا خوف سنا پاتی۔“ ایک لمبا سانس لیتے ہوئے وہ دوبارہ سامنے کے منظر کی جانب متوجہ ہو گئی۔

(———————)

وہ اپنے کمرے کی صفائی کر کے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے ہال کی جانب آ رہی تھی کہ ”ہیپی برتھ ڈے ٹو یو“ کا مدھم مدھم میوزک سن کر ٹھٹک گئی۔آواز نیچے سے آ رہی تھی۔وہ سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے ہال میں آ گئی۔وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

”یہ آواز کدھر سے آ رہی ہے؟“ آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔

ہال میں صوفوں کے سامنے پڑی شیشے کی میز پر کیک کی شکل کا ایک ڈیکوریشن پیس گھوم رہا تھا۔جس کے گھومنے سے رنگ برنگی لائیٹیں نکل رہی تھیں۔میوزک کی آواز بھی اسی میں سے آ رہی تھی۔

اس نے رک کر ادھر ادھر دیکھا۔وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔اس کے قریب ہی ٹیبل پر ایک گفٹ باکس پڑا تھا۔وہ گفٹ باکس اٹھانے کے لیے آگے بڑھی تبھی اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔

خوبصورت آوازوں میں سے ایک آواز۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو''

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو''

''ہیپی برتھ ڈے ڈیئر ابرش''

میوزک کے ہم آہنگ آواز کسی اور کی نہیں تھی بلکہ میجر بلال کی تھی۔اس نے سرعت سے پلٹ کر دیکھا تو وہاں عقبی دروازے میں میجر بلال چہرے پر خوبصورت مسکراہٹوں میں سے ایک مسکراہٹ سجائے،بازو سینے پر باندھے دیوار کے ساتھ کندھے کو ٹکائے کھڑے تھے۔اس کے یوں مڑ کر دیکھنے پر وہ دھیرے سے چلتے ہوئے اس کے قریب آ گئے۔

'' کیسا لگا سرپرائز؟'' انہوں نے اس کی ناک کو چٹکی میں لیکر دائیں بائیں ہلایا۔ جیسے وہ ہمیشہ کرتے تھے۔

''اب یاد آ رہا ہے آپ کو وش کرنے کا۔'' یہ سچ تھا کہ وہ رات سے ان کے میسج کا انتظار کر رہی تھی۔

''میں نے تمہیں وش کرنے کے لیے کال کی تھی لیکن تمہارا نمبر بند جا رہا تھا۔'' وہ سمجھے تھے کہ پچھلے ایک ماہ سے اس کا نمبر بند ہی تھا۔

''میرا نمبر آن تھا۔'' اس نے ان کے جھوٹ کی نشاندہی کی۔

''سوری۔۔۔ میں نے تمہیں اس لیے وش نہیں کیا تھا کہ اگر میں تمہیں رات میں وش کر دیتا تو اب تمہارے چہرے پر خوشی سے بکھرے اس اناری رنگ کو کیسے دیکھ پاتا۔'' ایسی باتوں کے لیے ان کے پاس ایک سوا ایک بہانے تھے۔

''مجھے کوئی خوشی نہیں ہے۔'' وہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔چہرے پر خفگی کے اثرات نمایاں تھے۔

''ابرش بی بی، مجھے پتا ہے کہ آپ دل ہی دل میں کتنی خوش ہو رہی ہیں۔'' انہوں نے ابرش کے تپتے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے یک مسکراہٹ اچھالی۔جواب میں وہ خاموش رہی۔

''اوکے۔۔۔ آئی ایم سوری۔'' ناک پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے انہوں نے معافی مانگنے کا ایک نیا انداز اپنایا تھا۔

خوبصورت اندازوں میں سے ایک انداز۔

لیکن ابرش کو وہ انداز متاثر نہ کر سکا۔

''ملکہ عالیہ۔۔۔بندہ ناچیز اپنی اس گستاخی کیلیے معافی طلب کرتے ہوئے رحم کی درخواست کرتا ہے۔'' میجر بلال اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ان کی گردن جھکی ہوئی تھی اور ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے۔ جیسے ملکہ عالیہ کے کسی دربان نے انہیں باندھ کر ملکہ عالیہ کے قدموں میں ڈال دیا ہو۔ لیکن ملکہ علیہ کو اس بات سے بھی فرق نہیں پڑا۔

وہ سینے پر بازو باندھے ان سے رخ موڑے بے نیاز بیٹھی رہی۔وہ دربار سے مایوس لوٹے تھے۔

''اگر میں مرغا بنوں تو کیا تب بھی تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟'' چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت تھی اور ہونٹوں تلے شرارت سے مچلتی مسکراہٹ جو لبوں سے چھلکنے کے لیے بے تاب تھی۔

''پھر شاید کچھ سوچا جا سکے۔'' اپنی ہنسی کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے رحم کی درخواست پر عمل کرنے کا سوچا۔

میجر بلال مرغا بننے کے لیے جھکے۔

''بس اب رہنے دیں۔'' کتنا بڑا احسان کیا تھا اس نے۔

''تو تم نے مجھے معاف کر دیا؟'' وہ بے یقینی سے سیدھے ہوئے۔

''ہمم۔۔۔مگر آخری بار۔'' انہیں لاسٹ وارننگ ملی۔

''شکریہ۔۔۔'' بے تاب مسکراہٹ ابھر ہی آئی تھی۔

''لیکن ایک بات بتاؤں، میں مرغا بننے کے لیے نہیں جھکا تھا بلکہ اپنے اس شوز کا تسمہ باندھنے کے لیے جھکا تھا۔'' انہوں نے شوخ مسکراہٹ کو پھر لبوں تلے دھکیلا اور ابرش کے چہرے کے تاثرات کو دیکھے بنا تسمہ باندھنے کے لیے جھک گئے۔

''اوئی۔'' کمر پر زور سے لگنے والے کشن نے ابرش کے تاثرات بتا دیے تھے۔وہ فوراً سیدھے ہوئے۔

''حساب برابر۔'' ابرش نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے۔

''ظالم لڑکی،اتنی مشکل سے چھٹی لیکر آیا ہوں۔پچھلے ایک ماہ سے کوشش کر رہا تھا چھٹی لینے کی۔اگر تم نے ایسے ہی خاطر تواضع کرنی ہے تو میں اپنی چھٹی برخاست کر کے واپس چلا جاتا ہوں۔'' کمر کو سہلاتے ہوئے انہوں نے باہر کے دروازے کی جانب قدم موڑے۔

''اس احسانِ عظیم کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں بادشاہ سلامت۔''وہ کھڑی ہوئی تھی۔ایک ہاتھ کو سینے پر رکھ کر تھوڑا سا جھکتے ہوئے وہ واقعی کسی شاہی خاندان کی شہزادی لگی تھی۔

''ارے نہیں نہیں شکر گزار تو ہمیں آپ کا ہونا چاہیے جو آپ اتنے احترام سے ہمارے لیے کھڑی ہوئی ہیں۔'' میجر بلال نے واپسی کا ارادہ ترک کیا۔

''اب اس بات پر آپ کیا کھائیں گے۔ مکا یا یہ کشن؟'' اس نے کشن ان کو دکھاتے ہوئے آفر کی۔

''اگر محبت و پیار کا کوئی پکوان آپ کے باورچی خانے میں بنتا ہے تو وہ زیادہ بہتر رہے گا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے آن کی آن میں اس سے کشن چھین لیا۔

''معاف کیجیے گا۔ہمارے ہاں ایسے کسی بھی پکوان کے لیے راشن ختم ہے۔'' وہ گفٹ باکس اٹھانے کے لیے آگے بڑھی جسے وہ اب تک کی لڑائی میں بھول چکی تھی۔

''آہاں۔۔۔ رکیں۔یہ تحفہ جادونگری سے آیا ہے اور ایک خاص طلسم سے پیک کیا گیا ہے۔اگر آپ اسے ایسے ہی کھولنے کی کوشش کریں گی تو یہ ضائع ہو جائے گا۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ سے گفٹ باکس لے لیا۔

''تو کیسے کھلے گا یہ؟'' وہ ایک پریشان شہزادی کے انداز میں ایک قدم آگے بڑھی۔

''ہمم۔۔۔۔راج کماری آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اپنے جادو سے پتا لگاتا ہوں کہ یہ تحفہ جسے آپ کے راج کمار نے بھیجا ہے، کیسے کھلے گا۔'' یہ کہہ کر وہ آنکھیں بند کر کے کھڑے ہو گئے۔انہوں نے باکس کو بائیں ہاتھ پہ رکھا اور دائیں ہاتھ کو باکس کے اوپر رکھ کر منہ میں کچھ منتر کی طرح بڑبڑانے لگے۔

''راج کماری یہ نہیں کھلے گا۔'' وہ کچھ پریشان دکھائی دیئے جیسے جادو نے سب کچھ واضح کر دیا ہو۔

''اوہ۔۔۔'' وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''لیکن یہ کیوں نہیں کھلے گا شاہی جادوگر؟'' اس نے شاہی جادوگر سے وجہ جاننی چاہی۔

''منتر سے یہ نظر آیا ہے کہ کسی راج کمار کے تحفے کو یوں نہیں کھولتے بلکہ ایک پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ کھولتے ہیں۔'' ایک گھٹنہ زمین پر ٹیک کر اور دوسرا ہوا میں کھڑا کر کے انہوں نے باکس راج کماری کی جانب بڑھایا۔

جسے راج کماری نے خوبصورت انداز کے ساتھ تھام لیا۔

ایک دلکش مسکراہٹ ابرش کے چہرے پر ابھری تھی جس کے ابھرتے ہی تحفہ کھل گیا۔

گفٹ باکس کے اندر ایک خوبصورت نیکلس تھا۔

''واؤ۔۔۔۔۔'' راج کماری کو تحفہ پسند آیا تھا۔

''تھینک یو سو مچ بلال۔'' نیکلس کو گلے سے لگاتے ہوئے اس کی آنکھ میں ایک ننھا قطرہ ابھرا تھا۔

"خوش آمدید پیاری لڑکی۔" نیکلس کو اس کی گردن کے پیچھے بند کر کے وہ اس کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔" نیکلس کی تعریف کی بجائے انہوں نے ابرش کو سراہا تھا کیونکہ اس کی قیمت ابرش سے ہی تھی۔

"ویسے آپ کو لڑ کا تو نہیں کہنا چاہیے لیکن پھر بھی،شکریہ پیارے لڑکے۔" گالوں پر وہی گلابی رنگ بکھرا تھا جو میجر بلال کو بہت پسند تھا۔

"ہاہاہاہاہا۔۔۔۔" ایک خوبصورت قہقہے نے فضامیں گھنٹیاں بجائیں۔

"اچھا۔۔۔ماما کہاں ہیں؟" ایک ابرش بھی نا انہیں باتوں میں الجھا دیتی تھی۔

"وہ خالہ رضیہ کے گھر گئی ہیں۔" گفٹ ریپر کو باکس میں رکھنے کے بعد وہ ڈیکوریشن پیس کی جانب متوجہ ہوئی جو ابھی تک چل رہا تھا۔

"کیوں خیریت؟" وہ اس کے سامنے ہی صوفے پر براجمان ہو گئے۔

"جی،وہ خالہ رضیہ کی طبیعت کل سے کچھ خراب ہے تو بس ان کی خیریت دریافت کرنے گئی ہیں۔" ہرش نے پیس کا بٹن آف کر دیا۔میوزک بجنا بند ہو گیا۔

"اچھا کب تک آجائیں گی؟" وہ اس کے ہاتھوں کی حرکات دیکھ رہے تھے جو بڑے پیار سے اس تحفے کے ایک ایک نقش چھو رہے تھے۔

"شام تک آجائیں گی ان شاءاللہ۔عمر بھائی چھوڑ جائیں گے۔" اس نے بٹن پھر آن کر دیا۔

"ہمم۔۔۔ٹھیک ہے۔میں بازار جا رہا ہوں،دروازہ لگا لو۔" وہ باہر جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

"کیا لینے جا رہے ہیں؟" وہ بھی ان کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

"کچھ چیزیں لینی تھیں۔" انہوں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"کھانے میں کیا بناؤں؟" شانوں پر دوپٹہ پھیلاتے ہوئے وہ بھی ان کے ساتھ چلنے لگی۔

"کچھ نہ بنانا۔آج ہم باہر کھانا کھائیں گے۔تمہاری سالگرہ کی ٹریٹ میری طرف سے۔" ایک خوبصورت مسکراہٹ نے اسے اللہ حافظ کہا۔

"جلدی آیئے گا۔" اس نے دروازے کی اوٹ سے سر نکالا جہاں سامنے وہ اپنی گاڑی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" اللہ حافظ بول کر وہ گاڑی کو آگے بڑھا کر لے گئے۔

دروازہ بند کر کے وہ واپس اس ڈیکوریشن پیس کے پاس آ گئی جو کہ بہت خوبصورت تھا شاید اس لیے کہ یہ اسے اس کے راج کمار نے دیا تھا۔وہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اس تحفے کو بڑی محبت سے تکنے لگی۔

(ــــــــــــــ)

ڈوربیل مسلسل بج رہی تھی۔وہ جو تھوڑی دیر پہلے آکر گفٹ کے پاس بیٹھی تھی،حیرت سے مین گیٹ پر آئی۔

"اتنی جلدی آ بھی گئے۔لگتا ہے بھول گئے ہیں کچھ۔بھلکڑ کہیں کے۔" خود سے ہمکلام ہوتے ہوئے اس نے بنا پوچھے دروازہ کھول دیا۔

مگر سامنے وہ تو نہیں تھے جن کے لیے اس نے دروازہ کھولا تھا۔سامنے تو شاید موت کھڑی تھی دو آدمیوں کی صورت میں۔جن کے ہاتھوں میں بڑی بڑی بندوقیں تھیں سروں پر ٹوپی بڑھی ہوئی داڑھی وحشی ابلی ہوئی آنکھیں،شلوار قمیض میں ملبوس وہ بہت دہشت ناک نظر آ رہے تھے۔وہ بہت زیادہ گھبرا گئی۔

اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی مگر۔۔۔۔آہ۔۔۔موت کے آگے یہ تدبیریں کہاں کام آتی ہیں۔

ان میں سے ایک نے دروازے کو زور سے اندر کی جانب دھکا لگایا۔دروازے کا سرا اس کے سر پر لگا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے گر گئی۔

"کون ہو تم لوگ؟اور یوں منہ اٹھائے کہاں چلے آ رہے ہو؟" وہ ہمت کر کے کھڑی ہوئی۔آواز رندھنے لگی۔

"ہم ملا صاحب کا طرف سے میجر صاحب کو ایک تحفہ دینے آیا ہے۔" ان میں سے ایک درندہ وحشت سے مسکرایا۔

وہ ان کی اگلی بات سننے سے پہلے ہی ہال کی جانب بھاگ آئی۔اسے اپنے پیچھے موت کے بھاگنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔اس سے پہلے کہ وہ ہال کا دروازہ بند کرتی ان میں سے ایک نے اسے عقب سے بالوں سے پکڑا اور زمین پر پٹخ دیا۔

"وہ کیا ہے نا میجر صاحب کو پیار کا زبان سمجھ نہیں آتا۔اس لیے ہم ان کا عقل ٹھکانے لگانے آیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بندوق کی نالی اس کی جانب کر دی۔

"تف ہے تم پر اور تمہارے ملا صاحب پر۔شیطان ہو تم لوگ شیطان۔۔۔کمزور عورت کو دیکھ کر لڑنے چلے آئے ہو۔تم جیسے لوگ تو۔۔۔۔۔۔۔" اس کی بات ابھی اسکے منہ میں ہی تھی کہ اسے بندوق کی نالی سے ایک آگ سی نکلتی ہوئی محسوس ہوئی جو پلک جھپکنے میں اس کے سینے میں گھس گئی۔اس کی چیخ وہیں ہال میں ہی دب کر رہ گئی۔

"ہم یہاں تمہارا یہ بکواس سننے نہیں آیا۔" یہ کہہ کر اس نے پھر بندوق کا ٹریگر دبا۔دوسری گولی پہلی گولی کے قریب سے گزری تھی۔ایک سسکی اس کے روح چھوڑتے جسم سے نکلی تھی۔ایک جھٹکا اس کے پورے جسم کو لگا تھا۔

گولیوں کی آواز سے چیلوں کے چلانے کی آواز سنائی دی جو دور آکاش پر دائرے میں چکر کاٹ رہی تھیں۔ان کی رفتار بڑھ گئی تھی۔موت کے آنے سے اردگرد کے درختوں پر بیٹھے پرندے پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔جیسے اس کی روح اڑی تھی۔

"بلال۔۔۔۔۔۔۔" یہ آخری لفظ تھا جو اس کی زبان سے نکلا تھا۔اس کے بعد اندھیرا چھا گیا تھا۔دور دور تک۔

گھپ اندھیرا۔۔۔۔۔

ایسا اندھیرا جس کے پار روشنی کی کوئی امید نہیں تھی۔

اس کی گردن موت کے وار سے داخلی دروازے کے جانب لڑھک گئی۔آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔اور منتظر تھیں،شاید اس کے لوٹ کر آنے کی جو اسے سرپرائز دینے کے لیے گیا تھا۔

ایک سرپرائز انہوں نے اسے دیا تھا اور ایک سرپرائز وہ دینے جا رہی تھی۔لیکن اس کا سرپرائز ان کی جان نکال سکتا تھا۔

آہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔جان تو نکل گئی تھی ان کی۔

اب کیا بچا تھا۔

بس سانسوں کے نام کی زندگی۔

وہ درندہ صفت انسان جاتے ہوئے اس ڈیکوریشن پیس کو آن کر گئے۔سالگرہ کی موسیقی پر موت رقص کرنے لگی۔ہال میں پڑی ہر چیز موت کی اس سنگدلی پر بین کرنے لگی۔

ابھی تو ابرش نے اس تحفے کو جی بھر کر دیکھنا تھا۔لیکن یہ سنگدل موت کہاں کسی کی خواہشوں کو دیکھتی ہے۔یہ تو بس مرقد بنانا جانتی ہے۔کبھی زندہ لاشوں کے تو کبھی مردہ خواہشوں کے۔

(ــــــــــــــ)

گاڑی مین گیٹ کے پاس روک کر انہوں نے پچھلی سیٹوں پر سے کچھ شاپر اٹھائے،جن میں وہ ابرش۔کے لیے کیک لائے تھے،غبارے تھے،موم بتیاں تھیں اور سالگرہ کے دیگر لوازمات۔

"ابرش کو اچھا لگے گا یہ سرپرائز۔" سن گلاسز اتارتے ہوئے وہ مین گیٹ کے قریب آئے جو کہ کھلا ہوا تھا۔

"اف،پاگل لڑکی کو کہا بھی تھا کہ دروازہ لگا لے لیکن یہ ہٹلر صاحبہ میری بات مانتی ہی کب ہیں۔"

راہداری عبور کرتے ہوئے ان کا دل ایک دفعہ زور سے دھڑکا تھا۔انہوں نے لحظہ بھر رک کر ادھر دیکھا اور پھر کسی خیال کے تحت چل دیئے۔

راہداری عبور کر کے وہ کیچن میں آ گئے۔

''ابرش۔'' انہوں نے کیچن میں آ کر اسے آوازیں دیں مگر وہ وہاں نہیں تھی۔

''ابرش۔'' اب کی بار پکارتے ہوئے ان کا دل پھر کسی احساس کے تحت زور سے دھڑ کا تھا۔ایسا کیوں ہو رہا تھا وہ نہیں جانتے تھے۔

کیچن سے سیدھا وہ ہال کی جانب آئے۔

آگے کا منظر دیکھ کر ان کا دھڑ کتا دل دھڑ کنا بھول گیا تھا۔انہیں پورا ہال تیزی سے گھومتا ہوا محسوس ہوا۔زلزلہ سا آنے سے ہال میں لگی تمام پینٹنگز زمین پر گر کر چکنا چور ہو گئیں۔شیشے کی میز ایک چھنا کے دار آواز سے ٹوٹ گئی اور پھر یہ تمام کرچیاں ہوا کے کسی بھنور کی طرح گھومتے ہوئے میجر بلال کی آنکھوں اور چہرے میں گھس گئیں۔قریب ہی تھا کہ ان کے چہرے سے خون بہنے لگتا لیکن خون تو فرش پر بہا تھا۔ان کی ابرش کے جسم سے بہا تھا۔

ان کے ہاتھ سے شاپر زمین پر گر گئے۔قدم زمین نے مضبوطی سے اپنی لپیٹ میں لے لیے۔

انہیں لگا تھا کہ وہ اب کبھی بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں پائیں گے۔وہ کبھی حرکت نہیں کر پائیں گے۔ساری طاقت،ساری توانائی فضا میں کہیں تحلیل ہو گئی تھی۔

''ابرش۔ '' کرچیاں چہرے کی کھال چیرتے ہوئے ان کی زبان اور حلق میں دھنسنے لگیں۔وہ اس تکلیف کی شدت سے مزید کچھ نہ کہہ سکے۔وہ شاید سکتے میں آرہے تھے۔ان کی خون آلود آنکھیں پتھرانے لگیں۔جسم مفلوج ہونے لگا۔اگر موت کچھ دیر اور اس گھر میں رکتی تو یقیناً وہ بھی مر چکے ہوتے۔

نہیں نہیں،موت تم اتنی بے رحم کیسے ہوسکتی ہو تم کیسے میجر بلال سے ان کی ابرش چھین سکتی ہو؟ابھی تو ان دونوں نے محبت کی نگری کی سیر کرنی تھی۔عشق کی فضاؤں میں سانس لینا تھی۔محبت کے رنگوں کو دیکھنا تھا۔چاہت کے مدھر گیت ایک دوسرے کو سنانے تھے۔خلوص کی تھاپ پر رقص کرنا تھا۔تو تم اتنی جلدی کیسے آسکتی ہو؟ کیسے؟

زمین کے خلاف ساری طاقت لگاتے ہوئے وہ بمشکل دو قدم آگے بڑھے۔ایک زندہ لاش سے بے جان وجود تک کا فاصلہ پھیلنے لگا۔

بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ وہ صدیوں پر محیط مسافت طے کر کے اس کے وجود کے قریب پہنچ گئے تھے۔

وقت نے انہیں ابرش کے جسم کے قریب گرتے دیکھا تھا۔ہاں وہ گر گئے تھے۔وہ اگر کھڑے رہتے تو مجسمہ بن جاتے۔کبھی نہ حرکت کرنے والا مجسمہ۔

وہ بے یقینی سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگے۔یقین آتا بھی تو کیسے۔ابھی تو تھوڑی دیر پہلے وہ اس گھر میں ہنستا مسکراتا چھوڑ کر گئے تھے۔ابھی تو وہ بڑے حق سے ان کے ساتھ لڑ رہی تھی۔تو پھر کچھ ہی لمحوں میں یہ سب کیسے ہو سکتا تھا۔اتنی بڑی قیامت آن کی آن میں کیسے ٹوٹ سکتی تھی۔

مگر وقت نے یہ ستم بھی کر دیا تھا۔

میجر بلال نے ہمت کر کے اس کا چہرہ اپنی گود میں رکھا اور منتظر آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔کبھی نہ دیکھنے کے لیے۔کبھی نہ انتظار کرنے کے لیے۔

وہ کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔انہیں اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔کرچیاں حلق سے ہوتے ہوئے جسم میں جانے لگی تھیں۔

پتھرائی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا تھا جو ماتم کی بانسری پر مدہوش بہتا ہوا میجر بلال کے گالوں سے ہوتا ہوا ابرش کے رخساروں پر گر رہا تھا۔وہ رخسار جن پر میجر بلال کچھ دیر پہلے اپنی محبت کے اناری رنگ بکھیر کر گئے تھے۔لیکن وہ تو اب زرد پڑ چکے تھے۔موت کی سفاکی انہیں زرد کر کے جا چکی تھی۔

آنسو روانی سے بہنے لگے۔وہ ان کے چہرے کو تکتے جا رہے تھے۔وہ نرمی سے اس کے رخسار چھو رہے تھے۔

ہال میں وہ سامان جو وہ اسے سرپرائز دینے کے لیے آئے تھے،شاپروں سے باہر نکل کر ادھر ادھر بکھر گیا تھا۔ایک موم بتی لڑھکتی ہوئی باقی سامان سے جدا ہو گئی تھی۔جسے وہ اس کی سالگرہ پر جلانے کے لیے لائے تھے۔لیکن یہ کیا،یہ تو جلنے سے پہلے ہی بجھ چکی تھی۔اسے تو ابرش نے مسکراتے ہوئے بجھانا تھا لیکن اسے تو موت کی آندھی وقت سے پہلے ہی بجھا گئی تھی۔

''ابرش، کوئی یوں بھی روٹھتا ہے؟ کوئی یوں بھی ناراض ہو کر اتنی دور چلا جاتا ہے؟ میں ابھی تو تمہیں ملکر گیا تھا تو پھر اب یہ ناراضگی کیسی؟ تمہیں پتا ہے کہ میں تمہیں یوں خاموش نہیں دیکھ سکتا۔تم خاموش تو مجھے بالکل بھی اچھی نہیں لگتی۔بولو ابرش، تم چپ کیوں ہو گئی ہو؟ تم بولتی کیوں نہیں ابرش؟'' وہ اس کے بے جان جسم کو جھنجھوڑنے لگے۔

''تم تو مجھے لڑتے اچھی لگتی ہو۔اس گھر میں ادھر سے ادھر بھاگتے اچھی لگتی ہو۔'' حلق کے کرچیوں سے زخمی ہونے کی وجہ سے وہ بے آواز باتیں کر رہے تھے۔

''ابرش میں پنچ اور کشن دونوں کھانے کو تیار ہوں۔تم مارو مجھے۔تم مجھے مارتے اچھے لگتی ہو۔میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے اپنی محبت کا اظہار اسی طرح کرتی ہو۔ تو اب بھی کرو نا۔ میں منتظر ہوں۔دیکھو،ابرش میں منتظر ہوں۔''

''ابرش۔''

''ابرش ضد چھوڑ دو۔'' وہ اس کے چہرے کو تھپتھپانے لگے جو زندگی کی رمق سے مرحوم ہو چکا تھا۔

''ابرش میں نے ہمیشہ تمہاری بات مانی ہے۔تم نے جو کہا وہ میں نے کیا۔تو تم بھی آج میری بات مان لو۔اٹھ جاؤ ابرش۔ یہ ناراضگی چھوڑ دو۔'' ان پر دیوانگی طاری ہو رہی تھی۔

آہ۔۔۔موت تمہاری آنکھوں میں رحم کیوں نہیں ہے۔ یہ دیکھو،وہ جن کے لبوں سے مسکراہٹ کبھی جدا نہیں ہوئی تھی وہ آج کیسے رو رہے ہیں،زاروقطار۔ بلک بلک کر۔

کاش کہ تمہیں رحم آ جائے۔

کاش۔۔۔۔۔۔

(————)

میں بھی چپ ہو جاؤں گا
بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر،
اے زندگی،اے زندگی
جب تلک روشن ہیں
آنکھوں کے فسردہ طاقچے
نیلگوں ہونٹوں سے پھوٹے گی
صدا کی روشنی
جسم کی گرتی ہوئی
دیوار کو تھامے ہوئے
موم کے بت آتشیں
چہرے سلگتی مورتیں
میری بینائی کی یہ مخلوق
زندہ ہے ابھی

اور کچھ لمحے ٹھہر،
اے زند گی،اے زند گی
ہو تو جانے دے
میرے لفظوں کی معنی سے تہی
میری تحریریں،
دھوئیں کی رینگتی پرچھائیاں
جن کے پیکر اپنی
آوازوں سے خالی بے لہو
محو ہو جانے تو دے
یادوں سے خوابوں کی طرح
رک تو جائیں آخری سانسوں کی
وحشی آندھیاں
پھر ہٹا لینا میرے ماتھے سے
تو کبھی اپنا ہاتھ
میں بھی چپ ہو جاؤں گا
بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر،
اے زند گی،اے زندگی

ان کی والدہ کے گھر آتے ہی گھر میں صف ماتم بچھ گیا۔بین کی آواز سے محلے والے اکٹھے ہونے لگے۔خدا ترسی کے لیے سب غم میں شریک ہونے کے لیے آنے لگے۔دور دور کے عزیز و اقارب کو فون کیا جانے لگا۔کوئی جوان موت پر افسوس کا اظہار کرنے لگا۔

جبکہ میجر بلال اسی طرح ابرش کے وجود کو اپنی بانہوں میں لیے بیٹھے تھے۔

وہ لوگوں کی آمد و رفت سے بیگانہ بیٹھے رہے۔دماغ میں بس گذشتہ دنوں کے واقعات بے ترتیبی سے چل رہے تھے۔

"ہم اس دفعہ تم کو دھمکی نہیں،تحفہ دے گا۔"

"جناب اس دفعہ کب آنے کے ارادے ہیں۔"

"ہٹلر ہوتی تو اب تک آپ میرے ہاتھوں مر چکے ہوتے۔"

"امید ہے کہ تم کو ہمارا تحفہ پسند آئے گا۔"

"تب میرا بھی دل کرتا تھا کہ میں بھی تارا بن کر چمکوں۔"

"میجر تم کو یہ بات بہت بھاری پڑے گا۔"

"جب میں تارا بن کر چمکوں گی نا تو اس چھت سے سب سے واضح نظر آنے والا تارا آپ کی ابرش ہو گی۔"

"یہ تحفہ ہمارا بات نہ ماننے کی خوشی میں۔"

ایک جھماکے سے دماغ کی سکرین سیاہ ہوئی تھی۔

پھر دماغ میں گذشتہ دن ان کی ایک تقریب میں پڑھی جانے والی سعدی شیرازی کی نظم کے الفاظ بازگشت کرنے لگے۔

در رفتن جان از بدن گویند ہر نوعی سخن
من خود بہ چشم خویشتن،دیدم کہ جانم می رود
)بدن سے جان نکلنے کے بارے میں طرح طرح کے سخن کہے جاتے ہیں۔
لیکن میں نے خود اپنی چشم سے اپنی جان کو نکلتے دیکھا ہے۔

تو بدن سے جان کو نکلتے ایسے دیکھا جاتا ہے۔یہ تو اپنی جان نکلنے کی تکلیف سے بھی زیادہ تکلیف تھی جو سہے نہ سہی جا رہی تھی۔

وہ پتھرائے ہوئے بیٹھے تھے۔ابرش کو ان کی بانہوں کے حصار سے دور لے جایا جانے لگا۔

ای ساربان آہستہ ران،کارام جانم می رود
وان دل کہ با خود داشتم،با دلستانم می رود
)اے ساربان آہستہ چلا کہ میری جان کا آرام جا رہا ہے۔
اور وہ دل جو میرے پاس تھا،میرے دلبر کے ساتھ جا رہا تھا۔(

وہ اپنی جگہ سے اٹھنا نہیں چاہ رہے تھے۔وہ کوئی حرکت نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔وہ چپ بیٹھے اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے لیکن وہ نہیں آئی۔

بہت سے لوگ انہیں رلانے کی کوشش کرنے لگے۔انہیں کیا پتا تھا کہ وہ کتنا رو چکے تھے۔اب تو آنکھیں ساتھ دینے سے انکاری ہو چکی تھیں۔

گھر میں کی جانے والی آخری رسومات کے بعد اس کا جنازہ اٹھایا جانے لگا۔

آہ---------

وہ جو انہیں ڈولی میں بٹھا کر بڑے چاؤ،بڑے مان کے ساتھ اس گھر میں لائے تھے،آج اسے کس حالت میں جدا کرنے جا رہے تھے۔

تو جان نکلنا کسے کہتے ہیں؟

گفتم بہ نیرنگ و فسوں پنہاں کنم ریشم درون
پنہاں نمی ماند کہ خون،بر آستانم می رود
)میں نے سوچا کہ سحر اور فسون سے اندر کا زخم چھپاؤں گا۔
لیکن چھپا کر رکھا نہیں جا سکتا کہ خون میرے آساں پر رواں ہے۔(

اس کی چارپائی کو کندھا دینے کے لیے میجر بلال کو آگے کیا گیا۔چارپائی اٹھانے کے بعد ان کے قدم آگے بڑھنے سے انکاری تھے۔
کلمہ شہادت کی صدا بلند ہوئی اور قافلہ راج کماری کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے چل پڑا۔

محمل بداری ساربان، تندی مکن با کاروان
کز عشقِ آنِ سر وِ روان، گوئی روانم می رود
)اے ساربان! محمل کو روک دو اور کاروان کے ساتھ جلدی مت کرو۔
کہ اس محبوب کے عشق کےسبب گویا بدن سے میری جان نکلتی جارہی ہے۔(

کندھے بدلے جارہے تھے۔زمین تنگ پڑنے لگی۔آسمان کی وسعتیں ختم ہونے لگیں۔ ہر چیز سر جھکا کر ماتم کناں نظر آنے لگی۔

او می رود دامن کشان، من زھر تنھائی چشان
دیگرمپرس ازمن نشان، کز دل نشانم می رود
)وہ دامن کھینچنے والا جارہا ہے اور میں ہوں تنہائی کا زہر چکھنے والا۔
اس کے بعد مجھ سے میرانشان مت پوچھنا کہ دل سے میرانشان جارہاہے۔(

قافلہ مرقد گاہ پر پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ہرش کی آخری آرام گاہ تیار کی جاچکی تھی۔ میجر بلال نے خود اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنے بے جان ہاتھوں سے اسے مٹی تلے ہمیشہ کے لیے دفنادیا۔

باز آی و برچشم نشین، ای دل ستانِ نازنین
کاشوب وفریاد از زمین بر آسمانم می رود
)اے دلبر نازنین،واپس آجاؤ اور میری چشم پر بیٹھ جاؤ۔
کہ تمہاری جدائی میں میری بانگ وفریاد زمین سے آسمان تک بلند ہورہی ہے۔(

سب اس کی لحد پرمٹھی مٹھی بھر مٹی ڈل کر میجر بلال سے دو بول تسلی کے کہہ کر جاچکے تھے۔اور وہ دو قبروں کے درمیان سر کی جانب بیٹھے تھے۔ان میں سے ایک قبر ان کے والد کی تھی۔
ان کی آنکھوں سے آنسو پھر جاری ہو چکے تھے۔ جو شاید اب ساری زندگی کے لیے ان کی آنکھوں کا حصہ بننے والے تھے

من ماندہ ام مھجورازاو، بیچارہ ورنجورازو

گوئی کہ نیشی دورازو، دراستخوانم می رود
)میں اس سے دور ہو گیاہوں، بے چارہ اور غم زدہ ہو گیاہوں۔
گویا اس سے دور ہونے پر ایک ڈنگ میرے ڈھانچے میں جارہاہے۔(

وہ ساری رات اس کی قبر کے سرہانے بیٹھے رہے۔نالہ وفغل کرتے کرتے ان کے آنسو ختم ہوگئے لیکن دل کا بوجھ تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
(__________)
وہ لگلے کئی دنوں تک ان دونوں قبروں پر جاتے رہے تھے۔۔۔وہ وہاں روز جاتے اور قبروں پر پھول چھڑکتے۔۔۔فاتحہ کےبعد گھنٹوں ابرش کی قبر پر بیٹھے رہتے۔۔۔دل کا بوجھ خاموشی سے ہلکا کرتے رہتے۔۔۔اور روز اس کے لوٹ آنے کی امید کو دل میں دفنا کر واپس آجاتے۔۔۔
باباسائیں کے پوچھنے پر کاش وہ انہیں بتاپاتے کہ اس کاسب کچھ تو ان قبروں میں دفن ہے۔
ان کی خوشی۔۔۔
ان کی قیمتی متاع۔۔۔
ان کی زندگی۔۔۔
اور۔۔۔۔۔۔
سب سے بڑھ کر ان کی ابرش۔۔۔۔۔
جو اب کبھی بھی ان کی زندگی میں لوٹ کر نہیں آئے گی۔۔۔
کبھی بھی نہیں۔۔۔۔

(___________)
حصہ ششم

دل کے آتشدان میں شب بھر
کیسے کیسے غم جلتے ھیں!
نیند بھرا سناٹا جس دَم
بستی کی ایک ایک گلی میں
کھڑکی کھڑکی تھم جاتا ھے
دیواروں پر درد کا کہرا جم جاتا ھے
رستہ تکنے والی آنکھیں اور قندیلیں بُجھ جاتی ھیں
تو اُس لمحے،
تیری یاد کا ایندھن بن کر
شعلہ شعلہ ھم جلتے ھیں

دُوری کےموسم جلتے ھیں تم کیا جانو،
قطرہ قطرہ دل میں اُترتی اور پگھلتی
رات کی صُحبت کیا ھوتی ھے!
آنکھیں سارے خواب بُجھا دیں
چہرے اپنے نقش گنوا دیں
اور آئینے عکس بُھلا دیں
ایسے میں اُمید کی وحشت
درد کی صُورت کیا ھوتی ھے؟
ایسی تیز ھوا میں پیارے،
بڑے بڑے منہ زور دیے بھی کم جلتے ھیں
لیکن پھر بھی ھم جلتے ھیں
ھم جلتے ھیں اور ھمارے ساتھ تمہارے غم جلتے ھیں
دل کے آتشدان میں شب بھر
تیری یاد کا ایندھن بن کر
ھم جلتے ھیں!

وقت نے بھی ان کی زندگی میں کیسا نقش چھوڑا
تھا۔
کبھی نہ مٹنے والا۔۔۔
کبھی نہ پر ہونے والا خلا۔۔۔

ایک خلا ہی تو پیدا ہوا تھا ان کی زندگی میں ابرش کے چلے جانے سے۔سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا کہ وہ محض پلک جھپکنے سے پہلے کا قصہ لگتا تھا۔ پلک جھپکتے ہی پوری داستان ماضی کا حصہ بن گئی تھی۔ایک ناقابل فراموش ماضی کا حصہ جس کی زنجیروں سے مستقبل کی گھڑیاں بھی بندھنے لگیں تھیں۔جن سے رہائی ناممکن تھی۔ برش ان کی نامکمل زندگی کو مکمل کرنے آئی تھی لیکن جاتے ہوئے مکمل زندگی کو نامکمل کر گئی تھی۔کُل کو جزو میں بانٹ گئی۔حسین لمحات کو ماضی کا حصہ کر گئی۔ اتنے بڑے نقصان کے بعد زندگی کو پہلے ڈگر پر چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔حوصلے و توانائیاں جواب دے جاتی ہیں۔کبھی نہ شکست کھانے والے وقت کے رحم و کرم پر آجاتے ہیں۔

میجر بلال کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ایک ناقابلِ یقین واقعہ ان کی زندگی میں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ وقوع پذیر ہوا تھا۔جس کے سامنے وہ بہت بے بس ثابت ہوئے تھے۔وقت نے ایسا ستم کیا تھا کہ ان کے چہرے پر سجی رہنے والی دلکش مسکراہٹ بھی ابرش کی مرقد کا حصہ بن گئی تھی۔وہ جسے دیکھے بنا انہیں سکون نہیں ملتا تھا۔ان کی سانس زندگی کا ساتھ دینے سے انکاری ہو جاتی تھی۔آج وہی میجر بلال ابرش کے بغیر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔زندگی کے دریچے بند ہوتے ہی کھڑکی کے پار کا منظر بدل گیا تھا۔اب وہاں ہریالی ہو یا بنجر زمین کے قطعے، گھر کے باسی کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

لیکن وقت جہاں ستم گر ثابت ہوتا ہے وہیں مسیحابن کر زخموں پر مرہم بھی رکھتا ہے۔اور ہمیشہ کی طرح وقت میجر ارتضی کی صورت میں مسیحابن کر اترا تھا۔

بلال کب تک یونہی رہو گے؟" میجر بلال بالکونی میں کھڑے تھے۔جہاں اکثر برش شام کو اترتے دیکھا کرتی تھی۔"

شاید اب عمر بھر۔"شام کے پر پھیلانے سے پہلے ہی پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔"

کیوں؟'' میجر ارتضی کی نگاہیں میجر بلال کے چہرے پر مرکوز تھیں جہاں کسی قسم کا کوئی تاثر نظر نہیں آرہا تھا۔"

زندہ رہنے کے لیے۔"میجر بلال ریلنگ پر ہاتھ ٹکائے اڑتے پرندوں کو اپنے گھروں کی جانب لوٹتا دیکھ رہے تھے۔"

زندہ رہنے کے لیے؟" میجر ارتضی کو جواب پر حیرت ہوئی تھی۔"

ہاں زندہ رہنے کے لیے۔اگر اس حصار سے نکلا تو پھر سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔"ایک اور پہیلی بھرا جواب۔"

اور اس حصار میں رہو گے تو مر جاؤ گے۔"میجر ارتضی کا لہجہ دکھ سے بھرا تھا۔"

ایک ہی بات ہے۔"ایک طنز آمیز مسکراہٹ نے میجر بلال کے لبوں کو چھوا تھا۔"

بلال تم اتنے کمزور تو کبھی نہ تھے۔"میجر ارتضی نے تاسف سے ان کی طرف دیکھا۔"

ہاں میں اتنا کمزور تو کبھی بھی نہیں تھا۔"آنکھ سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹ کر ان کے رخساروں پر پھسلی تھی۔"

میں تو بہت بہادر تھا۔تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے کس ہمت و حوصلے کے ساتھ ابرش کو مٹی کے حوالے کیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔"شام زندگی کے کینوس پر سیاہ رنگ بکھیر چکی تھی۔"

لیکن اب اور بہادر نہیں رہا جاتا۔"انہوں نے آنسوؤں کو بہنے دیا۔"

لیکن اس طرح تم اپنے ساتھ ساتھ آنٹی اور ابرش کو بھی اذیت دے رہے ہو۔'' میجر ارتضی نہیں چاہتے تھے کہ وہ ماتم کے اسی حصار میں ٹوٹ کر بکھر جائیں۔"

برش؟''لبوں نے ہولے سے نام لیا تھا۔"

ہاں ابرش کو۔اسے تم صرف ہنستے مسکراتے اچھے لگتے ہو۔یوں روتے تو بالکل بھی اچھے نہیں لگتے مرنے والوں کے لیے جب رویا جاتا ہے تو اذیت ان کی روحوں کو پہنچتی ہے۔"

برش تمہاری زندگی میں ایک امتحان بن کر آئی تھی جیسا کہ ہر کسی زندگی میں کوئی نہ کوئی آزمائش آتی ہے۔اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم مرنے والوں کے ساتھ ساتھ زندوں کو بھی سوگ کی زمین میں گاڑ دیں۔"میجر ارتضی نے ہمیشہ کی طرح انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

اس کے لیے مردہ کا لفظ مت استعمال کرو۔"دیوانہ وار انہوں نے میجر ارتضی کو کندھے سے دھکا دیا۔میجر ارتضی نے بر وقت ریلنگ کو پکڑ کر خود کو سنبھالا۔"

ہاں وہ مری نہیں ہے لیکن تمہاری حرکتیں اسے ضرور مار دیں گی۔اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی اور آنٹی کو بھی۔ آنٹی تو زندہ ہیں نا لیکن تم نے تو آجکل انہیں بھی مردوں میں شمار کر رکھا ہے۔"

واحد سہارا ہو تم ان کا مگر تمہیں تو کوئی ہوش نہیں۔ہر وقت کڑھتی رہتی ہیں تمہارے لیے اور ایک تم ہو کہ دیوانگی کی قبر پر انتظار کا دیا جلا کر بیٹھے ہو۔''وہ تو گویا ان کی دیوانگی پر برس پڑے تھے۔

رات ہو رہی ہے میرا خیال ہے کہ تمہیں اب جانا چاہیے۔"میجر ارتضی کا جواب سنے بغیر وہ وہاں سے چلے گئے۔"

ایک تو یہ لڑکا بھی نا، میرا مطلب کہ یہ آدمی بھی نا۔''اپنے الفاظ کی تصیح کرتے ہوئے وہ ان کی جانب لپکے۔وہ کبھی ایک دوسرے کو لڑکا نہیں کہتے تھے۔"

اچھا سنو تو"۔وہ سیڑھیاں اتر رہے تھے جب میجر ارتضی نے انہیں پیچھے سے جا لیا۔"

" لگتا ہے کہ تمہارا یہاں رات رہنے کا ارادہ ہے تو میں معافی چاہتا ہوں کیونکہ میں اکیلے رہنا چاہتا ہوں۔"

دوٹوک جواب دیتے ہوئے وہ سیڑھیاں اتر کر ہال میں آ گئے۔

تو تم چلے جاؤ۔میں کیوں جاؤں یہاں سے ۔ میں تو آج یہیں رہوں گا تمہارے ساتھ ۔"وہ ان کے سامنے والے صوفے پر ڈھیٹ بن کر بیٹھ گئے۔"

لاتضی میرا دماغ خراب نہ کرو"۔لہجے کو دھیما رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔"

"جناب وہ تو پہلے ہی خراب ہو چکا ہے۔ میں تو ٹھیک کرنے آیا ہوں۔"

شرارت سے مرمر اکے سمندر میں بھنور مزید گہرے ہوئے تھے۔

جاتے ہو یا پھر ہاتھ پکڑ کر باہر چھوڑ کر آؤں ؟"ا یک ایک لفظ چباچبا کر ادا کیا گیا تھا۔"

اگر گود میں اٹھا کر کر چھوڑ کر آ سکتے ہو ٹھیک ہے ورنہ چپ چاپ یہیں بیٹھے رہو"۔مچلتی مسکراہٹ لبوں کو چھو کر بھنوروں کی جانب بڑھی تھی۔"

میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میجر بلال کو اس وقت میجر لاتضی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔"

تو تمہیں کیا لگتاہے کہ میں یہاں جو کربن کر آیا ہوں؟"وہ چاہتے تھے کہ میجر بلال کادھیان تھوڑی دیر کے لیے ابرش سے ہٹے بے شک وہ ان سے لڑائی ہی کرلیں۔"

آخرمسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ ؟" کھاجانے والی نظریں میجر ارتضی کے چہرے سے ٹکرائی تھیں۔"

یہ میرا سوال تھا۔"میجر لاتضی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔"

حد سے زیادہ ڈھیٹ ہو گیا ہے تو۔"میجر بلال کو اپنا غصہ رائیگاں جاتے دکھائی دیا۔"

یہ ہی میں تمہیں کہنے والا تھا لیکن تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔"آنکھیں شرارت سے چھوٹی ہوئی تھیں۔"

بھاڑ میں جاؤ تم۔"میجر بلال نے کشن میجر لاتضی کو دے مارا۔"

اکٹھے چلتے ہیں نا۔یقین جانو بہت مزا آئے گا۔"کشن کو کیچ کرتے ہوئے وہ محظوظ ہوئے تھے۔"

وہ جگہ صرف تمہارے لیے ہی بنائی گئی ہے ۔"میجر بلال کا بس نہیں چل رہا تھا۔"

لیکن دوست ہونے کے ناطے میں وہ آدھی تمہیں دے دوں گا۔کیا یاد کرو گے کہ کس دوست سے پالا پڑا تھا۔"انہوں نے فرضی کالر کھڑے کیے۔جوابا میجر بلال غصہ پی کر رہ گئے۔"

"اچھا چلو اٹھو۔آنٹی کے لیے کھانا بناتے ہیں۔انہوں نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ان کی طبیعت بھی نہیں ٹھیک۔کھانے کے بعد انہیں میڈیسن دے کر چلا جاؤں گا۔ڈونٹ وری۔ "

میجر ارتضی سمجھ چکے تھے کہ میجر بلال کو ان کی موجودگی ناگوار گزر رہی تھی۔وہ انہیں ہاتھ سے پکڑ کر کیچن میں لے آئے۔

اس گھر کی ہر چیز سے مجھے ابرش کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ میں پاگل سا ہونے لگتا ہوں۔"وہ کیچن میں رکھی ہر چیز کو بغور دیکھ رہے تھے۔ابرش نے ہر چیز کو سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔"

کوئی بات نہیں۔اب میرے جانے کےبعد تمہیں اس کیچن میں صرف میری جھلک دکھائی دے گی"۔ میجر لاتضی کسی بات کو سنجیدہ لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔"

خبردار گر کسی چیز کو بھی ادھر سے ادھر کیا تو۔"میجر بلال نے میجر لاتضی کا بازو مروڑ کر انہیں" جھٹکا دیا۔

میجر ارتضی نے پھرتی دکھاتے ہوئے انکے گھٹنے کے قریب پاؤں پہ ضرب لگائی اورسرعت سے خود کو چھڑاتے ہوئے انہیں گردن سے دبوچ لیا۔

”بیٹا کھانا پکانے کے لیے چیزوں کو ادھر سے ادھر تو کرنا ہی پڑے گا نا۔“ میجر ارتضی نے ان کی نقل اتارتے ہوئے ان کی گردن پر بازوؤں کا گھیرا مزید تنگ کیا۔

میجر بلال نے دونوں بازو سینے سے لگاتے ہوئے کمر سے پیچھے کی جانب زور سے دھکا لگایا۔ میجر ارتضی جھٹکا لگنے سے پیچھے شلیف سے ٹکرائے اور اسٹینڈ میں لگے سارے برتن زمین بوس ہو گئے۔

دونوں کی نگاہیں لاشعوری طور پر نیچے گرے برتنوں سے ٹکرائیں۔

”اب تمہں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ابرش کے ہاتھوں سے رکھے برتن میجر ارتضی نے پل بھر میں زمین بوس کر دیئے تھے۔

”دھکا تم نے مجھے دیا تھا۔“ میجر ارتضی نے اسٹینڈ پر باقی بچ جانے والی چھری ہاتھ میں لیکر اپنا دفاع کیا۔

”تو تم نیچے گر جاتے۔برتنوں سے کیوں ٹکرائے؟“ میجر بلال نے برق سی تیزی سے نیچے سے ساس پین اٹھایا۔انہوں نے ان برتنوں کو ہاتھ میں تلوار کی طرح پکڑ رکھا تھا۔

”تو تم مجھے پہلے بتا دیتے کہ ٹکرانا نہیں،زمین پر گرنا ہے۔“ میجر لاتضی کو ساس پین کے مقابلے میں چھری چھوٹی لگی اس لیے انہوں نے نیچے سے کفگیر بھی اٹھالی۔ جسے اٹھاتے ہی نہیں کسی بڑے ہتھیار کے ہاتھ میں آنے کا احساس ہوا تھا۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ تم سیدھا ان برتنوں پر حملہ کرو گے۔“ میجر لاتضی نے ساس پین گھماتے ہوئے میجر لاتضی پر حملہ کیا۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں پتا تھا۔“ ساس پین کا حملہ انہوں نے کفگیر سے روکا تھا۔

یہ تمہیں دھکا دینے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹے۔

”تمہیں ٹکرانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ وہاں اب جنگ کا محاذ گرم ہو چکا تھا۔

”جب تم نے نہیں سوچا تھا تو میں کیوں سوچتا۔“ وہ کفگیر کو تلوار کے سے انداز میں لہرا رہے تھے لیکن میجر بلال نے ساس پین سے حملہ کر کے انہیں نہتہ کر دیا۔وہ اب شلیف کے ساتھ چپک گئے تھے۔

”ب کدھر جاؤ گے بیٹا؟“ ایک فاتحانہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر ابھری تھی۔

”جانا کہاں ہے۔۔۔۔۔ لیکن سچ بتاؤں میں آزاد کشمیر جانے کی سوچ رہا ہوں۔ تم بھی چلو ساتھ۔ایک دو ہفتے کی چھٹی مانگ لیتے ہیں۔تمہارے لیے چھٹی بھی میں لے لوں گا۔اس کی فکر نہ کرنا۔ میں نے سب سوچ رکھا ہے۔“ وہ تو سب کچھ پہلے ہی سوچ کر بیٹھے تھے۔

”تم جاؤ اکیلے۔مجھے کہیں نہیں جانا۔اور ہاں ان برتنوں کو سلیقے سے رکھ کر جانا۔“ ساس پین اس کے ہاتھ میں تھما کر وہ وہاں سے چلے گئے۔

”جاؤ گے تو تم بھی ساتھ میرے۔“ کچھ سوچتے ہوئے ان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری تھی۔وہ جھک کر برتن اٹھانے لگے۔برتن رکھنے کے بعد انہوں نے قریبی ہوٹل پہ فون کر کے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ میجر بلال کو تو کھانے پینے کا کچھ ہوش نہیں تھا۔س کٹھن وقت میں صرف میجر ارتضی ہی ان کو سنبھال سکتے تھے۔

(————)

ماریہ نے اپنے دوستوں کی مدد سے بہت سے تاریخی مقامات کی وڈیوز ڈرون کیمرے کے ذریعے ریکارڈ کر لی تھیں۔ٹورسٹ گائیڈرز کے تعاون سے اس نے ان جگہوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لی تھیں۔اب صرف ان معلومات کو ایک تھیسس کی شکل دینے کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔

اب ان کی اگلی منزل آزاد کشمیر تھا کیونکہ آرنلڈو گوں کی ڈاکومیٹری کا ایک بڑا حصہ اس وادی پر مشتمل ہونا تھا اور ماریہ کو شاردا پیتھ کے بارے میں کچھ معلومات چاہیے تھیں۔اس لیے انہوں نے آزاد کشمیر کی جانب اپنے سفر کا آغاز کیا۔

بلند پہاڑی سلسلے جنت کی حسین وادی میں آنے والوں کے لیے استقبل کرتے نظر آ رہے تھے۔راستے میں آنے والا ہر منظر پہلے منظر سے زیادہ خوبصورت تھا۔ پاکستان خوبصورت تھا وہ یہ دیکھ چکے تھے۔ لیکن اتنا خوبصورت پاکستان وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔قدرت کی خوبصورتی کی چمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ جیسے وہ سفر کسی طلسمی دنیا کی طرف کیا جا رہا ہو۔جس کا ہر منظر سحر طاری کر دینے والا تھا اور جس کے سحر سے رہائی ناممکن ہو۔

”واؤ۔۔۔کتنی خوبصورت جگہ ہے یہ۔“ وادیِ نیلم کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے۔

وہ جگہ کسی بھی فیری لینڈ سے کم نہ تھی۔ یہ پہلا خیال تھا جو ماریہ کے ذہن میں ابھرا تھا۔

”اٹس ہیون۔“ ٹالی مبہوت ہوتی نظر آ رہی تھی۔

لمبے سفر کی تھکن ان بلند پہاڑوں میں کہیں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ پہاڑ کی چوٹی پر موجود ٹورسٹ لاج کے سامنے کھڑے پوری وادی کو ایک نظر میں دیکھ سکتے تھے۔

اس گیسٹ ہاؤس کو انہوں نے اپنے آئندہ قیام کے لیے بک کروایا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک خوبصورت وادی کا خوبصورت لاج تھا۔ جو اس وادی کو جلا بخشنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

”آرنلڈ میرے دوست، مجھے تم پر فخر ہے کہ تم نے اس حسین جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ دیکھ لینا ہماری یہ ڈاکومیٹری دنیا کی بہترین ڈاکومیٹریز میں شمار ہو گی۔“ چارلس نے آرنلڈ کے انتخاب کو سراہا۔

”شکریہ دوست۔“ آرنلڈ نے اس تعریف کا جھک کر خیر مقدم کیا۔

”آسٹن تم اس دنیا کے سب سے بدقسمت شخص ہوتے اگر تم اس زمین کو اپنے قدموں تلے محسوس نہ کر پاتے۔“ چارلس نے آسٹن کا کندھا ہلایا جو کہ اس وادی کے سحر میں پوری طرح جکڑا جا چکا تھا۔

”ہاں واقعی۔“ ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہی وہ ہلکا سا مسکرایا۔ نیلی آنکھیں قدرت کے سحر میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

”چلو بھئی اب اندر چلتے ہیں۔“ ہوا میں شام کے پر پھیلاتے ہی خنکی بڑھنے لگی تھی۔ اونچائی زیادہ ہونے کی وجہ سے یہاں درجہ حرارت بہت کم تھا۔ اور اس مقام پر اچھی خاصی سردی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

ریسپشنسٹ سے چابیاں لیکر وہ اپنے کمروں میں آ گئے۔

ہمیشہ کی طرح ماریہ اور ٹالی ایک کمرے میں ٹھہری تھیں جبکہ ان تینوں نے اپنے لیے ایک ہی کمرہ مختص کروایا تھا۔

رات کا کھانا انہوں نے باقی سیاحوں کے ساتھ مل کر لاج کے ڈائننگ ہال میں ہی کھایا تھا۔

کافی پینے کے بعد وہ سب ایک دوسرے کو شب بخیر بولتے ہوئے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے۔

سفر کی تھکن نے انہیں جلد ہی گہری نیند کے حوالے کر دیا تھا۔

(———————)

بچھڑنے والے

چلے جو ہو تو بتا کے جاؤ۔۔۔۔

کہ کتنی شامیں اداس آنکھوں میں کاٹنی ہیں ؟

کہ کتنی صبحیں اکیلے پن میں گزارنی ہیں ؟

بتا کے جاؤ

کہ کتنے سورج عذاب رستوں کو دیکھنا ہے ؟

کہ کتنے مہتاب سرد راتوں کی وسعتوں سے نکالنے ہیں ؟

بتا کے جاؤ۔۔۔۔

کہ چاند راتوں میں وقت کیسے گزارنا ہے ؟

خاموش لمحوں میں تجھ کو کتنا پکارنا ہے ؟

بتا کے جاؤ۔۔۔۔

کہ کتنے لمحے شمار کرنے ہیں ہجرتوں کے ؟

کہ کتنے موسم اک ایک کر کے جدائیوں میں گزارنے ہیں ؟

بتا کے جاؤ۔۔۔۔

کہ پنچھیوں نے اکیلے پن کا سبب جو پوچھا

تو کیا کہوں گا۔۔۔؟؟؟

کسی نے رستے میں روک کر جو مجھ سے پوچھا

کہ پچھلے موسم میں سائے سائے جو اجنبی تھا۔۔۔

کہاں گیا ہے۔۔۔۔؟؟

تو کیا کہوں گا۔۔۔۔؟؟

بتا کے جاؤ۔۔۔۔۔

میں کس سے تیرا گلہ کروں گا؟

بچھڑ کے تجھ سے۔۔۔۔۔ کس سے ملا کروں گا؟

بتا کے جاؤ کہ آنکھ برسی تو کون موتی چنا کرے گا؟

اداس لمحوں میں دل کی دھڑکن سنا کرے گا؟

بتا کے جاؤ کہ موسموں کو پیام دینے ہیں ؟ یا نہیں ؟

فلک کو، تاروں کو، جگنوؤں کو سلام دینے ہیں۔۔۔؟ یا نہیں ؟

بتا کے جاؤ۔۔۔۔

کہ کس پہ ہے اعتبار کرنا؟

تو کس کی باتوں پہ بے نیازی کے سلسلے اختیار کرنا؟

بتا کے جاؤ کہ اب رویوں کی چال کیا ہو؟

جواب کیا ہو؟۔۔۔سوال کیا ہو ؟۔۔۔

عروج کیا ہو ؟۔۔۔،زوال کیا ہو؟۔۔۔

نگاہ، رخسار، زلف، چہرہ.. نڈھال کیا ہو؟

بتا کے جاؤ۔۔۔۔۔

کہ میری حالت پہ چاندنی کھلکھلا پڑی تو

میں کیا کروں گا۔۔؟؟

بتا کے جاؤ۔۔۔۔

کہ میری صورت پہ تیرگی مسکرا پڑی تو

میں کیا کروں گا۔۔۔؟؟

بتا کے جاؤ

کہ تم کو کتنا پکارنا ہے؟

بچھڑ کے تجھ سے یہ وقت کیسے گزارنا ہے؟

اجاڑنا ہے۔۔۔۔؟ نکھارنا ہے۔۔۔؟

بدن کو کتنا سوارنا ہے۔۔۔؟

چلے جو ہو تو۔۔۔۔۔۔

بتا کے جاؤ۔۔۔۔۔!!

کہ لَوٹنا بھی ہے۔۔۔؟؟ یا۔۔۔۔۔۔!!

ہرش سے شادی کی بعد وہ پہلی دفعہ اسی جگہ پر آئے تھے جہاں وہ جان سے پیاری پہلی دفعہ نگاہ کے حصار میں آئی تھی۔

اس سنگی بنچ پر بیٹھے ان دونوں نے کتنی یادیں رقم کی تھیں۔ سنگی بنچ پر بیٹھتے ہی ماضی کی کتاب کھلی او حسین یادوں کے باب پڑھے جانے لگے تھے۔

سامنے کیچڑ میں گری وہ معصوم سی پری پہلی نظر میں انہیں اپنا گرویدہ کر گئی تھی۔

اسی سنگی بنچ کے قریب اس نے غصے میں آ کر ان کی ناک پر کتاب ماری تھی۔ جیسے وہ ہمیشہ کرتی تھی۔ حق جتاتے ہوئے اپنا غصہ میجر بلال پر اتارتی تھی۔

پھر اسی سنگی بنچ پر وہ نادم سی سر جھکائے ان سے معافی مانگنے آئی تھی۔ کوئی اس وقت ان سے پوچھتا کہ حسن کیا ہے؟ تو میجر بلال یقیناً حسن کی تعریف میں ابرش کا نام لیتے۔

کالج جانے سے پہلے وہ دونوں اس سنگی بنچ پر بیٹھ کر خوبصورت لمحات کو اپنی زندگی کی کتاب میں لکھتے۔ وہاں کا ہر منظر ان دونوں کا عادی ہو چکا تھا۔ شیدٖ کسی نے بھی تصور نہیں کیا تھا کہ محبت کے ان پنچھیوں میں سے کوئی ایک یوں اڑ جائے گا سوچا تو ان پنچھیوں نے بھی نہیں تھا۔ لیکن ایسا کب ہوا ہے کہ جو ہم نہ سوچیں وہ حقیقیت میں بھی کبھی نہ ہو۔

سنگی بنچ پر بیٹھے وہ ہر چیز کو آخری بار دیکھ رہے تھے۔ وہ دوبارہ ان جگہوں پر لوٹ کر نہیں آنا چاہتے تھے۔ ہر منظر سوگوار دکھائی دے رہا تھا۔

اذیت سے دوچلا کر دینے والا۔۔۔

ماتم میں مگن۔۔۔

دل کا بوجھ بڑھنے لگا تھا۔

"بلال آپ خود کو کبھی بھی اکیلا مت سمجھیے گا۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گی۔ لیکن وعدہ کیجیے کہ آپ اپنی مسکراہٹ سے کبھی ناطہ نہیں توڑیں گے۔۔۔"

ہرش کی آواز انہیں اپنے دائیں پہلو سے سنائی دی۔ انہوں نے گردن کو آواز کی جانب موڑا تو وہاں ابرش کالج کا یونیفارم پہنے مسکرا رہی تھی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم کبھی بھی میرے چہرے سے مسکراہٹ کو جدا نہیں دیکھو گی۔ لیکن خدا کے لیے مجھے معف کر دو۔ اگر میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل نہ کرتا تو شاید ہماری زندگی میں یہ حادثہ پیش نہ آتا۔" وہ اس کے پرسکون چہرے پر نظریں گاڑے پچھتاوے کی دلدل میں دھنس رہے تھے۔ وہ اس واقعے کا خود کو قصوروار سمجھ رہے تھے۔ نہ وہ ابرش سے شادی کرتے اور نہ ابرش کو اس اذیت سے دوچار ہونا پڑتا۔

"مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو فخر ہے کہ میں آپ جیسے انسان کی بیوی ہوں۔ آپ اس بھنور سے باہر نکل آئیں۔ ابھی بہت لمبا سفر پڑا ہے۔ ایک نئی زندگی آپ کی منتظر ہے۔ یوں ہمت ہار جائیں گے تو اس دھرتی کے دشمنوں کو انجام تک کیسے پہنچا پائیں گے۔ اس ملک کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ لوٹ جائیں واپس۔۔۔۔" سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

وہ حیران سے اس کے پرسکون چہرے کو تکتے رہے۔

"چلیں اب مسکرا کر دکھائیں۔" وہ ان کی مسکراہٹ کی منتظر تھی۔

اس کو یوں پرسکون دیکھ کر یکدلکش مسکراہٹ ان کے چہرے پر حق جتانے آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ پہلی حالت میں لوٹ آیا۔ منظر وہی تھا لیکن اس میں سے ابرش کہیں تحلیل ہو گئی تھی۔

اس کا عکس تھا جو اس جگہ پر بھٹک رہا تھا۔

مراد پوری ہونے پر وہ عکس مٹ گیا تھا۔

شاید ہمیشہ کے لیے۔

ایک لمبی سانس لیتے ہوئے وہ وہاں سے چل دیئے۔

نئی منزل کے نئے سفر کے لیے۔

ہرش سے کئے گئے وعدے کو نبھانے کے لیے۔۔۔ منظر نے اس پنچھی کو نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا اور اس کے کامیاب لوٹ کر آنے کے لیے سر بسجدہ ہو گیا۔

(____________________)

رات بھر پرسکون نیند لینے کے بعد ان کی آنکھ گیارہ بجے کے قریب کھلی۔

صبح کے اس سلطنت پر قدم رکھتے ہی لاج میں سیاحوں کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ بادلوں کی وجہ سے دھوپ اس وادی کے قدم چھونے سے محروم نظر آ رہی تھی۔

وہ سب ناشتے کی غرض سے لاج کے ہال میں آ گئے۔ ہیٹرز چلنے کی وجہ سے ہال کا ماحول قدرے گرم تھا۔ ہر طرف ویٹرز اور سیاحوں کی "صبح بخیر، صبح بخیر" کی صدائیں ماحول کو عجب رونق بخش رہی تھیں۔ کچھ سیاح ناشتہ کر کے جا چکے تھے۔ اور کچھ ابھی اپنے آرڈرز درج کروا رہے تھے۔ وہ سب بھی ایک ٹیبل کے گرد لگی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

"صبح بخیر۔" لاج کی ایک خوبصورت ویٹرس نے ان کی ٹیبل کے قریب آ کر ایک خوبصورت صبح کی نوید دی۔

"صبح بخیر۔" چالس اپنا ٹھرکی پن روک نہ پایا۔ اس کی اس حرکت پر سب نے اسے گھورا۔

"آپ کیا لینا پسند کریں گے؟" اس نے ناشتے کے متعلق سوال کیا۔ ان سب نے اسے اپنی اپنی پسند کی چیزیں لکھوا دیں۔ آرڈر نوٹ کرنے کے بعد وہ وہاں سے چلی گئی۔ اس نے وہ آرڈر ایک ویٹر کو فارورڈ کیا اور خود ایک دوسری ٹیبل پر بیٹھے ایک کپل سے آرڈر لینے لگی۔

"آج کا کیا پروگرام ہے؟" ناشتہ آنے میں دیر تھی اس لیے وہ وقت گزاری کے لیے آپس میں گپ شپ لگانے لگے۔

"ڈاکومینٹری اسی جگہ سے شروع کرتے ہیں۔" آرنلڈ نے اسٹارٹنگ کا بتایا۔

"ہمم۔۔۔ٹھیک ہے۔" وہ سب متفق ہوئے۔

"ٹالی تم نے اسکرپٹ لکھ لیا؟" آسٹن کو یہ اہم بات اب یاد آئی تھی۔

"ہاں شروعات کے لیے تقریبا مکمل ہو چکا ہے۔باقی کا ساتھ ساتھ لکھ لوں گی۔اب مجھے ان جگہوں کا کوئی خاص اندازہ بھی نہیں ہے۔" اس ڈاکومینٹری کے لیے اسکرپٹ لکھنے کا کام ٹالی کو سونپا گیا تھا۔

"اوکے۔" ویٹر ناشتہ سرو کر کے جا چکا تھا۔وہ سب ناشتہ کرنے میں مگن ہو گئے۔گپ شپ کا سلسلہ بھی ساتھ میں جاری تھا۔

(　　　　　　　　　　　　)

تیری وادی وادی گھوموں

تیرا کونا کونا چوموں

تو میرا دلبر جان۔۔۔

تو میرا پاکستان

تو میرا دلبر جان۔۔۔

"یار بس کر دے۔تجھے کیا صرف یہی نغمہ آتا ہے؟اب تو یہ مجھے بھی یاد ہو گیا ہے۔ "میجر ارتضی جیپ ڈرائیو کر رہے تھے اور آزاد کشمیر جانے کی خوشی میں یہی نغمہ بار بار گنگنا رہے تھے۔جس سے میجر بلال تنگ آ چکے تھے۔

"یہ ہی تو میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بھی اس ملک کے گیت یاد ہو جائیں۔" وہ ان کی اس حالت سے محظوظ ہوئے تھے۔

"تو کیا بس یہی نغمہ یاد کروانا ہے؟" چہرے پر بیزاریت نمایاں تھی۔

"ہاہاہاہا۔۔۔نہیں میری جان یہ تو ابتدائیہ ہے۔" پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے جیپ جھٹکے کھا رہی تھی۔

"تو یہ کام ٹیپ کی مدد سے بھی تو کیا جا سکتا ہے نا تم کیوں اپنا گلا پھاڑنے کی زحمت کر رہے ہو۔" میجر بلال کچھ زیادہ ہی بیزار ہو چکے تھے۔

"ہمیشہ اوریجنل چیزوں کو ترجیح دیا کرو میری جان۔میری اوریجنل وائس کے آگے بڑے بڑے گلوکار کیا چیز ہیں۔" انہوں نے شیخی بگاڑی۔

"یہ دیکھ ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے آگے۔ میں مزید تمہاری اوریجنل وائس نہیں سن سکتا۔" میجر بلال نے مجبور ہو کر ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"ہاہاہاہاہاہا۔۔۔کیا یاد کرو گے۔لگا لو ٹیپ۔مگر خراب نہ کر دینا یہ جیپ اپنی نہیں ہے۔" آخر میجر ارتضی کو ان پر ترس آ ہی گیا۔

"کوئی بات نہیں۔اب ہم بیٹھے ہیں اس پر تو سمجھو کہ یہ ہماری ہی ہے۔" انہوں نے ایک آنکھ دباتے ہوئے ٹیپ آن کر دی۔

"اتنا معصوم تو ہے نہیں جتنا شکل سے نظر آتا ہے۔"میجر ارتضی کو ان کی معصومیت داغداری نظر آئی۔

جانے وہ کیسے لوگ تھے

جن کے پیار کو پیار ملا

ہم نے تو کلیاں مانگیں

کانٹوں کا ہار ملا۔۔۔۔

"پتا نہیں یہ کس دکھی آتما کی جیپ ہے۔" میجر ارتضی نے گانا تبدیل کر دیا۔

"لگا رہنے دو۔" یہ میجر بلال کا پسندیدہ گانا تھا۔

"میں فی الحال ایسے گانے نہیں سن سکتا۔" میجر ارتضی نے دوٹوک کہا۔

وکرم خدا یا ہے۔۔۔

تجھے مجھ سے ملایا ہے۔۔۔۔

تجھ پہ مر کے ہی تو۔۔۔۔

مجھے جینا آیا ہے۔۔۔۔

"اور میں تمہاری پسند کا نہیں سن سکتا۔" دشمنی میں گانا بدل دیا گیا۔

خوشیوں کی منزل ڈھونڈی

تو غم کی گرد ملی۔۔۔۔۔۔

چاہت کے نغمے چاہے

تو آہیں سرد ملیں۔۔۔۔

دل کے بوجھ کو دونا کر گیا

جو غمخوار ملا۔۔۔۔۔۔

"میں بتا رہا ہوں میرے موڈ کو خراب نہ کرو۔" میجر ارتضی نے وارننگ دیتے ہوئے پھر گانا تبدیل کر دیا۔

کہیں کسی بھی گلی میں جاؤں میں

تیری خوشبو سے ٹکراؤں میں۔۔۔۔

ہر رات جو آتا ہے مجھے وہ خواب تو۔۔۔

تیرا میرا ملنا دستور رہے۔۔۔

تیرے ہونے سے مجھ میں نور رہے۔۔

میں ہوں سونا سا اک آسمان، مہتاب تو۔۔۔

"بس اب میری باری۔" مچلتی شوخی کو چھپاتے ہوئے میجر بلال نے گانا بیک ورڈ کر دیا۔

بچھڑ گیا۔۔۔

بچھڑ گیا۔۔

بچھڑ گیا ہر ساتھی دے کر پل دو پل کا ساتھ

کس کو فرصت ہے جو تھامے دیوانوں کا ہاتھ

''میں نے تمہیں اب جیپ سے گرا دینا ہے۔'' بچوں جیسی دھمکی دیتے ہوئے انہوں نے گانا فارورڈ کر دیا۔

وکرم خدا یا ہے

تجھے میں نے جو پایا ہے۔۔۔

تجھ پہ مر کے ہی تو۔۔۔۔

مجھے جینا آیا ہے۔۔۔

او تیرے سنگ یارا۔۔۔۔

خوش رنگ بہارا۔۔۔

تو رات دیوانی۔۔۔۔

میں زرد ستارہ۔۔۔

میجر ارتضی میجر بلال کی گانا بدلنے کی کوشش ناکام بنا رہے تھے۔

''چلو ٹھیک ہے ۔میں کوئی اور گانا لگا لیتا ہوں۔لیکن برائے مہربانی تم ڈرائیونگ پر دھیان دو۔گانوں پر دھیان کے لیے میں موجود ہوں۔'' جیپ ان کی اس جھڑپ کی وجہ سے جھٹکے کھا رہی تھی۔

باتیں تیری کرتے ہوئے

تھک کے سو جاتی ہوں سرہانے آسمان۔۔۔

جانے کہاں مڑ جاتی ہیں

دیکھتے دیکھتے تجھے یہ گلیاں۔۔۔۔

تیری طرح خوشبو چلے

تارے ہماری طرح راتوں سے ملے۔۔۔

سنی نہیں۔۔۔۔

زمانے نے تیری میری کہانیاں۔۔۔

کر دے کوئی

نوازشیں، کرم، مہربانیاں

'' کیا ہو گیا ہے بلال؟ کوئی فاسٹ سونگ لگاؤ تا کہ جیپ بھی فاسٹ چلے۔ صبح سے اسی جگہ پہ گھومے جا رہے ہیں۔'' میجر ارتضی سفر کے دوران زیادہ تر فاسٹ میوزک سنتے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ اس سفر کو خاموشی سے ہی کاٹ لینا چاہیے۔'' میجر بلال گانے بدل بدل کر تنگ آ چکے تھے۔

''یہ میرے لیے تو ناممکن ہے۔لیکن اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنی آواز میں خوبصورت گانے سنا سکتا ہوں۔'' میجر ارتضی نے آفر کی۔

''دیکھ بھائی۔۔۔تو آج کے دن کے لیے اپنے اندر کے سنگر کو مار دے۔'' مسکراہٹ کو لبوں تلے دھکیلتے وہ باہر دیکھنے لگے۔

''اچھا جیسے تیری خوشی۔'' چہرے پر جہاں بھر کی معصومیت اٹھ آئی تھی۔

سفر خاموشی سے کٹنے لگا۔ہر منظر پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا۔ نئے قدم پر نیا منظر منتظر دکھائی دے رہا تھا۔

تیری وادی وادی گھوموں

تیرا کونا کونا چوموں۔۔۔

تو میرا دلبر جان۔۔۔۔

تو میرا پاکستان۔۔۔۔

تو میرا دلبر جان۔۔۔

''اللہ۔۔۔۔ڈھیٹ آدمی تم پھر شروع ہو گئے ہو۔'' میجر بلال سر پیٹ کر رہ گئے۔

''تو تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں تمہارے ایک دفعہ کہنے سے اپنے اندر کے سنگر کا قتل کر دوں گا؟ میں تو اپنے گلے کو آرام دے رہا تھا۔تم اپنے کان بند کر لو۔میں کیوں اپنی زبان بند کروں۔'' جانے یہ نان اسٹاپ بولنے والے جراثیم میجر ارتضی کو کہاں سے لگ گئے تھے۔

''اف۔۔۔ تمہیں اپنے ساتھ لا کر میں نے سب سے بڑی غلطی کی ہے۔'' میجر بلال کی اس بات پر میجر ارتضی کے پاؤں نے بریکس پر وزن ڈالا اور جیپ جھٹکے سے رک گئی۔

''ہائے رے ہم صدقے تمہارے۔۔۔۔۔ تمہیں میں اپنے ساتھ لایا ہوں نہ کہ تم مجھے۔ ''وہ لڑنے کے سے انداز میں پوری طرح ان کی طرف گھوم گئے۔

''اچھا لڑنے کیوں لگے ہو؟'' میجر بلال کے چہرے پر شرارت سے مسکراہٹ ابھری۔

''میں تمہیں بتا رہا ہوں بلال کہ اب اگر تم میرے گانے کے دوران بولے تو میں نے سچ میں تمہیں جیپ سے گرا دینا ہے۔سکون سے گانے بھی نہیں دیتے۔میری آواز کا دشمن۔'' میجر ارتضی نے لاسٹ وارننگ دیتے ہوئے اسٹیئرنگ کو تھام لیا۔

''ہاہاہاہا۔۔۔ٹھیک ہے۔۔۔لیکن خدا کے لیے یہ ''کونا کونا'' نہ گانا۔'' میجر بلال نے ہار مان لی کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کسی بھی کام کی توقع کر سکتے تھے۔

دنیا ہمیں اب جو کہے
دنیا کی رسموں کو توڑ توڑ چلیں
راہیں ہمیں اب جو کہیں
راہوں کی بانہوں کو چھوڑ چھوڑ چلیں

جیپ خوبصورت وادی کی جانب رواں دواں تھی۔ بہت ہی جلد وہ نیلم ڈویژن میں پہنچنے والے تھے۔

(__________)

تقریباً ایک بجے کے قریب وہ دونوں شاردا گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے تھے۔مظفر آباد سے نکلتے ہوئے انہوں نے اس گیسٹ ہاؤس میں اپنے لیے بکنگ کروالی تھی۔

"لیں جناب ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں۔'' گیسٹ ہاؤس پہاڑ پر ذرا بلندی پر موجود تھا۔پارکنگ ایریا میں جیپ کھڑی کر کے وہ جیپ سے اتر آئے۔

"تم میرا سامان اٹھاؤ گے یا میں خود ہی اٹھالوں؟" میجر ارتضٰی کا معصومانہ سوال۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں خود ہی اٹھانا چاہیے۔'' جیکٹ کی زپ بند کرتے ہوئے انہوں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"تم ہمیشہ میری امیدوں پہ پورا اترتے ہو۔آئی لائک اٹ۔'' اتنی عزت افزائی پر انہوں نے خود ہی پچھلی سیٹوں سے اپنا سامان اٹھالیا۔

بیگ اٹھاتے ہوئے ایک افسردہ سی مسکراہٹ میجر بلال کے چہرے پر نمودار ہوئی۔

" کیا ہوا؟'' میجر ارتضٰی کا بیگ اٹھاتا ہاتھ پل بھر کو رکا۔

"آہ۔۔۔۔آنا کس کے ساتھ چاہتا تھا اور آ کس کے ساتھ گیا ہوں۔'' ایک لمبی سانس لیتے ہوئے ان کے ذہن میں ابرش کا چہرہ ابھرا تھا۔

"آہ۔۔۔۔ میں بھی کس کے ساتھ آنا چاہتا تھا لیکن آ کس کے ساتھ گیا ہوں۔'' میجر ارتضٰی نے میجر بلال کا انداز نقل کیا۔

"لیکن خیر۔۔۔جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔'' افسردگی کی کمال اداکاری کرتے ہوئے انہوں نے میجر بلال کو آگے کی جانب دھکیلا۔ان کے اس انداز پر میجر بلال کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ہاہاہاہا۔۔۔۔۔۔این آئیڈیل کپل۔(ideal couple an)۔'' میجر بلال نے میجر ارتضٰی کا بازو اپنے بازو میں لیتے ہوئے ہاتھ سے سیلفی بنائی۔

"دیکھ لینا کہیں ہمارے کپل کو نظر ہی نہ لگ جائے۔'' وہ دونوں پہاڑ پر چڑھنے لگے۔

"تمہارے ہوتے ہوئے نہیں لگتی۔'' گیسٹ ہاؤس پہنچ کر وہ پل بھر کو رکے۔

"آئی لو یو شاردا۔'' پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے میجر ارتضٰی نے شاردا کی خوبصورتی کو فلائنگ کس کی۔ میجر بلال کو شاک لگا اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

"ہاہاہاہا۔۔۔۔۔۔شاردا کہا ہے؟میں سمجھا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔'' ہنستے ہوئے انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا۔

"کیا سمجھا تھا تو؟'' میجر ارتضٰی ان کی اس حرکت کو سمجھ نہ پائے۔

"میں سمجھا کہ شاید تم نے آئی لو یو شاہدہ کہا ہے۔'' ہنستے ہنستے ان کے جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

"ہاں ہاں۔۔میرے لیے تو اب شاہدہ ہی رہ گئی ہے آئی لو یو بولنے کے لیے۔'' مصنوعی خفگی سے کہتے ہوئے وہ بھی اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ پائے۔

"ہاہاہاہا۔۔۔۔" میجر بلال کا خوبصورت قہقہہ شاردا کی وادی میں گونجا تھا۔

''سچ کہوں بلال تم ہنستے مسکراتے ہی اچھے لگتے ہو۔'' دوست کو یوں خوش دیکھ کر انہیں حقیقی معنوں میں خوشی ہوئی تھی۔

"پتا ہے مجھے۔'' انہوں نے جھک کر بیگ اٹھایا۔

"چلو بھی اب۔'' انہوں نے میجر ارتضٰی کو کہنی سے جھٹکا دیا جو کہ محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے دوست کے قہقہے میں کھو گئے تھے۔

وہ بھی میجر بلال کے پیچھے چل دیے۔

(____________________)

تین گھنٹے ریسٹ کرنے کے بعد وہ شاردا پیتھ کی جانب آ گئے۔انہیں بمشکل ایک ہفتے کی چھٹی ملی تھی۔اس لیے وہ ان دنوں کو آرام میں نہیں گزار سکتے تھے۔شاردا پیتھ اس وادی کا سب سے مشہور مقام تھا۔ یہ جگہ خاص طور پر ہندوؤں کے لیے مذہبی اہمیت رکھتی تھی کیونکہ یہاں ان کے قدیم مندر موجود تھے۔

میجر بلال اور میجر ارتضٰی باقی سیاحوں کی طرح وہاں کے ایک ایک منظر کو اپنے موبائل کے کیمرے کی آنکھ سے قید کر رہے تھے۔شاردا یونیورسٹی کی تصویر لیتے ہوئے میجر ارتضٰی کی آنکھیں پل بھر کو پلک جھپکنا بھول گئی تھیں۔

"بلال۔'' انہوں نے اسی سحر میں جکڑے ہی میجر بلال کو آواز دی جو کہ کچھ غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ تصاویر لے رہے تھے۔

" کیا ہے؟'' ماتھے پر بل ڈالے وہ ان کی جانب متوجہ ہوئے۔کیونکہ میجر ارتضٰی انہیں بار بار تنگ کر رہے تھے۔

"یار پریاں تو صرف سیف الملوک پہ ہی نہیں اترا کرتیں؟'' انہوں نے حیرت میں ڈوبے میجر بلال سے استفسار کیا۔نگاہیں ابھی بھی موبائل کی اسکرین پر مرکوز تھیں جہاں پر بیک کیمرہ چل رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔۔'' میجر بلال نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

" تو پھر یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟'' ان کے منہ سے لاشعوری طور پر یہ پھسلا تھا۔

"دماغ چل گیا ہے تیرا؟ کون یہاں کیا کر رہی ہے؟'' میجر بلال نے ان کے ہاتھ سے موبائل چھینا۔ کیمرے کا رخ زمین کی جانب ہو گیا تھا سوائے ان کے پیروں کے اسکرین پر اور کچھ نہیں شو رہا تھا۔

میجر ارتضٰی نے موبائل چھن جانے کے بعد پہلی دفعہ آنکھ اٹھا کر اس جگہ کی جانب دیکھا تھا جہاں پر وہ پرستان کی پری بھٹک کر آ کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے لمبے لمبے بال شاردا کے جھرنوں کی طرح اس کی کمر پر گرے ہوئے تھے۔اور کچھ آوارہ لٹیں شاردا کی ہواؤں کے سنگ ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔وہ ہاتھ میں موبائل پکڑے ایک ٹورسٹ گائیڈر کی آواز ریکارڈ کر رہی تھی جو شاید اسے اس جگہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔

میجر بلال نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا۔انہیں حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ میجر ارتضٰی نے آج سے پہلے کسی لڑکی کو اس طرح نہیں دیکھا تھا۔

"آہم،آہم۔۔۔'' معاملہ سمجھ جانے کے بعد میجر بلال نے انہیں ہوش کی دنیا میں واپس لانے کے لیے مخاطب کیا۔

"خیریت جناب؟'' میجر بلال نے ذو معنی لہجے میں پوچھا۔

''مطلب؟'' میجر ارتضٰی نظروں کا زاویہ بدل کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"یوں کسی کو اس طرح تاڑنے کا مطلب؟"

"میں کب کسی کو تاڑ رہا ہوں۔'' وہ انجان بنے تھے۔

" تو پھر یہ کیوں پوچھا کہ یہ پری یہاں کیا کر رہی ہے؟'' میجر بلال کہاں بات سے ٹلنے والے تھے۔

"اچھا وہ۔۔۔۔۔۔۔۔'' انہوں نے "وہ" کو کھینچا۔

"ہاں وہی۔۔۔'' میجر بلال سچ اگلوانے کا فن بخوبی جانتے تھے۔

''وہ تو اس موبائل میں پری نما کچھ نظر آیا تھا۔'' اس بات پر شاردا کی وادی نے ننھے ننھے گھڑوں کو گہرا ہوتے دیکھا تھا۔

"صرف موبائل میں ہی نظر آیا تھا؟'' میجر بلال کہاں پیچھا چھوڑنے والے تھے۔

"میرے باپ بس کر دے۔ ہر وقت شک کرتے رہتے ہو۔" میجر ارتضی نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ان سے غلطی ہوگئی تھی کہ انہیں آواز دے کر یہ بات پوچھ لی۔

"بیٹا تم سے کس نے کہا کہ میں شک کر رہا ہوں۔ مجھے تو یقین ہو رہا ہے۔" ایک شوخ سی مسکراہٹ میجر بلال کے لبوں پہ رینگی تھی۔

"چپ کر۔" میجر ارتضی نے انہیں ڈپٹا۔

"تمہاری پری ادھر ہی آ رہی ہے۔" اسے اس طرف آتا دیکھ کر میجر بلال نے شرارت سے کہا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" تپتے چہرے کے ساتھ انہوں نے دوبارہ کیمرہ آن کیا اور منظر کیپچر کرنے لگے۔

"ہاہاہاہا۔۔۔۔۔" میجر بلال قہقہہ ان کی سماعتوں کی نذر کرتے ہوئے تصویر کے لیے پوز بنانے لگے۔

(----------------)

آڈیوز کو سیو کرتے ہوئے وہ آسٹن لوگوں کی جانب جانے لگی جو کہ قریب ہی پہاڑ پر اپنی ڈاکومینٹری کا اسٹارٹ لے رہے تھے۔

کسی کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے قدم شاردا کی زمین نے جکڑ لیے تھے۔ شاردا کی اس حرکت پر لندن کی اس لڑکی کا دل زوروں سے دھڑکا تھا۔ دل کی اس گستاخی پر وہ پل بھر کو ٹھٹکی۔ ایڑیوں کے بل گھومتے ہوئے وہ پچھلے منظر کی جانب متوجہ ہوئی۔ جہاں دو مقامی سیاح ایک دوسرے کی تصاویر لے رہے تھے۔ اس کے یوں مڑ کر دیکھنے پر ان میں سے ایک نے اس کی طرف پل بھر کو دیکھا اور پھر موبائل کی جانب متوجہ ہوگیا۔

ایسا کیا تھا اس نظر میں کہ دل لمحہ بھر دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ شاردا کی وادی میں وقت کے ساتھ ساتھ سانس بھی تھم گئی تھی۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ شاردا کی زمین نے اس کے پاؤں پکڑ کر اسے اس جگہ کیوں روکا تھا۔ وہ اپنی جگہ پہ جکڑی جا چکی تھی۔ اس کے قدم ہلنے سے انکاری ہو چکے تھے۔ وہ نہیں ٹکٹکی باندھے دیکھے گئی تھی۔ اور پھر وہ اپنے دوست کو بازو سے کھینچتا وہاں سے لے گیا۔

اس کی پشت دیکھ کر اس کے دماغ میں وہی خواب والا اجنبی ابھرا تھا۔

وہی قد۔۔۔۔۔

بالوں کا وہی کٹ۔۔۔۔

وہ پورے کا پورا اس جیسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی لیکن شاردا کی زمین اس کے قدموں سے پوری طرح لپٹ چکی تھی۔

موبائل کی گھنٹی نے اسے شاردا کی قید سے رہائی دلائی۔

"ہیلو ماریہ۔۔۔ کہاں ہو یار؟ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" فون کے دوسری طرف آسٹن تھا جو کہ کب سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ میں بس آتی ہوں۔" اس کا جواب سنے بغیر اس نے کال کاٹ دی۔

نظریں دوبارہ اسی جگہ سے جا ٹکرائی تھیں جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھڑا تھا لیکن خواب کی طرح وہ پل بھر میں کہیں تحلیل ہوگیا تھا۔

"اففف۔۔۔ میں بھی پتا نہیں کیا کیا سوچنے لگتی ہوں۔" حقیقت کو خیال کا رنگ دے کر وہ وہاں سے چلی گئی۔

(----------------)

وہ جب سے شاردا یونیورسٹی سے آئی تھی اسی خیال کی گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ دماغ میں آنے والی سوچوں کی نفی کرتے کرتے وہ تھک چکی تھی۔ لیکن خیالات تھے کہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ ایک خیال کے بعد دوسرا خیال آ کر ڈیرہ جمالیتا۔

"ایسا تھوڑی ہوتا ہے کہ جو کچھ خواب میں دیکھا جائے وہ حقیقت بن جائے۔" آئینے کے سامنے کھڑی وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

"لیکن خواب حقیقت سے اتنی مشابہت بھی تو نہیں رکھتے۔" ایک اور جواب کی نفی۔

"یہ سب تمہارا وہم ہے ماریہ۔ ہر وقت خواب کے بارے میں سوچتی رہتی ہو اسی لیے حقیقت کا گمان ہوا تھا۔" اس نے خود کو مخاطب ہوتے ہوئے پایا۔

"افوہ۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ جن خوابوں پر آپ کا اختیار نہ ہو ان کے بارے میں اتنا نہیں سوچا کرتے۔" دھیان کو بٹاتے ہوئے وہ دوبارہ کاؤچ پہ آ کر بیٹھ گئی جہاں وہ کب سے اپنے تھیسس پر کام کرنے کا سوچ رہی تھی۔ آسٹن لوگ ابھی بھی اسی سپاٹ پر تھے۔ وہ ان سے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے لاج میں آ گئی تھی۔ وہ فی الحال انہیں اس واقعے کا نہیں بتانا چاہتی تھی۔

(----------------)

تیرا ہونے لگا ہوں
کھونے لگا ہوں
جب سے ملا ہوں
تیرا ہونے لگا ہوں

میجر بلال کافی دیر سے میجر ارتضی کو تنگ کرنے کے لیے یہ گانا بار بار گا رہے تھے۔

"تو کیوں عاطف اسلم کے گانوں کا ستیاناس مار رہا ہے؟" میجر ارتضی سے میجر بلال کی آواز میں گانوں کی اتنی بے حرمتی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"میں تو لوگوں کے دل کی حالت بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" شرارت سے سیٹی بجاتے ہوئے وہ شوخ ہوئے تھے۔

"اتنا بھونڈا گا کر تو صرف لوگوں کے دل کی حالت خراب کر رہا ہے۔" میجر ارتضی کی طرف سے میجر بلال کے گانے کو ان الفاظ میں سراہا گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے جو آج گلا خراب ہو گیا ہے۔ ورنہ دنیا تو اس آواز کی دیوانی ہے۔" ہمیشہ کی طرح وہ اپنے منہ میاں مٹھو بنے تھے۔

"ہاہاہاہا۔۔۔ بالکل۔۔۔" رات کا وقت تھا اور وہ دونوں شاردا پل پر مٹر گشت کر رہے تھے۔

"تو اور کیا۔ تم سے زیادہ اچھا گا لیتا ہوں۔" انہوں نے خود ہی اپنی گائیکی کو سراہا۔

"بھئی ہم کب اس حقیقت سے انکاری ہیں۔" سردی اپنے عروج پر تھی۔

"یار مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔" میجر بلال نے ہاتھوں کو آپس میں مسل کر گرم کرنے کی کوشش کی۔

"کیا؟" شاردا پل پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"یہی کہ وہ ہمیں اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہی تھی؟" میجر بلال اس موضوع پر بات کرنا چاہتے تھے۔

"شاید اس نے ہم جیسے خوبصورت لڑکے پہلے کبھی دیکھے نہ ہوں۔" انہوں نے اس بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

"ہاہاہاہا۔۔۔ بیٹا خوبصورت لڑکے نہیں، آدمی۔ لیکن مجھے اچھا لگا اپنے لیے لڑکے کا لفظ سن کر۔" دھند ہونے کی وجہ سے چاند کی چاندنی زمین پر نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ پل پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

"ہاہاہاہا۔۔۔ تجھے خوش کرنے کے لیے ہی میں نے ایسا کہا۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔" انہوں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا کیونکہ میجر بلال ان کا یہ ادھورا جملہ سمجھ چکے تھے۔

"ویسے کیوں اس نے دیکھا ہوگا۔" گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے وہ بات کو پھر اسی دائرے میں لے آئے۔

"ہمیں تو ہر کوئی یونہی مڑ کر دیکھتا ہے۔ یہ کوئی اتنی خاص بات تو نہیں ہے۔" انہوں نے ایک بار پھر شیخی بگھاری۔

"ہاں مڑ کر دیکھنے میں تو کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن دیکھنے کے انداز میں ضرور کوئی خاص بات تھی۔اور سب سے خاص بات تو یہ تھی کہ وہ دیکھ بھی تمہاری طرف رہی تھی۔'' لکڑی کے پل پر ان کے چلنے سے خاموش شاردا میں آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔

"کوئی حال نہیں ہے تمہارا۔'' میجر راتضی نے پاؤں کے نیچے آنے والے پتھر کو پاؤں کی ٹھوکر سے نیچے دریا میں پھینک دیا۔ ایک چھنا کے دار آواز آئی تھی۔

"اچھا چلو چھوڑو۔۔۔یہ تو بتاؤ کہ تم نے چھٹی کیسے لی؟'' میجر بلال اب تک ان سے یہ بات پوچھنا بھول گئے تھے۔

"یہ راز کی باتیں ہیں، راز ہی رہنے دو۔" وہ فی الحال انہیں اتنی لمبی تفصیل بتانے کے موڈ میں نہیں تھے۔

"لیکن یار تمہیں چھٹی نہیں لینی چاہیے تھی۔ آپریشن کے دن چل رہے ہیں۔'' میجر بلال کو یہ سب کچھ مناسب نہیں لگا تھا۔

"ہاں وہاں بھی تم نے پھر ابرش ابرش ہی کرتے رہنا تھا۔'' ایک تو میجر بلال ان کا کوئی احسان نہیں مانتے تھے۔

"تھوڑی تو شرم کر لیا کرو بے شرم آدمی۔'' میجر بلال کو ان کا یوں مذاق اڑانا اچھا نہیں لگا تھا۔

" کبھی ڈھیٹ آدمی تو کبھی بے شرم آدمی۔۔۔کبھی تو آدمی سے پہلے کوئی اچھا لفظ استعمل کر لیا کرو کمینے آدمی۔'' وہ کہاں میجر بلال سے کم تھے۔

"جیسے خود تو بہت مہذب لفظ استعمل کیا ہو۔'' انہیں بھی کمینے آدمی ناگوار گزرا تھا۔

''یہ تو پیار بھرا لفظ ہے۔''یہ کہہ کر انہوں نے میجر بلال کی گردن میں بایاں بازو ڈال دیا۔

"تیرا یہ پیار کسی دن میری جان لے لے گا۔'' میجر راتضی نے ان کی گردن دبا دی تھی۔

"ہاہاہاہا۔۔۔۔''شاردا کے پل پر دوستی کی حسین یادرقم ہوئی تھی۔ دھند بھری رات نے ان کی تاقیامت دوستی کے لیے دعا کی تھی۔

(________________)

حصہ ہفتم

ب کیسی طبیعت ہے تمہاری ماریہ؟"وہ سب ماریہ کے کمرے میں بیٹھے تھے جبھی آسٹن نے اس کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا۔

"ٹھیک ہوں۔'' وہ تکیہ دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"ریکارڈنگ ہوگئی؟'' چارلس نے اپنا اوور کوٹ اتارا۔

"ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا ہے۔'' ٹالی نے سائیڈ ٹیبل سے فون اٹھایا اور چائے کا آرڈر دینے لگی۔

" کل ہم دریائے نیلم کی شوٹنگ کریں گے۔ اس کے بعد ناران کاغان کی طرف موو کریں گے۔ یہ جگہ بہت اچھی ہے لیکن اگر ہم ایک ایک چیز کی شوٹنگ کریں گے تو ڈاکومیٹری بہت طویل ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے؟" آرنلڈ نے آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ ویسے بھی ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔ "ٹالی اس ساری گفتگو کے دوران پہلی دفعہ بولی تھی۔

"ماریہ اگر تمہاری ساری ریکارڈنگز مکمل ہو گئی ہوں تو تم واپس چلی جانا تمہاری ماما وہاں بہت پریشان ہیں۔ ہم لوگ کچھ دن بعد آجائیں گے۔'' آسٹن نے ماریہ کے چہرے کو دیکھا جس پر کوئی تاثر نہیں تھا اور وہ کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی۔

"بہتر۔'' اس کا انداز اب بھی ویسا ہی تھا۔

ویٹر کمرے میں چائے دے گیا تھا۔ وہ سب چائے سے محظوظ ہونے لگے۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ماریہ؟"وہ آسٹن تھا جو ماریہ کے لیے جلدی پریشان ہو جایا کرتا تھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' پتا نہیں وہ خود کو مطمئن کر رہی تھی یا پھر آسٹن کو۔

"چائے پینے کے بعد تم آرام کر لینا۔ نہیں تو یہاں کسی ڈاکٹر سے مل لیتے ہیں۔ دوائی سے جلدی آرام آجائے گا۔'' وہ کب اسے یوں بیمار سا دیکھ سکتا تھا۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ بس سر میں درد ہو رہا ہے۔ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ کنپٹی کو دائیں ہاتھ سے مسلنے لگی۔ جیسے وہاں سچ میں درد ہو رہا ہو۔

"جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ دوبارہ چائے پینے لگا۔ لیکن دھیان ابھی بھی ماریہ کی طبیعت کی جانب تھا۔

کیونکہ وہ آسٹن تھا۔

ماریہ نامی کتاب کو پڑھنے والا۔۔۔

سمجھنے والا۔۔۔۔

کہ اچھے دوست ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔۔۔

وہ سب اپنے اپنے پروگرامز کو ترتیب دینے لگے۔ ماریہ ان سب باتوں سے بیگانہ ہوئی تھی کیونکہ دل کسی اور کی جانب پلٹا تھا۔

(______)

شادرا کی سلطنت میں سردیوں کی ایک خوبصورت شام اتری تھی۔

ایسی شام کہ جس کا سحر ہر ذی نفس کو مسحور کر رہا تھا۔ بلند پہاڑوں پر دھند اپنی حکومت جمانے کے لیے بلندیوں سے اتر رہی تھی اور وہ تھے کہ اس دھند میں لپٹے ہی جا رہے تھے۔

رات نے اترنے سے پہلے شام کی صورت میں اپنی آمد کا پیغام دیا تھا۔

وہ دریا پر اپنی ڈاکومیٹری کا ایک حصہ تقریباً مکمل کر چکے تھے۔

"ماریہ کیوں چڑیلوں کی طرح بال کھول کر کھڑی ہو یہاں؟" یہ چارلس تھا جسے ماریہ کے لمبے بال اچھے نہیں لگتے تھے۔

"ہاں وہ میرا بینڈ گیسٹ ہاؤس میں ہی رہ گیا تھا۔'' ماریہ جو بلندی پر کھڑی تھی۔ نیچے اس کی جانب پلٹی۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ تمہیں بال کھولنا پسند نہیں تھا۔'' آسٹن بھی ان کی گفتگو میں شامل ہوا تھا۔

"تم لوگ اتنی جلدی ڈالتے ہو کہ میری آدھی چیزیں تو کمرے میں ہی رہ جاتی ہیں۔'' وہ مسکراہٹ سجائے ان کے قریب آچکی تھی۔

"اتنے پیارے تو بال ہیں ماریہ کے، بالکل راپنزل کی طرح۔'' ٹالی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرائی تھی۔

جواباً وہ بھی مسکرائی تھی۔

وہ ایک چوٹی پر کھڑے تھے اور دریا کا بلندی سے شوٹ لے رہے تھے۔

"راپنزل سے یاد آیا کہ یہ جگہ کتنی خواب ناک سی لگتی ہے۔ بالکل کسی فیری لینڈ کی طرح۔۔۔'' وہ اب نیچے کی طرف آرہے تھے۔ جبھی ایک آواز نے ماریہ کے قدم جکڑے تھے۔

وہ رکی تھی۔ آواز اتنی دور نہیں تھی۔

لیکن اتنے قریب بھی نہیں تھی۔۔۔

" کیا ہوا ماریہ؟"اس کے یوں رکنے پر سب نے رک کر اسے دیکھا تھا۔ لیکن وہ تب تک کسی سحر میں آچکی تھی۔ اس سحر نے اسے خود سے باندھ کر اپنی جانب کھینچا تھا۔

وہ آواز کی جانب بھاگنے لگی۔

"ماریہ۔۔۔ماریہ ! کدھر جار ہی ہو؟" آسٹن اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

اسے کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔

سوائے اس آواز کے جسے وہ بچپن سے سنتی آرہی تھی۔

"ماریہ رک جاؤ۔۔۔"اس کے یوں دیوانہ وار بھاگنے پر وہ پریشان ہوا تھا۔

وہ بھاگ رہی تھی۔ لمبے بال شاردا کے جھرنوں کو مات دینے لگے تھے۔

وہ گر رہی تھی۔۔۔

گر کر اٹھ رہی تھی۔۔۔۔۔۔

کچھ ہی دیر میں وہ اس جگہ پر پہنچ چکی تھی جہاں سے آواز آرہی تھی۔

تیز ہوتی سانس کے ساتھ اس کے قدم اس جگہ پر جا کر رک گئے تھے۔ وہاں کچھ لوگ بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھے تھے۔اس نے وہاں ان دونوں میں سے ایک کو دیکھا تھا جو کہ سامنے کھڑے شخص کی دھن کی پر مسحور سا ہو رہا تھا۔

وہی منظر۔۔۔

وہی جگہ۔۔۔

اسی طرح بہتا دریا۔۔۔ بلند و بالا پہاڑ۔۔

پہاڑوں پر اترتی دھند۔۔۔

اور اس جگہ پر وائلن بجاتا وہ شخص۔۔۔

اور اس وائلن سے نکلتی وہی دھن جسے وہ پچھلے کئی سالوں سے سنتی آرہی تھی۔۔۔وہ ہزار دھنوں میں سے بھی اس دھن کو پہچان سکتی تھی۔

اور پوری دنیا کے انسانوں میں سے اس شخص کو جس کی پیٹھ اس کی جانب تھی۔

وہ چن ریسٹ پر ٹھوڑی ٹکائے اس دھن کو شاردا کی ہواؤں کے سپرد کر رہا تھا۔

کیا یہ سارا منظر روح نکالنے کے لیے کافی نہیں تھا؟

کیا یہ لندن کی اس لڑکی کا سانس روکنے کے لیے کافی نہیں تھا کہ جسے اس خواب نے بچپن سے پریشان کر رکھا تھا کہ جس کی تعبیر کا حصہ اسے پاکستان کی اس وادی میں نظر آرہا تھا جس کا نام تک اس نے کبھی نہیں سنا تھا۔

"بند کرو اسے بجانا۔"وہ اچانک چلائی تھی۔

اس کی آواز پر وہ سب پلٹے تھے۔ تب تک آسٹن لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔

دھن یکم تھمی تھی۔ وہ اجنبی پلٹا۔

اور اس کے ساتھ ہی ماریہ کا سانس حلق میں ہی کہیں اٹک گیا۔

شاردا کے وہ بلند و بالا پہاڑ اسے چاروں طرف گھومتے نظر آئے تھے۔

ان سب کی طرح وائلن بجانے والا بھی حیرت میں مبتلا ہوا تھا اور اس کے ساتھ آسٹن لوگوں کے لیے بھی یہ حرکت ناقابلِ یقین تھی۔

"خدا کے لیے اسے مت بجاؤ۔"وہ رونے لگی۔

"سب ٹھیک ہے ؟"وہ اجنبی وائلن وہاں بیٹھے ایک مقامی باشندے کو پکڑا کر آگیا۔ وہ وائلن اسی باشندے کا تھا۔اور وہ اب اس سے براہِ راست مخاطب تھا۔

"یہاں آؤ گی تو ماتم بن جاؤ گی۔"

"یہاں آؤ گی تو ماتم بن جاؤ گی۔"

وہی آواز اس کے دماغ میں گونجی تھی۔

یہ آواز حقیقت سے کتنے مشابہہ تھی۔۔۔۔

" کون ہو تم ؟"وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکی تھی۔وہ معاملہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔اسی لیے باقی سب کی طرح وہ بھی خاموشی سے کھڑا رہا۔

"میں پوچھ رہی ہوں کون ہو تم؟"اب کی بار اس نے اسے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پیچھے کی جانب دھکا دیا تھا۔

پیچھے سے آتے اس کے دوست نے اسے تھاما تھا ورنہ وہ پشت کے بل گر جاتا۔

"ماریہ ! تم ہوش میں تو ہو؟"اس کی اس حرکت پر آسٹن نے اسے بازو سے پکڑ کر ہلایا تھا۔لیکن وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔

"تم کیسے وہ ہو سکتے ہو؟"وہ ایک قدم آگے بڑھی۔

" کیسے؟"بھوری آنکھیں پانی سے بھری تھیں۔ اس کے بال شاردا کی ٹھنڈی ہواؤں سے اڑ رہے تھے۔

جبکہ وہ لب بھینچے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔اس کے رخساروں کے ننھے گڑھے بھی پریشان سے دکھائی دینے لگے تھے۔

"ماریہ ! کیسی باتیں کر رہی ہو؟"ٹالی نے اسے پیچھے کی جاب کھینچا۔

جبکہ وہ اس شخص کے قدموں سے کچھ فاصلے پر گر گئی۔

ہاں شادرا نے اسے گھٹنوں کے بل زمین پر گرتے دیکھا تھا۔جیسے کوئی نیلسن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے۔

آسٹن اس منظر کو کیسے دیکھ سکتا تھا؟

وہ کیسے ماریہ کو کسی کے سامنے یوں گرتا دیکھ سکتا تھا؟

لیکن وہ خاموش رہا۔

کہ ایسے میں یہی بہتر ردِ عمل ہوتا ہے۔

وہ اجنبی شخص بھی کسی احساس کے تحت اس کے سامنے ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر اور دوسرا کھڑا کر کے بیٹھا تھا۔

شاردا کے بلند پہاڑوں نے انہیں ایک دوسرے کے سامنے یونہی بیٹھے دیکھا تھا۔

وہ خاموشی سے اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

وہ بھی بے بسی اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔وہ پرسکون ہو چکی تھی۔

نگاہیں ایک دوسرے میں کھو کر ہر منظر کو بھلا رہی تھیں۔

کتنے ہی لمحے گزرے تھے اس منظر کو کہ جسے شاردا کا سب سے خوبصورت منظر کہا جا سکتا تھا۔

" کسی پہاڑی سے گر گئی تھی تم؟"اس نے نہایت راز داری سے پوچھا۔

وہ ناسمجھی سے اسے تکنے لگی اور پھر سر نفی میں ہلا دیا۔

" تو پھر اس طرح کی حرکت ایک نارمل انسان تو نہیں کر سکتا نا؟"وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بڑے پیار سے پوچھ رہا تھا۔

" کیا مطلب؟"بھوری آنکھیں سکڑی تھیں۔

جواباً وہ کھڑا ہوا اور ایک ہاتھ اسے اٹھانے کی خاطر اس کی جانب بڑھایا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر اٹھ گئی۔

اسی ہاتھ کو پکڑے اس نے ماریہ کی توجہ اپنے دونوں جانب مبذول کروائی جہاں سب تماشائی بنے کھڑے تھے۔

لمحہ ہی تو لگا تھا اسے سارا معاملہ سمجھنے میں۔ اس نے سرعت سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس سے دو قدم دور ہو گئی۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔" اب کی بار اس کا دوست سامنے آیا تھا۔

"غلط فہمی؟" اس نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"جی غلط فہمی۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ تم پاکستان سے نہیں ہو اور میرا یہ دوست کبھی پاکستان سے باہر گیا نہیں۔ ایسے میں اگر تم یہ سب باتیں کہو تو اسے غلط فہمی نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے؟" اس نے ماریہ کے لیے سوالیہ نشان چھوڑا تھا۔

"ہم معذرت چاہتے ہیں۔ دراصل ہمیں خود نہیں پتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ برائے مہربانی برا مت مانیے گا۔" ٹالی ان دونوں سے مخاطب تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" اب کی بار اس کے گالوں کے ننھے گڑھے نمایاں ہوئے تھے۔

ماریہ نے ان گڑھوں کو دیکھا تھا۔

اور پھر اپنے دل کو ان میں ڈوبتے دیکھا تھا۔

اس سارے معاملے میں چارلس اور آرنلڈ ابھی بھی خاموش کھڑے تھے۔

"میں ہوں چارلس۔" چارلس نے آگے آ کر ملانے کے ہاتھ ان کی جانب بڑھایا۔

"لاتضی حدید۔" میجر ارتضی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"بلال احمد۔" میجر بلال نے ایک دلکش مسکراہٹ سے اپنا تعارف کروایا۔

"آرنلڈ۔" آرنلڈ نے بھی چارلس کا عمل دہرایا تھا۔

"ٹالی۔" ٹالی نے جھک کر انہیں اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"اور میں آسٹن۔" آسٹن نے بھی ان سے باری باری ہاتھ ملایا۔

ماریہ خاموش سی کھڑی تھی۔ وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی شاید۔

"اور یہ ہے ہماری دوست ماریہ۔" ٹالی نے اس کا تعارف بھی کروایا۔

میجر ارتضی نے اس کے چہرے کو ایک نظر دیکھا تھا وہ واقعی ایک پری تھی جو شاردا کی وادیوں میں بھٹک کر اتری تھی۔

"پاکستان میں خوش آمدید۔" میجر بلال نے انہیں اپنے ملک میں خوش آمدید کہا تھا کہ۔۔۔

اس ملک کے باشندے ایسے ہی تو کیا کرتے ہیں۔

"شکریہ۔" آسٹن پی کیپ اتار کر جھکا۔ یہ اس کا شکریہ کہنے کا ایک خاص انداز تھا جسے وہ کبھی کبھی ہی اپناتا تھا۔

"اگر تم لوگوں کو یہاں پاکستان میں کسی قسم کی رہنمائی کی ضرورت ہو تو بلا جھجک مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ اس پر میرا نام لکھا ہوا ہے۔" میجر لاتضی نے اپنے والٹ سے ایک کارڈ نکال کر آسٹن کی جانب بڑھایا۔

"شکریہ۔" اس نے مسکراتے ہوئے وہ کارڈ تھام لیا۔

"اب ہم چلتے ہیں۔ تم سے مل کر اچھا لگا۔" آسٹن واپس جانے کے لیے مڑا اور اس کے ساتھ ہی اس کے سب دوست۔

بھوری آنکھوں نے ان ڈمپلز کو دیکھا تھا اور بس یہی وہ غلطی تھی جو انجانے میں ان سے سرزد ہو چکی تھی اور شاید یہی غلطی اس کی زندگی کو ماتم بنانے والی تھی۔

میجر ارتضی نے اسے جاتے دیکھا تھا۔

وہ بھوری آنکھیں ایک پہیلی کی مانند ان کے سامنے آئی تھیں۔

ایسی پہیلی جو سلجھنے سے پہلے مزید الجھی تھی۔

کہ جسے سلجھانے کے لیے میجر ارتضی دریائے نیلم کے کنارے اپنی ذات سے الجھے تھے۔

وہ لوگ جا چکے تھے۔

"لاتضی سچ بتاؤ آرمی جوائن کرنے سے پہلے تمہارا اس سے کوئی چکر تو نہیں تھا؟" اسے جاتے دیکھ کر میجر بلال نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"تو یہ بات تم اس سے پوچھ لیتے۔" میجر لاتضی ٹراؤزر کی پاکٹس میں ہاتھ چھپا کر چل دیے۔

"یار ہو سکتا ہے کہ جسے تم پری سمجھ رہے ہو وہ تمہاری کسی پرانی محبوبہ کی بھٹکتی آتما ہو۔۔۔" وہ نہایت سوچ کر بولے۔

"ونہوں۔۔" جواباً انہوں نے میجر بلال کو گھورا۔

"میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے۔" انہوں نے اپنی بات پہ زور دیا۔

"تمہارا قتل بھی میرے ہاتھوں ہو سکتا ہے۔" میجر لاتضی نے ایک بھاری پتھر اٹھا کر میجر بلال کو دے مارنا چاہا۔

"دیکھنا پھر میری آتما بھی یونہی تمہارے پاس آیا کرے گی۔ تم مجھ سے بچنے کے لیے بھاگا کرو گے۔ پھر جہاں جہاں تم، وہاں وہاں میں۔۔۔ کوسو گے اس گھڑی کو جس میں تم نے اس معصوم کا قتل کیا ہو گا۔" بند مٹھی کمر پر ٹکائے وہ ان کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

"تمہاری آتما کو میں نے ایک بوتل میں بند کر کے اسی دریا میں بہا دینا ہے۔ پھر جہاں جہاں یہ پانی، وہاں وہاں تمہاری آتما۔ پھر کوسو گے اس وقت کو جس میں تمہیں آتما بننے کا خیال آیا ہو گا۔" انداز وہی تھا جو اب سے تھوڑی دیر پہلے میجر بلال کا تھا۔

"کاش میں تم سے رینک میں سینئر ہوتا۔" میجر بلال کی حسرت بلند پہاڑوں نے سنی۔

"ہاہاہاہا۔" میجر لاتضی کا ایک بے ساختہ قہقہہ دریائے نیلم کی لہروں کے سنگ بہا تھا۔

"بیٹا میرے ہوتے ہوئے تیری یہ خواہش، خواہش ہی رہے گی۔" انہوں نے میجر بلال کی گردن کے قریب سے بائیں کندھے کو اپنے مضبوط پنجے میں لیکر پوری قوت سے دبایا۔

"آآآآآآآآآآآ۔" ایک چلاتی آواز شاردا کی وادی میں گونجی تھی اگر وہ مزید قوت لگاتے تو قریب تھا کہ میجر بلال کی گردن ایک جانب کو لڑھک چکی ہوتی۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خواب کی تعبیر کے لیے مجھے تمہارا خون بہانا پڑے گا؟" گردن کے قریب سے کندھا سہلاتے ہوئے وہ ان سے دو قدم دور ہوئے تھے۔

"یس۔ آف کورس مائے ڈیئر میجر۔" میجر لاتضی نے کندھے اچکائے۔

"ویسے اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی کیونکہ تمہارا خون چوسنے کے لیے ایک عدد آتما اس سرزمین پر اتر چکی ہے۔" ان کی اس بات پر میجر لاتضی رکے۔ رک کر ایڑیوں کے بل ذرا سا ان کی جانب گھومے۔

"دل تو کر رہا ہے کہ تمہاری آتما کی بجائے تمہیں ہی اس دریا میں ڈبو ڈالوں۔" وہ دانت پیس کر رہ گئے۔

ننھے گڑھے خفگی سے بھرے تھے۔

"اگر تیرا دل اسی میں خوش ہے تو ٹھیک ہے دے دو دھکا۔" انہوں نے خود کو اس قربانی کے لیے پیش کیا تھا۔ چہرے پر معصومیت ایسی تھی کہ کسی ظالم کا دل بھی نہ چاہتا کہ انہیں دریائے نیلم کے پانی کے حوالے کر ڈالے۔ وہ دریا کے کنارے پر کھڑے ہو گئے۔

''ڈرامے باز کہیں کا۔'' میجر ارتضی نے انہیں کالر سے پکڑ کر پیچھے کی جانب کھینچا تھا۔

''حد سے زیادہ ڈرامے باز ہو گیا ہے تو۔اللہ کی پناہ۔'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

ان کی اس بات پر دریائے نیلم کے شفاف پانی نے میجر بلال کے ہونٹوں پر ایک شفق مسکراہٹ دیکھی تھی۔

''بس تمہاری صحبت کا اثر ہو رہا ہے۔'' انہوں نے اپنے بازو جھاڑے۔

''بلال مجھے لگتا ہے کہ تمہارے دن نزدیک آرہے ہیں۔''

چہرے پر سنجیدگی طاری کیے وہ دوبارہ ان سے مخاطب ہوئے تھے۔

'' کیا مطلب؟'' کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے وہ ان کی بات سمجھنے سے قاصر نظر آئے تھے۔

''بیٹا تو بس صبر کر۔'' ننھے گڑھوں نے انہیں وارننگ دی تھی۔

''یااللہ۔اس شیطان کے خطرناک ارادوں سے مجھ معصوم کو محفوظ رکھنا۔'' انہوں نے دعائیہ انداز سے ہاتھ پھیلا کر اوپر کی جانب اٹھائے اور یہ دعا مانگنے کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرے۔

''بس بیٹا تو دیکھتا رہ۔ تجھے تو ان ارادوں سے محفوظ رہنے کے لیے وظیفے بھی شروع کرنے پڑیں گے۔'' میجر ارتضی نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"Let see...."

شام پوری طرح اس وادی میں اتر چکی تھی۔

وہ دونوں اپنی عارضی رہائش گاہوں کی طرف چل دیے۔

وقت کی ڈائری پہ ایک نئی داستان رقم ہونے جارہی تھی جس کا انجام پیشین گوئیوں کی سرحد سے آزاد تھا۔

کہ جس کے اختتام سے دریائے نیلم بھی بے خبر تھا۔

)------------------------(

شاردا کی انتظامیہ کی جانب سے ہر سال ملکی وغیر ملکی سیاحوں کے لیے ایک تقریب کا انعقاد کیا جاتا تھا جو کہ کسی بھی جگہ ہونے والے بون فائر سے مماثلت رکھتی تھی۔ پہاڑ پر موجود ان تینوں گیسٹ ہاؤسز کے سیاحوں کو تقریب میں شرکت کے لیے دعوت نامہ دیا گیا تھا۔

وہ اس تقریب میں آنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن ٹالی کے بار بار اصرار کرنے پر اسے بھی اس تقریب میں آنا پڑا۔

آسٹن ابھی بھی اس سے ناراض تھا لیکن فی الحال وہ اس سے بات کر کے معاملے کو مزید الجھانا نہیں چاہتی تھی۔

یا پھر وہ اس معاملے کو سلجھانا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اور نہ ہی آسٹن نے اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کی۔

رات نو بجے کے قریب وہ وینیو میں موجود تھے ۔یہاں ان کی طرح دیگر کئی سیاح تھے جو کہ مختلف ممالک سے آئے ہوئے تھے ۔

کچھ مقامی سیاح بھی اس تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے۔

گول گول میزوں کے اردگرد کرسیوں کو سجایا گیا تھا۔

کھلے آسمان کے نیچے کیے انتظام کی وجہ سے منظر اور بھی دلکش لگ رہا تھا۔

وہاں موسیقی کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔

پیانو پر بجنے والی مدھم سی دھن ایک رومان پرور منظر رات کے کینوس پر بکھیر رہی تھی۔

مگر ماریہ اس منظر میں بہت اداس دکھائی دے رہی تھی۔

جب دل میں ہی خزاں کا موسم اتر آئے تو باہر آئی ست رنگی بہاروں کی پرواہ کسے ہوتی ہے۔

اس کے دل میں بھی خزاں سی اتر آئی تھی۔وہ چاہ کر بھی باہر اترتی بہار سے لطف اندوز نہیں ہوسکتی تھی۔

وہ سب ایک میز کے گرد لگی کرسیوں پر براجمان ہوگئے۔

ابھی بھی کچھ لوگ تقریب میں شرکت کے لیے آرہے تھے۔

وہ سب دوست ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

بیگانہ تھی تو صرف ماریہ جو اداسی کے کھنڈروں میں قید ہوچکی تھی اور شاید جن سے رہائی اب ناممکن ہوچکی تھی۔

وہ اردگرد کے لوگوں کو دیکھ رہی تھی کہ جبھی اس کی نظر اندر داخل ہوتے ہوئے میجر ارتضی اور ان کے دوست میجر بلال پر پڑی۔

جہاں سانس رکا تھا وہیں پلکیں بھی جھپکنا بھول گئی تھیں۔

اس کے یوں دیکھنے پر میجر ارتضی کی نظریں بھی پل بھر کو اس کی نظروں سے ٹکرائیں مگر بھوری آنکھیں اپنا زاویہ بدل گئیں اور آنکھیں ملنے سے پہلے ہی بچھڑ گئیں۔

ان دونوں نے ایک جیسی ہی ڈریسنگ کی ہوئی تھی۔

بلیک کلر کے تھری پیس میں وہ کسی بھی فینٹسی کہانی کے راج کمار دکھائی دے رہے تھے

"ہیلو------''چارلس انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ان کے قریب چلا آیا۔

"ہائے-----''ان دونوں نے گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔

وہ انہیں بھی اپنے ساتھ لیکر اسی میز پر آگیا۔

وہ سب انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے جیسے وہ برسوں بعد ملے ہوں۔

میجر ارتضی ماریہ کی کرسی کے بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھے تھے ۔وہ خود کو ان کی آمد سے لاتعلق ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

" کیسا جارہا ہے آپ لوگوں کا ٹرپ؟'' میجر بلال میجر ارتضی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"بہت اچھا۔'' ٹالی چہک کر بولی۔

" کیسا لگا ہمارا ملک؟'' میجر ارتضی کو اپنے ملک کی تعریفیں سننا بہت اچھا لگتا تھا اور وہ ان سے بھی یہی امید کر رہے تھے۔

"بہت خوبصورت--- بہت پرسکون سا--- پرامن سا۔'' آرنلڈ کی نگاہوں میں گزشتہ دنوں کے تمام مناظر ابھرے تھے۔

"شکریہ۔''ان کا سر اس تعریف پر فخر سے بلند ہوا تھا۔

یہاں کوئی مشکل تو نہیں پیش آرہی آپ لوگوں کو؟''ایسا پوچھنا ان کا فرض تھا اور وہ اپنے فرض میں کبھی بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔

"نہیں--- فی الحال تو کوئی پریشانی نہیں آئی۔'' آسٹن کے لہجے کی تلخی کو صرف ماریہ ہی محسوس کر پائی تھی۔

''ان شاءاللہ------آگے بھی نہیں آئے گی۔''انہوں نے ایک نظر ماریہ کو دیکھا تھا جو انہیں ہی دیکھ رہی تھی مگر ان کے یوں دیکھنے پر وہ پھر رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔

وہ مسکراہٹ لبوں تلے چھپا کر سامنے اسٹیج کی طرف دیکھنے لگے جس طرف ماریہ دیکھ رہی تھی۔

میجر بلال نے ایک میسج لکھا اور میجر ارتضی کے نمبر پر سینڈ کر دیا۔

"بیٹا۔۔۔کیا بات ہے؟ یوں چپکے چپکے کیوں مسکرایا جارہا ہے؟" میسج سینڈ کرنے کے بعد وہ وینیو میں داخل ہوتے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اللہ۔۔۔۔۔۔یہ دیکھ ہاتھ جوڑتا ہوں تیرے آگے۔۔۔معاف کر دے مجھے۔" میسج پڑھتے ہی ان کی مسکراہٹ اڑن چھو ہوگئی۔انہوں نے میسج لکھ کر اس میں جڑے ہاتھوں کی ایک ایموجی ڈالی اور اسے میجر بلال کو بھیج دیا۔

"ہاہاہاہاہاہاہاہاہاہا۔۔۔۔" ایک لمبا سا ہاہاہا کا جواب میجر بلال کی طرف سے آیا تھا۔

"تم واپس چلو۔۔۔پھر تمہیں بتاتا ہوں۔" فی الحال وہ انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" ایک اسمائلی کے ساتھ یہ میسج میجر ارتضی کے غصے کو ہوا دینے کے لیے کافی تھا مگر وہ اس وقت کچھ نہیں کر سکتے تھے اس لیے اٹھ کر چلے گئے۔

"ایکسیوز می۔"

"سر! آپ یہاں؟" یہ یہاں کا ایک پرانا ویٹر تھا جو ان کا اب واقف ہو چکا تھا۔

"کیسے ہو رحیم خان؟" وہ کافی عرصے بعد اس سے مل رہے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے سر۔" وہ ان سے دوبارہ مل کر بہت خوش ہوا تھا۔

"گھر میں سب کیسے ہیں"

"مہربانی ہے اللہ کی۔" وہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنے والوں میں سے تھا۔

"یہ رکھ لو۔۔ضرورت کے وقت کام آئیں گے۔" انہوں نے والٹ میں سے کچھ پیسے نکال کر اسے دیئے۔وہ ہمیشہ اسے پیسے دے کر جایا کرتے تھے۔وہ اس کے گھریلو حالات سے بخوبی واقف تھے۔

"بہت بہت شکریہ سر۔" وہ دن بدن ان کی محبت کا مقروض ہوتا جارہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" مسکراتے ہوئے وہ وہاں سے جانے لگے۔

"سر! اپنی آواز میں ایک گانا ہی سنا دیں۔" وہ جانتا تھا کہ میجر ارتضی بہت اچھا گاتے تھے۔وہ جب ان کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے تو ہر رات بون فائر کر کے ان سے گانے سنا کرتا تھا۔

"آں۔۔۔" وہ سر کھجانے لگے۔

"پلیز سر۔" لہجہ التجائیہ تھا۔

"چلو۔۔۔" وہ انہیں اپنے ساتھ لیکر اسٹیج پر آ گئے اور وائلن کو بجانے ہی لگے تھے کہ نظریں ماریہ کے چہرے سے ٹکرا گئیں۔وہ گم صم سی بیٹھی ارد گرد کے ماحول سے لاتعلق نظر آ رہی تھی۔

"خدا کے لیے اسے مت بجاؤ۔" ایک آواز تھی جو ان کے کانوں میں گونجی تھی۔

وہ اپنا ارادہ ترک کر کے پیانو کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔

"یہ پاکستانی گلوکار عاطف اسلم کا گانا ہے اور میں یہ گانا آپ کو انگلش میں ٹرانسلیٹ کر کے سناؤں گا اور امید ہے کہ یہ گانا اپنے اوریجنل ورژن کی طرح ہی ہوگا۔اور میں یہ گانا کسی کو ڈیڈیکیٹ کرنا چاہوں گا۔" ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے محبت بھرے گڑھوں کو گہری کر دینے کے لیے کافی تھی۔

ان کی اس بات پر ماریہ کی آنکھیں اسٹیج کی طرف دوڑی تھیں اور پیانو کے آگے بیٹھے میجر ارتضی کو دیکھ کر ثبات حاصل کر گئیں۔

میجر بلال سمجھ چکے تھے کہ یہ گانا کسے ڈیڈیکیٹ کیا جانے لگا تھا اس لیے وہ اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے میجر ارتضی کی جانب متوجہ ہو گئے۔

انگلیوں نے دھن چھیڑی اور سماں بندھنے لگا۔

کچھ اس طرح
تیری پلکیں میری پلکوں سے ملادے
آنسو تیرے سارے
میری پلکوں پہ سجادے

ایک ہوک سی ماریہ کے دل سے اٹھی اور نگاہیں زاویہ بدلنا بھول گئیں۔

تھم گھڑی
ہر وقت میرے ساتھ رہا ہے
ہاں یہ جسم
کبھی دور، کبھی پاس رہا ہے

پیانو کے لِڈ سے وہ اس کے بدلتے اثرات کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔وہ نگاہیں اس پر ٹکائے ان بھوری آنکھوں کے سامنے بہت سی چھپی چیزوں کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جو بھی غم ہیں یہ تیرے
انہیں تو میرا پتا دے
کچھ اس طرح
تیری پلکیں،میری پلکوں سے ملادے

وہ اپنی کرسی سے اٹھی تھی اور دھیرے سے چلتی ہوئی پیانو سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

آواز کا ایک سحر تھا جو اسے کھینچ لایا تھا۔

میجر ارتضی بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

مجھ کو تو تیرے چہرے پہ
یہ غم نہیں جچتا
جائز نہیں لگتا
مجھے غم سے تیرا
یہ رشتہ

آنسوؤں کی ایک لڑی ٹوٹی اور ٹوٹ کر ماریہ کے رخساروں پر بکھر گئی۔۔۔جیسے اس آواز سے وہ ٹوٹ کر بکھرتی جارہی تھی۔

آسٹن اور اس کے دوست باقی سب لوگوں کی طرح سامنے والا منظر خاموشی سے دیکھتے رہے۔

سن میری گزارش
انہیں چہرے سے ہٹادے

اب کی بار وہ ہلکا سا مسکرائے تھے۔
ایک پیغام تھا جو ان کی مسکراہٹ اس پل ماریہ کو دے رہی تھی مگر وہ اس حالت میں کھڑی انہیں تکتی رہی۔

کچھ اس طرح
تیری پلکیں میری پلکوں سے ملادے
آنسو تیرے سارے
میری پلکوں پہ سجادے

کتنے خوبصورت الفاظ تھے مگر افسوس یہ اس کے لیے نہیں تھے۔
مگر اسے پھر بھی اچھے لگ رہے تھے۔۔۔
جیسے سامنے بیٹھا وہ شخص اسے کہہ رہا ہو کہ ماریہ تم اپنے سارے غم اپنی ساری تکلیفیں مجھے دے دو۔ تمہارے چہرے پر یہ چیزیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔
اور میرا خیال ہے کہ آدھی سے زیادہ تکلیف تو انہیں لفظوں سے کم ہوجاتی ہے۔
وہ تو پھر بھی ماریہ تھی۔۔۔
برسوں سے الفاظ کو سننے کے لیے ترستی ہوئی ایک لڑکی۔۔۔۔۔
جو یہ چاہتی تھی کہ کوئی آئے اور اس سے اس کے غم بانٹ لے۔۔۔
سامنے بیٹھا وہ شخص کچھ ایسا ہی دکھائی دیا تھا۔۔۔
اور وہ شخص ایسا تھا کہ اس کا محبت بھرا ایک جملہ بھی ماریہ کے دکھوں کا پہاڑ پل بھر میں ریزہ ریزہ کر سکتا تھا۔
لیکن یہی تو اس کی بدقسمتی تھی کہ سامنے والا یہ جملہ اسے کبھی بھی نہیں کہنے والا تھا۔
کاش پیانو کے سامنے کھڑی وہ لڑکی ننھے گڑھوں کی زبان بھی سمجھ پاتی۔

کچھ اس طرح
تیری پلکیں میری پلکوں سے ملادے
آنسو تیرے سارے
میری پلکوں پہ سجادے

آواز مدھم ہورہی تھی لیکن نگاہوں کی زبان ابھی بھی اس کاوش میں تھی کہ شاردا کی وہ پری محبت کا سندیسہ سمجھ جائے اور ان کی خاموش محبت اظہار کا مرتبہ پا جائے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کچھ اس طرح۔۔۔۔۔۔
کچھ اس طرح۔۔۔۔۔۔

ماریہ کے آنسوؤں کی روانی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ آنسو اس کے رخساروں کی بجائے سامنے والے کے دل پر گر رہے تھے اور گر کر اسے ایسا بے بس کر رہے تھے کہ وہ چاہ کر بھی اس کے آنسو نہیں چن سکتا تھا۔
اب کی بار تو لوگوں کی داد میں لپٹی تالیاں بھی میجر ارتضی کو وہ خوشی نہیں دے رہی تھیں جو کبھی انہیں داد وصول کرتے ہوئے وقت ہوا کرتی تھی۔
کیسے ہوتے وہ خوش؟
جب خود سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی وہ لڑکی بحر رنج میں گم کھڑی تھی۔
دکھ تب نہیں ہوتا جب آپ تکلیف میں کھڑے ہوں۔۔۔دکھ تب ہوتا ہے جب جان سے پیارا کوئی تکلیف میں مبتلا ہو۔
جب برداشت جواب دے گئی تو وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے وینیو سے باہر نکل گئی۔
میجر ارتضی اس مقام پر کھڑے تھے کہ وہ چاہ کر بھی اس کے پیچھے نہیں جا سکتے تھے۔
مرے ہوئے دل کے ساتھ وہ اسٹیج سے نیچے آگئے۔
'میرا خیال ہے کہ ہمیں اب چلنا چاہیے۔'' ننھے گڑھے اداسی میں ڈوب چکے تھے اور وینیو کی رعنائی سے فرار حاصل کرنا چاہتے تھے۔
''ہمم۔۔۔چلو۔'' میجر بلال بہت سی ان کہی باتیں سمجھ چکے تھے۔
وینیو سے کچھ ہی فاصلے پر وہ کھڑی اپنے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔
وہ اسے دیکھتے ہوئے رکے تھے۔۔۔رک کر اس سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔۔۔جاننا چاہتے تھے۔۔۔۔۔۔وہ ساری ان کہی باتیں جو اس رات آنسوؤں کے بہنے کا موجب بن گئی تھیں۔
اگر دو بھوری آنکھیں رو رہی تھیں تو قرار ان دو ننھے گڑھوں کو بھی نہیں تھا۔
کتنے ہی لمحے، کتنے ہی ساعتیں اس منظر سے گزری تھیں۔کاش ان ساعتوں کا،ان لمحوں کا درد۔۔۔کرب۔۔۔غم قم کیا جا سکتا۔
اس کا ہچکولے کھاتا جسم یہ صاف دکھا رہا تھا کہ اس کے اندر کتنا بڑا طوفان اٹھ رہا ہے جس کی پھانس میجر ارتضی کو اپنے گلے میں محسوس ہو رہی تھی۔۔۔جس کی تکلیف ان ننھے گڑھوں کو محسوس ہو رہی تھی۔
ہائے رے وقت۔۔۔تجھے کیا لکھنا چاہیے تھا اور تو کیا لکھ رہا ہے؟
(-----------------)
''تم یہاں بیٹھی ہو میں تمہیں پورے گیسٹ ہاؤس میں ڈھونڈ رہا تھا۔'' وہ گیسٹ ہاؤس سے باہر ایک سنگی بنچ پر بیٹھی تھی جو کہ پہاڑ کے ہی ایک ٹکڑے کو تراش کر بنایا گیا تھا۔اس کے ہاتھ میں کافی کا ایک بھاپ اڑاتا مگ تھا۔تبھی اسے اپنے عقب سے آسٹن کی آواز سنائی دی تھی۔
''کیوں؟'' اس کے بال بندھے ہوئے تھے۔
''کیوں کا کیا مطلب؟'' آسٹن اس کے سوال پر حیران ہوا تھا۔کیونکہ اس نے آج سے پہلے اس سے ایسے نہیں پوچھا تھا۔
'مطلب کہ کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟ کوئی کام تھا کیا؟'' لہجہ ترش تھا اور اجنبی سا بھی۔

"تم سے کیا کام ہوسکتا ہے مجھے۔" ہ مسکرایا تھا اس کے لہجے کی ترشی کو زائل کرنے کے لیے۔

"تو پھر؟" کافی کا ایک گھونٹ بھر کر اس نے ایک لمبا سانس لیا تھا۔اس کا لہجہ بھی کافی کی طرح کڑوا تھا۔

"پھر یہ کہ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا تھا۔" رات ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔چاند کی مدھم روشنی زمین پر اتر رہی تھی۔گیسٹ ہاؤس کے راستے کے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی لائٹس لگائی گئی تھیں جو کہ رات کے وقت بھی اس کے راستے کو واضح کر رہی تھیں۔

"ہاں بولو۔" اسے بنا دیکھے ماریہ نے گرم کافی کا ایک اور گھونٹ بھرا تھا۔

"ماریہ کیا تم مجھے کل کے واقعے کا پسِ منظر بتا سکتی ہو؟" جب سے وہ واپس آئے تھے آسٹن کے ذہن میں بس وہی واقعہ گھوم رہا تھا۔

"کونسا واقعہ؟" اب کی بار اس نے ایک نظر اٹھا کر آسٹن کی جانب دیکھا تھا جس کی نیلی آنکھیں کئی سوال لیے ہوئے تھیں۔

"وہی ارتضیٰ والا۔" اس نے مبہم سا اشارہ دیا تھا لیکن ماریہ کے سمجھنے کے لیے کافی تھا۔

"میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ آسٹن سے کچھ بھی شیئر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"ماریہ میں تمہارا دوست ہوں۔گر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔" وہ مدھم سے لہجے میں بولا کہ جیسے چاند کی مدھم کرنیں ٹھنڈک کا احساس دل میں اتار رہی ہوں۔

"آسٹن میں سچ کہہ رہی ہوں میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" اب کی بار اس کی آنکھوں میں آنسو بھی ابھرے تھے۔جن کی چمک کو چاند کی مدھم چاندنی میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

"ماریہ کیا تم اسے پہلے سے جانتی ہو؟" وہ اس سے اصل بات اگلوانے کی ٹھان چکا تھا۔

"نہیں۔" فوراً جواب آیا تھا۔

"مجھے پاگل مت بناؤ ماریہ۔بچہ نہیں ہوں کہ ایسی باتیں سمجھ نہ پاؤں۔" وہ پہلی بار ایسے لہجے میں بولا تھا۔ کچھ لمحے تو ماریہ کو بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

وہ آسٹن تھا۔

تو پھر اس کے لہجے پر یقین کرنا اتنا مشکل کیوں ہوا تھا؟

"تم سننا کیا چاہ رہے ہو؟" وہ خود کو مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

"وہی جو پوچھ رہا ہوں۔" شاردا میں یکدم سناٹا چھایا تھا۔

"جو بات تم پوچھ رہے ہو وہ حقیقت میں کوئی وجود نہیں رکھتی۔" اس نے اپنے ہی خواب کی نفی کی تھی حالانکہ دریا کے اس کنارے وہ اس کی جیتی جاگتی تعبیر دیکھ آئی تھی۔

"جھوٹ پہ جھوٹ۔ آخر کب تک؟" وہ ماریہ کو خود اس سے بھی زیادہ گہرائی سے جانتا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اسے اس کے جھوٹ اور سچ کا پتا نہ چلتا۔

"تو بولنے دو مجھے جھوٹ تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ خدا کے لیے جاؤ یہاں سے۔اکیلا چھوڑ دو مجھے۔ "وہ چلاتے ہوئے بنچ سے اٹھی تھی اس کے یوں اچھلنے سے اس کے ہاتھ میں پکڑے مگ سے گرم کافی اچھل کر پاس بیٹھے آسٹن کے ہاتھ پر جا گری جو کہ اس نے اپنے اور ماریہ کے بیچ بنچ پر رکھا ہوا تھا۔

"آؤچ۔" اس کا ہاتھ سرعت سے اس کے سینے کی جانب پناہ لینے کے لیے بڑھ تھا۔

"معاف کرنا۔" پریشانی کے عالم میں مگ رکھ کر اس نے آسٹن کا ہاتھ سہلانا چاہا۔ جسے آسٹن نے پیچھے کی جانب کھینچ لیا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟" وہ بے یقین دکھائی دیا تھا۔

اسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آیا تھا۔

آتا بھی کیسے؟

مقابل کوئی اور نہیں تھا۔وہ ماریہ تھی۔

آسٹن کی ماریہ۔

جس کی حفاظت اس نے اپنی جان سے بڑھ کر کی تھی۔

ہر مشکل گھڑی میں اس کا ساتھ دیا تھا۔

چوٹ اسے پہنچتی تو درد آسٹن کو ہوتا تھا۔

سانس ماریہ کی رکتی تو موت آسٹن کو آجاتی۔

تو پھر۔۔۔۔۔۔۔

تو پھر وہ یہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ آسٹن تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا؟

ایک آسٹن ہی تو تھا جسے سب سے زیادہ فرق پڑے گا۔

اس کے روٹھ جانے سے۔۔۔۔۔

اجنبی ہو جانے سے۔۔۔۔۔

پل بھر میں۔۔۔۔

برسوں کا رشتہ توڑ جانے سے۔۔۔۔

کاش وہ جان سکتی۔۔۔

کاش۔۔۔۔۔

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" اسے اپنے لفظوں کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔

"تمہیں واقعی لگتا ہے کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" اس نے پھر ان لفظوں کو دہرایا تھا جنہیں ادا کرتے ہوئے ایک درد بھری لہر اس کے جسم میں دوڑی تھی۔

"میں معذرت چاہتی ہوں آسٹن۔ میں اس وقت ایک عجیب سی کشمکش میں ہوں۔اس کشمکش کو سمجھنا مجھے مشکل لگ رہا ہے۔۔۔میں نہیں بتا سکتی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے جا رہا ہے۔" سر جھکائے وہ بے ترتیب سے الفاظ آسٹن کے گوش گزارنے لگی۔

"رات گہری ہونے سے پہلے اپنے کمرے میں چلی جانا۔ہوسکتا ہے کہ اب تمہیں ان گہری راتوں میں کوئی آسٹن جیسا محافظ نہ ملے۔" ماریہ کو لگا تھا کہ جیسے شاردا کے بلند پہاڑ ایک ہی وقت میں بلند ہوئے تھے اور پھر ایک ایک کر کے وہ اس کے سر پر ٹوٹتے چلے گئے۔جن کے وزن کی وجہ سے وہ پچھتاوے کی دلدل میں دھنسنے لگی تھی۔

"اور ہاں، خدا کے لیے کل آرنلڈ لوگوں کے سامنے ایسا کچھ ظاہر نہ کرنا کہ ہمارے درمیان کوئی غیر متوقع بات ہوئی ہے۔ خدا تمہاری مشکل آسان کرے۔" جانے سے پہلے وہ دعا دینا نہیں بھولا تھا۔

"آسٹن۔" جاتے ہوئے اس نے آسٹن کو پکارا تھا لیکن وہ سنی ان سنی کر کے چلا گیا۔

"آسٹن کاش میں تمہیں بتا پاتی کہ میں تمہیں کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی۔" وہ ابھی بھی کھڑی تھی۔ہاتھ میں پکڑے مگ میں کافی سرد ہو چکی تھی۔

بالکل آسٹن کے لہجے کی طرح۔۔۔۔

"مجھے معاف کر دینا آسٹن۔" آنکھیں میچے وہ اپنے پچھتاوے کو کم کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

چاند کی چاندنی اب بھی زمین پر آرہی تھی لیکن وہ اب ٹھنڈک سے محروم تھی۔

ایک اچھا دوست چھن چکا تھا۔۔۔۔

وقت نے اسے لندن کی سرزمین سے لا کر ایک تپتے صحرا میں چھوڑ دیا تھا۔

ہاں بالکل۔۔۔۔آسٹن کے بغیر ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر کھلے آسمان تلے کھڑی رہی اور پھر مگ لیے اپنے کمرے میں آ گئی جہاں ٹالی لمبی تان کر سو چکی تھی۔

ایک نظر اس کے پرسکون چہرے پر ڈال کر وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

اس نے سونے کی خاطر آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ تبھی ڈمپلز والا ایک چہرہ اس کی آنکھوں میں ابھرا تھا۔

اس نے تیزی سے آنکھیں وا کیں۔۔۔چہرہ غائب ہو چکا تھا۔

اس کیفیت کو سمجھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوتے ہوئے اس نے دوبارہ آنکھیں بند کیں۔۔۔۔اب کی بار پھر وہی ہوا تھا۔یہ سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔وہ آنکھیں بند کرتی اور برسوں کا سمویا ہوا نقش آنکھوں میں ابھر آتا۔

وہ سونا چاہ رہی تھی لیکن سو نہیں پا رہی تھی۔

وہ ننھے گڑھے اس کی نیند اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔

وہ بالوں کو مٹھیوں میں بھینچ کر بیٹھ گئی۔

اس وقت وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی؟

"یہ کیا ہو رہا ہے خدایا؟

"یہ آنکھیں بغاوت پر کیوں اترنے لگی ہیں؟"

"اف۔۔۔۔میں کیا کروں؟" وہ بستر سے اتر آئی تھی۔

"کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" وہ کمرے میں ہی اپنے بستر کے قریب چہل قدمی کرنے لگی۔عجب سی الجھن اسے گھیر چکی تھی۔

اب تو یہ راتیں ایسے ہی گزرنے والی تھیں۔۔۔۔

لیکن وہ اس سے بےخبر تھی۔

)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(

"یار مجھے ابھی واپس جانا ہے۔" یہ میجر بلال تھے جو کہ واپسی کے لیے اپنی پیکنگ کر رہے تھے۔

"کیوں خیریت؟" میجر ارتضٰی ان کے قریب کھڑے ہو کر ان کی یہ ساری کاروائی دیکھ رہے تھے۔

"ہاں یار مجھے ارجنٹ بلوایا گیا ہے۔لائن آف کنٹرول پر میری ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔" وہ تیزی سے ہاتھ چلا رہے تھے۔

"اللہ خیر کرے۔ پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ بھی اپنا بیگ اٹھا لائے۔

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔ویسے بھی تین چار چھٹیاں رہ گئی ہیں۔ پھر آ جانا۔" وہ اپنی شرٹس کو تہہ لگا کر ایک ترتیب کے ساتھ بیگ میں رکھ رہے تھے۔

"میں نے یہاں اکیلے رہ کر کیا کرنا ہے۔ چھٹیاں ہیں گھر ہی چلا جاتا ہوں۔لائبہ اور میرال کے ساتھ کچھ وقت گزار لوں گا۔" وہ بھی اپنے کپڑوں کو تہہ لگانے لگے۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ دونوں ہاسٹلز میں ہیں۔" اب کی بار وہ کمر سیدھی کرنے کے لیے پل بھر کو رکے۔

"اف۔۔۔۔ میں بھی کتنا بھلکڑ ہوتا جا رہا ہوں۔" ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے انہوں نے اپنی یادداشت کی کمزوری پر افسوس کیا تھا۔

"عمر کا تقاضا ہے بیٹا۔" لبوں پر دلکش مسکراہٹ سجائے وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

"بس میری عمر پر ہی نظر رکھنا۔" ننھے گھڑوں نے مصنوعی خفگی دکھائی تھی۔

"ہاہاہاہاہا۔" ایک بھلا سا قہقہہ کمرے کی چار دیواری میں گونجا تھا۔

"یار میں سوچ رہا ہوں کہ ان کی تعلیم کے فوراً بعد ان کی شادی کر دوں۔۔۔۔میری جاب ہی ایسی ہے کہ اگلے پل کی خبر نہیں۔ کب کہاں سے بلاوا آ جائے میرے سوا ان کا اس دنیا میں ہے ہی کون۔" میجر بلال ان کے چہرے پر افسردگی دیکھ سکتے تھے۔

"ہمم۔۔۔میرا بھی یہی خیال ہے۔ میری نظر میں یونٹ کے کچھ لڑکے ہیں جب ارادہ ہو تو بتانا میں بات کر لوں گا۔۔۔ڈونٹ وری۔" ہمیشہ کی طرح انہوں نے اپنے دوست کی پریشانی بانٹی تھی۔

کہ اچھے دوست ایسے ہی تو کیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔

"شکریہ۔" انہیں اپنا آدھا بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"شکریہ کی کوئی بات نہیں۔وہ میری بھی بہنیں ہیں اور بھائی ہونے کی حیثیت سے میرا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ ان کے بہتر مستقبل کے بارے میں تمہارا ساتھ دوں۔" وہ ان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے ایک بار پھر ان پر احسان کر گئے تھے۔

جواباً میجر ارتضٰی کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"ویسے اب تو تمہارا دل بھی ادھر لگ جائے گا۔" ذومعنی لہجے میں کہتے ہوئے وہ دوبارہ اپنے بیگ کی جانب متوجہ ہوئے۔

"مطلب؟" میجر ارتضٰی نے ان کے ہاتھ سے تہہ شدہ شرٹ چھینی تھی۔

"مطلب یہ کہ اگر تمہارا ادھر دل لگ گیا تو پھر کہیں نہیں لگے گا۔" ان کے چہرے پر مچلتی شرارت کو واضح دیکھا جا سکتا تھا۔

"تم بچ جاؤ بے شرم آدمی۔" ہاتھ میں پکڑی شرٹ انہوں نے پوری قوت سے میجر بلال کے چہرے پر دے ماری۔

"بچو تو اب تم بیٹا۔" ایسی مبہم سی باتیں کوئی میجر بلال سے کرنا سیکھے۔

"تم جلدی پیکنگ کرو اور نکلنے کی کرو۔۔۔شاباش۔" غصے پر ضبط کرتے ہوئے انہوں نے پاس پڑی چیزیں بے ترتیبی سے میجر بلال کے بیگ میں رکھنی شروع کر دیں۔

"ہاں ہاں۔۔۔تاکہ تم جلدی سے اکیلے میں اس "پری" سے ملنے چلے جاؤ۔" میجر ارتضٰی کو تپ چڑھانے میں میجر بلال سے بڑھ کر اور کون محظوظ ہو سکتا ہے۔

"مجھے کیا مصیبت پڑی ہے اس سے ملنے کی۔" نگاہیں چراتے ہوئے وہ اپنے بیگ کو اس کی مقررہ جگہ پر رکھنے کے لیے چلے گئے۔

"یار تو اتنا شرماتا کیوں ہے؟ مجھے پتا ہے تم اپنی اس لڑکیوں جیسی شرماہٹ کو چھپانے کے لیے چہرے پر غصہ سجا لیتے ہو۔" انہوں نے دھیرے سے کہنی کی ضرب میجر ارتضٰی کو لگائی۔

ان کی اس حرکت پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ میجر ارتضٰی کے لبوں پر بکھری تھی۔

"بس کرو میرے بھائی۔" لبوں پر مسکراہٹ سجائے انہوں نے میجر بلال کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

”اچھا اچھا۔۔۔۔ یہ شرمانابند کرو اور مجھے بس اسٹاپ پر چھوڑ کر آؤ۔“ وہ مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے ہیں۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔ لے آؤ سامان۔ میں تب تک جیپ نکالتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جیپ کی چابی لیکر وہاں سے نکل گئے۔

میجر بلال نے ایک سرسری سی نظر ادھر ادھر گھمائی کہ کوئی چیز ادھر رہ نہ جائے۔اس کے بعد سامان لیکر وہ بھی وہاں سے چل دیے۔

)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(

دوپہر کے کھانے پر سب نے ماریہ اور آسٹن کی خاموشی کو نوٹ کیا تھا۔ وہ سب گیسٹ ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔اور سب آپس میں گپ شپ لگا رہے تھے جبکہ وہ دونوں سب سے بے نیاز بیٹھے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔

”سب خیریت ہے آسٹن؟“ یہ آرنلڈ تھا جس نے باری باری ان دونوں کو دیکھا تھا۔

”ہاں۔کیوں کیا ہوا؟“ آسٹن نے خود کو انجان ظاہر کرنا چاہا۔

” مگر مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آرہی ہے۔“ چارلس نے اسے تیکھی نظروں سے جانچنے کی کوشش کی۔

کیسی گڑبڑ؟“ اس نے کانٹا پلیٹ میں رکھ کر اپنی پی کیپ کو دوبارہ درست کیا۔ وہ پریشانی میں ایسے ہی کیا کرتا تھا۔

” تم دونوں میں کوئی بات ہوئی ہے؟“ اب کی بار ٹالی سی آئی ڈی آفیسر بنی تھی۔ماریہ کا رویہ تو ویسے بھی سب کی سمجھ سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔وائلن والے قصے سے لیکر اب تک کی حالت تک وہ ایک عجیب سا معمہ بن چکی تھی۔جو سلجھائے نہ سلجھ رہا تھا۔

”نہیں تو۔“ آسٹن کے جواب دینے سے پہلے ماریہ بول پڑی تھی۔ جس پر سب نے اسے بغور دیکھا تھا۔

اس کی آنکھیں رات جگے کی چغلیاں کھا رہی تھیں۔

"تو پھر تم دونوں کوئی بات کیوں نہیں کر رہے؟"چارلس نے پانی کا گلاس منہ کو لگاتے ہوئے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا تھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"ماریہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے کہتی ہوئی دوبارہ اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"ایسی ہی بات لگ رہی ہے۔"آرنلڈ کہاں ٹلنے والا تھا۔

"یار ایک دفعہ کہہ تو دیا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔پھر بھی پتا نہیں کیوں پیچھے پڑ جاتے ہو۔"لمحہ ہی تو لگا تھا اس کی پھیکی مسکراہٹ کو ناگواریت میں بدلنے میں۔ غصے سے اس کے عارض سرخ ہونے لگے۔کانٹا اور چمچ پلیٹ میں پٹختے ہوئے وہ باہر چلی گئی۔

"اسے کیا ہوتا جا رہا ہے؟"ٹالی بھی ان سب کی طرح شاکڈ ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں۔ بس دماغ کے کیڑے ذرا ہل گئے ہیں۔ایک دو ٹھوکر لگنے کے بعد اپنی جگہ پہ سکون سے بیٹھ جائیں گے۔تم لوگ کھانا کھاؤ۔"آسٹن کو تو اس کا رات والا رویہ ابھی تک نہیں بھولا تھا اور اب پھر اس کا یہ ردِ عمل۔

آسٹن کی اس بات پر ان سب نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ کتنا سکون تھا اس کے چہرے پر۔ جو ان سب کے لیے ایک ناقابلِ یقین بات تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اسے واپس بھیج دینا چاہیے۔وہ یوں کبھی پہلے لندن سے ایسے نکلی نہیں ہے نا۔شاید اپنی ماں سے دوری کی وجہ سے اس کا برتاؤ ایسا ہوتا جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ہماری وستی کی وجہ سے یوں درمیان میں چھوڑ کر جانا نہ چاہ رہی ہو۔لیکن ہمیں اس کی حالت سمجھنی چاہیے۔"آرنلڈ پہلی بار اتنا فکرمند نظر آیا تھا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ اسے اس حالت میں واپس نہیں بھیجنا چاہیے۔وہاں جا کر تو وہ اور بھی تنہائی کا شکار ہو جائے گی۔"ٹالی بھی اس کا رویہ نہیں سمجھ پائی تھی۔

وہاں اب گول میز کانفرنس کی طرح بحث چھڑ چکی تھی۔

جیسے کہ وہ سب دوست ہمیشہ سے کرتے آئے تھے۔

"اور میرا خیال ہے کہ اسے فی الحال اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔وہ ابھی خود اپنے رویے کی وجہ سمجھ نہیں پائی۔اپنے اس ردِ عمل کو سمجھنے کے لیے اسے وقت درکار ہے۔امید ہے کہ وہ واپس لوٹ آئے گی۔"آسٹن نے بھی اپنی رائے دی تھی۔

"ہمم۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔جیسا تم مناسب سمجھو۔"ان سب نے آسٹن کے خیال کی تائید کی تھی۔

آسٹن بظاہر کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا تھا لیکن اس کا دماغ ماریہ کی طرف ہی بھٹک رہا تھا۔

وہ خود اس کی حالت کو ابھی تک سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

)۔۔۔۔۔۔۔۔(

وہ کھانا چھوڑ کر باہر آچکی تھی۔

سرخ ہوئے گالوں پر گرم آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ آنسوؤں کو صاف کیے بغیر وہ اپنے سرمئی اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گیسٹ ہاؤس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

پہاڑی پر ایک بل دار راستہ پہاڑی کے نیچے تک جاتا تھا جو کہ ڈھلوان ختم ہونے کے ساتھ ایک سیدھی سڑک میں تبدیل ہو جاتا تھا جو کہ آگے مختلف بازاروں میں جاتی تھی۔

وہ بھاگ رہی تھی۔

اس جگہ سے دور۔۔۔

اس وادی سے دور۔۔۔

یا پھر شاید خود سے دور۔۔۔

"یہاں آؤ گی تو ماتم بن جاؤ گی۔ "

ایک آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سیاحوں کا رش شام کی نسبت کم تھا۔ یہاں شام کے وقت سیاحوں کا ہجوم دن کے باقی اوقات کی نسبت بڑھ جاتا تھا۔

ہلکی ہلکی دھوپ ٹھنڈی دھند کی چادر چاک کیے نیچے زمین پر گر رہی تھی۔

"یہاں آؤ گی تو ماتم بن جاؤ گی۔ "

آواز پھر کانوں میں گونجی تھی۔

وہ ارد گرد کے ماحول سے بے خبر بے سمت چلتے ہی جا رہی تھی۔

ایک گمنام منزل کی جانب اس کے قدم میانہ روی سے اٹھ رہے تھے۔

"یہاں آؤ گی تو ماتم بن جاؤ گی۔"

اس کا جوڑا ڈھیلا پڑا تھا۔کچھ لٹیں بھاری جوڑے سے آزادی حاصل کر کے ادھر ادھر اڑنے لگی تھیں۔

نیم مدہوشی کے عالم میں وہ راستے سے پرے ہٹتے جا رہی تھی۔جس کے دوسری طرف ایک خطرناک ڈھلوان تھی۔

نمکین پانی ابھی بھی گالوں پر بہہ رہا تھا۔

آہ۔۔۔۔

شاردا میں ایک نئی موت واقع ہونے جا رہی تھی۔۔

ڈھلوان اس قدر خطرناک تھی کہ ذرا سا پاؤں پھسلنے پر وہ گہری کھائی میں گر جاتی۔

وہ لندن میں آسٹن لوگوں سے ملنے سے پہلے کئی بار خودکشی کا سوچ چکی تھی لیکن آج اس شخص سے ملنے کے بعد وہ پہلی دفعہ اپنی اس سوچ کو عملی شکل دینے جا رہی تھی۔

"یہاں آؤ گی تو ماتم بن جاؤ گی۔ "

شاردا کی وادیوں میں یہی الفاظ گونج رہے تھے۔اسی بے دھیانی میں اس کا پاؤں ایک چکنے پتھر پر پھسلا تھا۔

"آآآ!!!!!۔۔۔''ایک چیخ ان پہاڑوں میں بلند ہوئی تھی۔

قریب ہی تھا کہ اس کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا کہ اس کا بازو کہنی کے قریب سے کسی کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں آیا تھا۔

اگر تھامنے والا اسے نہ تھامتا تو وہ اس گہری کھائی میں بے موت ماری جاتی۔

اس شخص نے ماریہ کو سرعت سے اپنی جانب کھینچا۔ جھٹکا لگنے سے ماریہ کا سر اس کے کشادہ سینے سے ٹکرایا۔

برسوں کا فاصلہ لمحوں میں ختم ہوا تھا۔

ڈریم لینڈ کی شہزادی کو بچانے حقیقی دنیا کا راج کمار پہنچ چکا تھا۔

جسے شہزادی کے مشکل میں گھرے ہونے کی خبر دل کے سائرن سے ملی ہو اور وہ گھوڑے کو برق رفتار سے دوڑائے مقررہ وقت پر پہنچ کر ایک بلند کاسل سے گرتی ہوئی شہزادی کا ہاتھ تھام لے۔

یہ وہی راج کمار تھا جس کے خواب وہ پچھلے کئی برسوں سے دیکھتی آرہی تھی۔

یہ خوب کسی بھی شہزادی کے خوابوں سے کم نہ تھا لیکن اس خواب کا دوسرا حصہ پہلے حصے کی رعنائی کو ختم کر دیتا تھا۔

یہ کیسا ماجرا تھا؟

کہ خواب موت کے کنارے پر کھینچ کر لے جا رہا ہو اور تعبیر پیچھے سے آ کر زندگی بچا لے۔

وہ اس شخص کی آنکھوں میں غصے اور حیرت کے اثرات واضح دیکھ سکتی تھی۔

اس کی دونوں بھنوؤں کے درمیان دو چھوٹے چھوٹے بل تھے جو اس کی کشادہ جبین کو سکیڑے ہوئے تھے۔جبڑے غصے کی شدت سے کسے ہوئے تھے۔اس کا سانس بہت تیزی سے چل رہا تھا۔

تو کیا شہزادہ واقعی گھوڑا تیز دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچا تھا؟

وہ اسے یونہی کہنی سے تھامے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے ایک کم ڈھلوان دار جگہ پر لے آیا۔وہ اس کے ساتھ کھینچتے چلی جا رہی تھی۔

ایک محفوظ جگہ پر لا کر اس نے ماریہ کا بازو ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔اس کی مضبوط گرفت کی وجہ سے ماریہ کو اپنے بازو میں درد سا اٹھتا محسوس ہوا تھا۔

آنکھوں میں بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ اپنے بازو کو سہلانے لگی۔

اس کی بھوری آنکھوں نے سامنے والے کا چہرہ بار بار دھندلا ہوتے دیکھا تھا جس کے تاثرات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

تو پھر کیا ایک نیا امتحان شروع ہونے جا رہا تھا۔۔۔

ایک نیا باب۔۔۔

لیکن کون جانے کہ زندگی کے اس صفحے پر وقت کونسی داستان لکھنے جا رہا تھا؟

)۔۔۔۔۔۔۔۔(

میجر بلال کو وہ بس اسٹاپ پر چھوڑ کر واپس گیسٹ ہاؤس کی طرف آرہے تھے۔

دوپہر کا وقت تھا لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی لیکن ہجوم نہ ہونے کے برابر تھا۔

شاردا کی بل کھاتی سڑکوں سے ہوتے ہوئے وہ قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جیپ میں اپنی پسند کا ملی نغمہ لگائے وہ قدرت کی خوبصورتی کو سراہ رہے تھے۔

اس چمن کے پھولوں پر رنگ و آب تم سے ہے
اس زمیں کا ہر ذرہ آفتاب تم سے ہے
یہ فضا تمہاری ہے، بحر و بر تمہارے ہیں
کہکشاں کے یہ جالے، رہ گزر تمہارے ہیں

اسٹیئرنگ کو بائیں ہاتھ سے تھامے، دائیں کہنی کو فرنٹ ڈور سے ٹکائے ہاتھ کی مٹھی کی پشت کو لبوں سے لگائے وہ بڑے نارمل انداز میں ڈرائیونگ کر رہے تھے۔

اس زمیں کی مٹی میں خون ہے شہیدوں کا
ارضِ پاک مرکز ہے قوم کی امیدوں کا
نظم و ضبط کو اپنا میر کارواں جانو
وقت کے اندھیروں میں اپنا آپ پہچانو

دماغ میں ایل او سی کی صورتحال گردش کر رہی تھی۔ بھارت کی بلا اشتعال فائرنگ سے ان کے دو نوجوان شہید اور کچھ زخمی ہو چکے تھے۔

میجر بلال نے راستے میں انہیں مختصر سی بریفنگ دی تھی۔

یہ زمیں مقدس ہے ماں کے پیار کی صورت
اس چمن میں تم سب ہو برگ و بار کی صورت
دیکھنا گنوانا مت، دولتِ یقیں لوگو
یہ وطن امانت ہے اور تم امیں لوگو

سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں شاردا کی زمین کا منہ دھونے آسمان سے نیچے اتر رہی تھیں۔

دھند ابھی بھی تھی لیکن صبح کی نسبت اس کی شدت میں کمی آچکی تھی۔

ہوائیں خنکی سورج کی تپش پر غالب تھی۔

میر کارواں ہم تھے، روحِ کارواں تم ہو

ہم توصرف عنواں تھے، اصل داستاں تم ہو

نفرتوں کے دروازے خود پہ بند ہی رکھنا

اس وطن کے پرچم کو سر بلند ہی رکھنا

بازار سے آگے نکل کر سڑک سیدھے گیسٹ ہاؤس کی پہاڑی پر جاتی تھی جہاں سے یہ ایک پتھر یلے بل دار راستے میں تبدیل ہو کر پہاڑی پر واقع تینوں ٹورسٹ لاجز میں جاتی تھی۔

یہ وطن تمہارا ہے، تم ہو پاسباں اس کے

یہ چمن تمہارا ہے، تم ہو نغمہ خواں اس کے

نغمہ ختم ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کا گیسٹ ہاؤس تک کا سفر اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔

جیپ پہاڑی کی ڈھلوان کے قریب بنے ایک ہموار پارکنگ ایریا میں کھڑی کر کے وہ گیسٹ ہاؤس کی جانب چل دیے۔ جیپ کی چابی کو دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں گھماتے ہوئے وہ سیٹی کی دھن پر اپنا پسندیدہ نغمہ گنگنا رہے تھے جو کہ ابھی وہ کچھ دیر پہلے جیپ میں سنتے آرہے تھے۔

پہاڑی کی اونچائی چڑھتے ہوئے ان کی نظریں بلندی پر موجود ایک منظر سے ٹکرائی تھیں۔

سیٹی کی دھن یکدم تھمی اور چابی گھماتا ہاتھ وہیں ہوا میں معلق رہ گیا۔

وہاں پہ ایک لڑکی اوپر والے گیسٹ ہاؤس کے دوسری جانب جا رہی تھی جو کہ پہاڑی کی چوٹی کے قریب بڑے بڑے پتھروں اور موٹی لکڑیوں سے بنایا گیا تھا۔

اس کے چلنے کے انداز نے میجر ارتضی کی چھٹی حس کو بیدار کیا تھا۔

نظریں اس پر ٹکائے وہ تیزی سے چڑھائی چڑھنے لگے۔

"رُکو۔" وہ چلائے۔

لیکن اس لڑکی کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی شاید وہ ان کی آواز سن نہیں پائی تھی۔

"اوہیلوووو۔۔۔" وہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں چلائے تھے۔

اب کی بار بھی وہ ان کی آواز نہیں سن پائی تھی۔

اس جانب پتھروں کے ساتھ کانٹے دار تاریں لگا کر ایک باڑ سی بنائی گئی تھی تاکہ کوئی بھی اس طرف نہ جائے لیکن وہ اب نیست و نابود ہو چکی تھی۔

اگر وہ لڑکی وہاں سے گرتی تو یہ باڑ بھی اسے بچا نہ پاتی۔

میجر ارتضی اسے بار بار رکنے کا کہہ رہے تھے۔ لیکن وہ تھی کہ سرمئی کوٹ میں ہاتھ چھپائے بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

میجر ارتضی نے ساری جان لگاتے ہوئے وہ فاصلہ طے کیا تھا۔

ان کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس لڑکی کا پاؤں پھسلا تھا۔ قریب ہی تھا کہ وہ اس ڈھلوان سے نیچے گر جاتی کہ میجر ارتضی نے ایک لمبا ڈگ بھرتے ہوئے اسے کہنی سے تھام لیا۔

اور پھر پوری قوت سے اسے پیچھے اپنی جانب کی کھینچا۔ اس کا سر میجر ارتضی کے سینے ٹکرایا تھا اور حیرت کا ایک دھچکا میجر ارتضی کو اتنی بلندی پر لگا تھا۔

وہ وہی لڑکی تھی جو کہ شاردا پیتھ پر انہیں ملی تھی۔

جو کل انہیں وائلن بجانے سے منع کرنے آئی تھی۔

اس کے گالوں پر ابھی بھی پانی بہہ رہا تھا۔

وہ اسے کھینچ کر ایک کم ڈھلوان دار جگہ پر لے آئے۔ یہاں آکر انہوں نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

چہرے پر وہی تاثرات تھے جو اسے دیکھتے ہی امڈ آئے تھے۔

"بہری ہو کیا؟ کب سے چلا رہا ہوں کہ رک جاؤ، رک جاؤ مگر بنا کچھ سنے آگے چلتے ہی جا رہی ہو۔" سینے پر بازو باندھے وہ براہِ راست اس کی ڈبڈباتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

ان کے لہجے سے وہ ذرا سہمی تھی۔ دائیں ہاتھ سے گال رگڑتے ہوئے اس نے خاموش نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

"جانتی ہو اگر میں وقت پر ادھر نہ پہنچ پاتا تو اس وقت تم میرے سامنے کھڑے ہونے کی بجائے نیچے اس جگہ پڑی ہوتی اور کل تک تمہاری اس کمزور سی لاش کو یہاں کے جانور ہضم بھی کر چکے ہوتے۔" انہیں کتنا احسان جتلانا آتا تھا۔ وہ واقعی ایک کمزور لاش تھی جس سے ایک جانور کا پیٹ بھی نہ بھرتا۔

"کاش تم وقت پر نہ پہنچ پاتے۔" ٹوٹے لہجے سے کہتے اسے ان کے بروقت پہنچنے پر افسوس ہوا تھا۔

"مرنا چاہتی ہو کیا؟" پوچھنے کا انداز بہت نارمل سا تھا۔

"شاید۔" ایک ہلکی سی آواز اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ اس کی ناک اور گال رونے کی وجہ سے سرخ ہو چکے تھے۔

"فرض کرو اگر مرنے کی بجائے صرف تمہاری ہڈیاں ٹوٹ جاتیں تو۔۔۔؟" چہرے پر سنجیدگی سجائے انہوں نے اس کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑا تھا۔

ماریہ نے بھیگی پلکیں اٹھا کر ان کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا تھا۔ اس کا دماغ کام کرنا بند کر چکا تھا اس لیے وہ میجر ارتضی حدید کی یہ سادہ سی بات بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔

" بھئی میرا تو یہ ماننا ہے کہ اگر انسان نے مرنا ہی ہے تو ایسی جگہ پہ کوشش کرے جہاں اس کے مرنے کے سو فیصد چانسز موجود ہوں۔"

وہ کتنی آسانی سے یہ بات کہہ گئے تھے۔

ماریہ ان کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا پائی تھی۔۔۔

بھوری آنکھیں بے یقینی میں ڈوبی تھیں۔۔۔

"اچھا میں تمہیں ایک جگہ بتاتا ہوں۔ یہ جو سامنے پہاڑ نظر آرہا ہے نا۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی توجہ بائیں جانب کے پہاڑ کی طرف مبذول کروائی۔

"یہ جگہ خودکشی کے لیے بہترین ہے۔ یہاں اس معاملے میں کوئی دخل اندازی بھی نہیں کرتا کیونکہ وہاں کوئی جاتا ہی نہیں سوائے ان بے قدروں کے جنہیں اپنی زندگی پیاری نہیں ہوتی۔ وہاں سے کودو گی تو پل بھر میں زندگی کی نعمت سے آزاد ہو جاؤ گی۔ یقین جانو جان نکلنے میں دیر بھی نہیں لگے گی۔ لیکن ایک بات ہے کہ ادھر زیادہ بڑے جانور پائے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری لاش ان میں لڑائی کا باعث بن جائے۔" وہ اتنی سنجیدگی سے بتا رہے تھے جیسے اسے خودکشی کا نہیں ٹریفلگر اسکوائر کا پتا بتا رہے ہوں۔

ان کے لہجے میں چھپے طنز کو وہاں کوئی بھی محسوس کرسکتا تھا لیکن یہ ماریہ تھی۔

لہجوں کی زبان سے ناآشنا۔۔۔

اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

" کبھی مرنے کے لیے اتنی دور سے یہاں بلواتے ہو۔مرنے لگو تو کسی ہیرو کی طرح بچانے آجاتے ہو۔بچانے کے بعد پھر سہل موت کے طریقے بتاتے ہو۔آخر چاہتے کیا ہو تم؟" بھوری آنکھیں غصے سے پھیلی تھیں۔اس کی آنکھوں میں ان انگاروں کو دیکھا جا سکتا تھا جن کی شدت میجر لا تضی اپنے چہرے پر محسوس کر رہے تھے۔

"ایک منٹ۔۔۔ میں نے تمہیں یہاں مرنے کے لیے بلوایا تھا؟ میں نے؟" شہادت کی انگلی اپنی جانب کیے وہ حیرت سے دوچار ہوئے تھے۔

پہیلی مزید الجھی تھی۔

"ہاں۔۔کیونکہ وہ تم ہی ہو جس نے پچھلے کئی سالوں سے میری زندگی کو مشکل بنا رکھا ہے۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکی۔

"ٹھیک ہی کہتے تھے تم کہ یہاں تمہاری زندگی ماتم بن کر رہ جائے گی۔اور دیکھو ایسا ہی ہو رہا ہے۔میری سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں کام کرنا چھوڑتی جا رہی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہہ رہی ہوں، کدھر جا رہی ہوں؟ دل بغاوت پر اتر آیا ہے۔ عقل ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ میں پاگل ہوتے جا رہی ہوں۔۔پاگل۔۔۔" بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑے وہ ان پر چلانے کے سے انداز میں بولتے ہوئے ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

جبکہ میجر لا تضی سانس روکے، بت بنے گم صم اس کے یہ نئے انکشافات سن رہے تھے۔

اس کی یہ بات سن کر میجر ارتضی کو اس کے پاگل ہونے کا گمان ہوا۔

" کتنا روتی ہو یار تم۔۔۔تمہارے سر میں درد نہیں ہوتا؟" ہمیشہ کی طرح وہ ایسی بات کو ایک مذاق میں ٹال گئے۔انہیں اس کی دماغی حالت پر اسی دن شک ہو گیا تھا جب وہ شاردا یونیورسٹی کے قریب بلاوجہ مڑ کر انہیں گھورنے لگی تھی۔لیکن کل کے اور آج کے واقعہ کے بعد انہیں اپنے اس شک پر یقین ہو چلا تھا۔

"انسان ہو یا نیلسن کا بے حس مجسمہ؟؟" اسے نیلسن یاد آیا تھا۔

سنگ دل سا۔۔

بے حس سا۔۔

جس پر کسی کے غم و رنج کا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔۔۔

بالکل اس شخص کی طرح جو اس وقت اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اپنی اس بات پر اسے ان کا ایک قہقہہ فضا میں ابھرتا محسوس ہوا تھا جس کے اثر سے ان کے گالوں کے بھنور مزید گہرے ہوئے تھے۔

"آں۔۔یہ تو اب تمہیں پتا ہوگا۔آخر پچھلے کئی سالوں سے مجھ پر پی ایچ ڈی کر رہی ہو۔" چہرے پر غصے کی جگہ شرارت لے چکی تھی۔وہ واقعی معصوم تھی۔

بہت ہی زیادہ۔۔

اور اس کی یہی معصومیت میجر لا تضی کے ننھے گڑھوں کو شوخ کر گئی تھی۔

جواباً وہ انہیں صرف گھور کر رہ گئی۔رونے کی وجہ سے اس کی ہچکی بندھ چکی تھی۔

"ایک اور انکشاف آج مجھ پر ہوا ہے کہ لڑکیاں کسی بھی ملک کی ہوں، آدھی پاگل ہی ہوتی ہیں۔" کسی کے غصے کو ہوا دینی ہو تو میجر لا تضی یہ کام سب سے اچھا کر سکتے تھے۔

ماریہ کے عارض مزید دہکے تھے آنکھوں کے انگارے اور سرخ ہوئے تھے۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔آنکھیں بند کرو اور تین لمبے لمبے سانس لو۔۔۔اس طرح۔" میجر لا تضی نے آنکھیں بند کر کے لمبے سانس لیتے ہوئے اسے اپنی پیروی کرنے کا کہا۔

"ارے لو بھی۔" وہ بس انہیں غصے سے دیکھے جا رہی تھی۔ان کے دوبارہ یوں کہنے پر اس نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے ان کا عمل دہرایا تھا۔

"اب اسی طرح دو اور سانس لو۔" اس نے پھر دو لمبے لمبے سانس بھرے تھے۔

"اب آنکھیں کھول دو۔" اس نے حکم کی تعمیل کی تھی۔

"امید ہے کہ اب تمہیں اچھا محسوس ہو رہا ہوگا۔" وہ میجر لا تضی تھے۔ پل بھر میں غصہ دلانے والے اور پل بھر میں غصہ جھاگ کی مانند بٹھانے والے۔

وہ اس دھوپ چھاؤں جیسے شخص کو پھر سے تکنے لگی۔

کچھ دیر کے لیے شاردا میں خاموشی چھائی تھی جسے میجر ارتضی نے اپنی آواز سے توڑا تھا۔

"دیکھو۔۔ میں تم سے ان ساری باتوں کا پس منظر نہیں پوچھوں گا لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ تمہیں میری طرف سے جو غلط فہمی ہو رہی ہے وہ تمہیں دور کر لینی چاہیے۔ کیونکہ میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ کوئی میری وجہ سے اپنی جان دے دے۔" نہایت دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ دیا تھا۔

" کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟" ٹراؤزرز کی جیب میں دایاں ہاتھ چھپائے وہ گیسٹ ہاؤس کی جانب بڑھنے لگے۔

"ماریہ۔" ہولے سے لب وا ہوئے تھے۔

وہ بھی سر جھکائے ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

"دیکھو ماریہ۔۔زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ اسے چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ضائع کر دیا جائے۔معاملات کو حل کیا جاتا ہے، ان سے فرار نہیں حاصل کیا جاتا۔اور موت تو کسی بھی مسئلے سے فرار کا راستہ نہیں ہے۔۔ہرگز نہیں۔ " وہ بل دار راستے کے قریب پہنچ گئے تھے جو کہ سید ھا ماریہ کے گیسٹ ہاؤس کی طرف جاتا تھا جبکہ اس کی دوسری شاخ مزید دو شاخوں میں بٹ کر نیچے دوسرے دونوں گیسٹ ہاؤسز کی طرف جاتی تھی۔

"مجھے تمہارا ماضی جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔اور نہ ہی میں اس کے لیے پر تجسس ہوں لیکن پھر بھی اگر تم اس حوالے سے مجھ سے کبھی کوئی بات کرنا چاہو تو تم میری سماعتوں کو ہمیشہ منتظر پاؤ گی تم کبھی بھی میری طرف سے مایوسی کا شکار نہیں ہو گی۔ " وہ آسٹن سے بھی زیادہ میٹھا اور دھیما لہجہ رکھتے تھے۔وہ جیسے جیسے بول رہے تھے ماریہ کے اندر پھر سے جینے کی تمنا بڑھتی چلی جا رہی تھی۔جیسے کوئی اپنا ۸ لفظوں کے ذریعے سے اسے آبِ حیات کے جام پیش کر رہا ہو۔

"میں نے اب سے پہلے تم سے جتنی باتیں بھی کی تھیں وہ سب مذاق میں کہی تھیں اگر تمہیں ان سے کسی قسم کی کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں کیونکہ اگر میں تم پر ترس کھانے بیٹھ جاتا تو کبھی بھی تمہیں اس فیز سے نکال نہ پاتا جس کا تم اب سے کچھ دیر پہلے شکار تھی۔"

گرم کرنوں نے لہجے کی سردیوں کو کم کیا تھا۔

"تمہیں کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ کوئی تم پر ترس کھائے۔خود کو اتنا مظلوم پیش کرو گی تو دنیا تمہیں اور مظلوم بنائے گی۔ہمدردی کی اوڑھ میں تمہیں اور نقصان پہنچائے گی۔اگر میں یہاں سے گزر نہ رہا ہوتا تو شاید مجھے کبھی بھی تمہاری موت کی خبر نہ ہوتی۔اور تم کہہ رہی ہو کہ تم میری وجہ سے جان دینے جا رہی تھی۔اس شخص کے لیے جو تمہیں جانتا تک نہیں۔جس نے آج سے دو دن پہلے تمہیں دیکھا تک نہیں۔بھلا کوئی یوں بھی جان دیتا ہے؟" میجر لا تضی اس سے ایک قدم آگے چل رہے تھے۔

"بھلا کوئی یوں بھی جان لیتا ہے؟ "

سوال کے جواب میں سوال آیا تھا۔

ایک ایسا سوال جو خود اپنے اندر کئی سوال لیے ہوئے تھا۔

میجر ارتضیٰ کے قدم وہیں تھمے تھے۔ ماریہ کے اس سوال نے انہیں پلٹنے پر مجبور کیا تھا۔

وہ رکے۔۔

رک کر پلٹے۔۔۔

وہ انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

آنکھوں میں کئی سوال لیے۔۔۔۔

وہ اس کے چہرے پر لکھی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگے لیکن ناکام ٹھہرے۔

"میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔۔۔ یہ میرا کارڈ ہے اگر تمہیں یہاں کسی بھی قسم کی پریشانی ہو تو تم مجھے کسی بھی وقت کال کر سکتی ہو۔" انہوں نے اپنے والٹ سے ایک کارڈ نکل کر اس کی جانب بڑھایا جس پر ان کے نام کے ساتھ ساتھ ان کا کانٹیکٹ نمبر اور ای میل ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ کسی احساس کے تحت ماریہ نے ہاتھ بڑھا کر وہ کارڈ تھام لیا۔

"الوداع اچھی لڑکی۔" وہ مزید وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے۔

"الوداع۔" بجھے بجھے سے لہجے میں اس نے انہیں" گڈ بائے" بولا تھا۔

اس کا دل چاہا تھا کہ وہاں کوئی جادو کی چھڑی گھمائے اور وہ وقت وہاں ہمیشہ کے لیے ٹھہر جائے۔

اور وہ شخص اس کے سامنے یونہی رہے۔۔۔

ہمیشہ۔۔۔

وہ انہیں پتھریلے راستے پر تیزی کے ساتھ نیچے جاتے دیکھ رہی تھی۔

جیسے کوئی شہزادہ اپنی شہزادی کو بیچ راستے میں چھوڑ جائے اور شہزادی اسے خود سے دور ہوتے بے بسی سے دیکھتی رہے۔

وہ کتنا بھی چاہے تو روک نہ پائے۔۔۔۔

خود پیچھے جانا چاہے تو جانہ پائے۔۔۔

کہیں کسی بے نام مقام پر صرف معلق ہو کر رہ جائے۔۔۔۔

کہ وادیوں میں عشق کی داستانیں یونہی تو امر ہوتی ہیں۔۔۔۔

)۔۔۔۔۔۔۔۔(

ایہہ شیر بہادر غازی نیں، اے کسے کولوں وی ہردے نئیں
اینہاں دشمناں کولوں کی ڈرنا، اے موت کولوں وی ڈردے نئیں
ایہہ اپنے دیس دی عزت توں، جان اپنی دیندے ول کڑے
ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

صبح کا وقت تھا۔ سورج کی کرنیں نیلے آسمان پر دھیرے سے پھیل رہی تھیں۔ میڈم نور جہاں کی آواز فضا میں جادو جگا رہی تھی۔ خوش گلو پرندے بھی اس گیت میں میڈم نور جہاں کا ساتھ دے رہے تھے۔ میجر بلال آن ڈیوٹی ریڈیو سے دل بہلا رہے تھے۔

وہ کل ہی اس جگہ پہنچ چکے تھے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے پاکستان کے شیر دل جوانوں کے ساتھ مل کر دشمن کو خاک چٹا دی تھی۔ کل کا جواب ان کے لیے کافی تھا۔

یہاں آکر انہیں نائیک عطااللہ غازی کا ساتھ دوبارہ ملا تھا۔ ایک بہت ہی پرخلوص انسان کا ساتھ۔۔۔۔

کہ جس ساتھ کی کوئی بھی خواہش کر سکتا تھا۔۔۔

وہ خیمے کے قریب لکڑیوں سے آگ جلا کر اس پر کیتلی رکھ کر چائے بنا رہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ یہ گیت بھی گنگنا رہے تھے۔

دھن بھاگ نیں اوہناں ماواں دے، جنہاں ماواں دے ایہہ جائے نیں
دھن بھاگ نیں بہن بھراواں دے، جنہاں گودیاں ویر کھڈائے نیں
ایہہ آن نیں آناں والیاں دے، نئیں ایس دی تینوں سڈ کڑے
ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

چائے تیار کر کے وہ دو کپوں میں انڈیل کر میجر بلال کے پاس لے آئے۔ جہاں وہ آنکھیں بند کیے اس گیت سے اپنے لہو کو گرما رہے تھے۔

ایہہ سودا نقد وی نئیں ملدا، تو لبدی پھریں ادھل کڑے
ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے، کی لبنی اے وچ بازار کڑے
ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

آواز مدھم ہوئی تھی اور پھر ختم ہوئی تھی۔

"سر جی۔" عطاءاللہ نے پاس بیٹھتے انہیں پکارا۔

گیت کا سحر ٹوٹا تھا۔ اور وہاں اب آر جے پروگرام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

میجر بلال نے آنکھیں وا کیں تو سامنے نائیک عطااللہ غازی تھے جن کی طرف دیکھ کر ان کے لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ بکھری تھی۔ انہوں نے ریڈیو بند کر دیا۔ فضا میں سکوت طاری ہو گیا تھا صرف پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں۔

"شکریہ جناب۔ میں چائے کا ہی انتظار کر رہا تھا مگر بڑی دیر لگا دی مہرباں آتے آتے۔" انہوں نے کرسی کی ٹیک چھوڑ کر چائے کا کپ تھام لیا۔

ان کے درمیان گپ شپ لگنے لگی۔

"عطاءاللہ! ایک بات پوچھوں؟" میجر بلال نے عطاءاللہ کا جھریوں سے بھرا چہرا بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"حکم کریں سر جی۔" عطاءاللہ چوکنا ہو کر بیٹھ گئے۔

"عطاءاللہ تم اتنا عرصہ آرمی میں رہے ہو۔پھر بھی ریٹائر ہونے کے بعد بھی تم نے خود کو مدد کے لیےپیش کر دیا۔عمر کے اس حصے میں تو تمھیں اب آرم کرنا چاہیے۔ "ناجانے یہ بات میجر بلال کو کیوں سوجھی تھی۔

"سر جی میں تب تک آرمی میں رہوں گا جب تک میرا نام عطاءاللہ غازی سے عطاءاللہ شہید نہیں ہوجاتا۔میں ان میدانوں میں اس وقت تک آتا رہوں گا جب تک سینے پہ دشمن کی گولی نہیں کھالیتا۔یہ مٹی مجھے جب جب بھی بلائے گی میں سر کے بل دوڑا آؤں گا۔مجھے یہاں زیادہ سکون ملتا ہے۔میں جو پل فوج کی خدمت میں گزارتا ہوں وہ مجھے زیادہ خوشی دیتے ہیں۔بس جس دن مجھے لگے گا کہ میں نے اس مٹی کا قرض چکادیا ہے تو اس دن چین سے اسی مٹی کی چادر اوڑھ کو سوجاؤں گا۔"فرطِ جذبات سے عطاءاللہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔وہ اس وطن سے،اس کے لوگوں سے ،اس کی فوج سے بےلوث محبت کرتے تھے۔

میجر بلال ہمیشہ سے عطاءاللہ غازی سے بہت متاثر تھے۔اس وقت بھی وہ لاجواب ہو چکے تھے۔عطاءاللہ غازی ان کے لیے ایک مثال تھے۔وہ جب بھی کسی مشن پر جاتے نائیک عطاءاللہ غازی کی باتیں انہیں ہمیشہ ایک نیا جذبہ دیتی تھیں۔

"عطاءاللہ اگر میں لڑکی ہوتا تو تمہاری ہی دلہن بنتا۔"میجر بلال نے لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے کہا۔جس سے دونوں کے قہقہے چھوٹ گئے۔

)-------(

اگلے روز ان مجاہدوں کی کپتانی کیپٹن عاطف کو سونپ دی گئی۔اور ان کا کام کیپٹن عابد کو دے دیا گیا جنہیں کیپٹن عاطف کی ہی جگہ پر بھیجا گیا تھا۔میجر بلال صبح صبح ہی ہیڈ آفس چلے گئے تھے جہاں پہ ایک نہایت اہم میٹنگ ہونے ولی تھی اور میجر بلال کو وہاں ساری صورتحال کی بریفنگ کرنا تھی۔

میٹنگ میں نہایت نازک پہلوؤں پہ گفتگو کی گئی اور دشمن سے نبٹنے کے لیے ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دیا گیا۔میجر بلال ہدایات لیکر چلے گئے اور نئے منصوبے کے تحت اہلکاروں کی پوزیشنز تبدیل کر دیں۔بھارت کے لیے پچھلا جواب ہی کافی تھا۔شاید اسی لیے اپنے زخموں کے بھرنے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

) -------(

اگلی صبح ان سب کو پاکستان کے قبائلی علاقے وزیرستان جانا تھا جہاں دشمن جہنم واصل ہونے کے لیے اور اس ملک کے جانباز سپاہی جام شہادت نوش فرمانے کے لیے بے تاب تھے۔

رات کے وقت میجر بلال اور ان کی قیادت میں جانے والے اہلکار کیمپس کے باہر بون فائر سے لطف اندوز ہور ہے تھے۔وہ سب اپنی حسین یادوں کو وہاں ہوا میں نقش کرنے کی کوشش کرر ہے تھے۔کل کون رہے گاان میں سے وہاں موجود کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا تھا۔مگر آج وہ سب یہاں موجود تھے اور یہی کافی تھا۔

میجر بلال کو شاعری کرنا بہت پسند تھا۔اسی لیے انہوں نے بیت بازی کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ے شب وصال ہے،گل کر دو ان چراغوں کو
خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا

پہلا شعر بھی میجر بلال ہی کی طرف سے آیا تھا۔جس پر سب نے خوب واہ واہ کی۔ان سب نے دو ٹیمیں تشکیل دی تھیں۔ٹیم اقبال میں میجر بلال اور عطاءاللہ جبکہ ٹیم قائد میں کیپٹن عابد، کیپٹن عاطف اور باقی سب ساتھی شامل تھے۔میجر بلال اکیلے ہی کافی تھے اس میدان کو جیت لینے کے لیے۔

ے ایک ہی انجام ہے اے دوست حسن و عشق کا
شمع بھی بجھتی ہے پروانوں کے جل جانے کے بعد

کیپٹن احمر ٹیم قائد کی جانب سے میدان میں اترے تھے۔

"د" کیپٹن عابد نے بلند آواز میں کہا۔

دل دھڑکتا ہے تو دستک کا گماں ہوتا ہے
کر کے انکار بھی آجاتے ہیں آنے والے
جانے کیوں روتے ہیں دل کھول کے تنہائی میں
لوگ ہنس مکھ سے، یہ اوروں کو ہنسانے والے

میجر بلال کا شعر پڑھنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ اشعار خود بخود دل میں اترتے چلے جاتے۔عطاءاللہ نے میجر صاحب سے یہ اشعار دوبارہ سنے۔

ے یہ دشت سے امڈ آیا ہے کس کا سیل جنوں
کہ حسن شہر کھڑا ہے نقاب اٹھائے ہوئے

"واہ،واہ" کیپٹن عاطف کے شعر پر کیپٹن عابد نے کھڑے ہو کر داد دی۔وہ سب ایسا ہی کرر ہے تھے۔میجر بلال کے شعر پر صرف عطاءاللہ ہی داد دیتے۔حالانکہ وہ سب میجر صاحب کی شاعری کے انتخاب کے دل سے قائل ہو چکے تھے اور وہ بس اپنی ٹیم کا پلڑا ابھاری رکھنا چاہتے تھے۔

ے یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سر رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے

عطاءاللہ نے بھی کیپٹن عابد کی طرح نقل اتارتے ہوئے بلند آواز میں واہ واہ کہا۔میجر بلال اسی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ شعر سب کی سماعتوں کی نذر کرر ہے تھے۔ان میں سے کسی کو بھی اتنے اشعار نہیں آتے تھے جتنے میجر صاحب کو آتے تھے۔

جلد یا بدیر جیتنا میجر صاحب نے ہی تھا۔

یہ ضبط چھوٹ گیا تو تمہاری یاد آئی
میں تھک کے ٹوٹ گیا تو تمہاری یاد آئی
تمہارے بعد نہ تھا کوئی میرا،دل کے سوا
یہ دل بھی روٹھ گیا تو تمہاری یاد آئی

”برخودار کس کی یاد آئی ہے آپ کو؟“ میجر بلال کے پوچھنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ کیپٹن عابد ہڑبڑا گئے۔غلطی ہوگئی کیپٹن عابد سے جو میجر صاحب کے سامنے شعر کہہ دیا۔

”کسی کی بھی نہیں سر۔میں نے تو ویسے ہی شعر کہا تھا۔“ کیپٹن علد کو بھی بہت کچھ چھپانا آتا تھا۔

”ایسے تو نہیں کہا جاتا شعر۔“بس اب کیپٹن عابد بچنے والے نہیں تھے۔موضوع بدلا جا چکا تھا۔

”پہلے آپ بتائیں۔“ کیپٹن عاطف نے کیپٹن عابد کی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

”بچے کیا بتاؤں؟“خود پر بات آئے تو میجر صاحب ایسے ہی انجان بن جاتے تھے۔

”وہی جو اس دن ہم پوچھ رہے تھے۔“ کیپٹن عابد نے مبہم سا اشارہ دیا۔

عطاءاللہ بات سمجھتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب ان سب نے انہیں ہی ہر بات میں لے آنا تھا خاص طور پر میجر بلال نے۔

”سر آپ کے مجازی خدا چلے گئے۔“ کیپٹن عابد نے عطاءاللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

جواب میں میجر بلال مسکرا بھی نہ سکے۔جانے کیوں وہ ایکدم اداس ہو گئے تھے۔ میجر بلال نے انہیں روکا نہیں۔جانے والے کہاں رکتے ہیں بھلا!اگر ایسا ہوتا تو وہ برش کو نہ روک لیتے۔

ہمیشہ کے لیے۔۔۔

اپنے پاس۔۔۔

وہ سب کچھ پریشان ہوگئے کہ ہمیشہ چہرے پر سجی رہنے والی مسکراہٹ کہاں غائب ہوگئی تھی۔

”سوری سر۔لگتا ہے آپ کو ہماری کوئی بات بری لگی ہے۔“ کیپٹن عاطف کو کچھ غلط بول دینے کا احساس ہوا۔

”نہیں۔ایسی بات نہیں ہے۔میجر بلال کو تو کبھی اپنے دشمن کی بات بری نہیں لگی اور تم تو پھر بھی میرے جگر ہو۔“ میجر بلال کے چہرے پر وہی سرخی مائل مسکراہٹ آ گئی جس سے ان کا چہرا روشن ہوجاتا تھا۔کیپٹن عاطف بھی مسکرا دیے۔

وہ تاروں بھری رات میجر بلال کو خلاف معمول اداس کر رہی تھی۔وہ سب یہ بات محسوس کر چکے تھے اس لیے میجر صاحب کو تنہائی فراہم کے لیے شب بخیر بولتے ہوئے کیمپس میں چلے گئے۔

اب تو ہر تاروں بھری رات یونہی گزرنے والی تھی شاید۔۔۔

اداس سی۔۔۔

خاموش سی۔۔۔

موت کی تاریکی سی۔۔۔

"میں جب بہت چھوٹی ہوتی تھی تب میں نانو سے اکثر ایک سوال کیا کرتی تھی کہ مرنے کے بعد لوگ کہاں چلے جاتے ہیں؟ تو نانو ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ مرنے کے بعد لوگ اوپر آسمان پر تارا بن کر چمکنے لگتے ہیں۔"

وہ سر اٹھا کر تاروں سے سجے آسمان کو دیکھنے لگے۔ جو انہیں خود سے بہت بلندی پر محسوس ہوا تھا۔

"تب میرا بھی دل کرتا تھا کہ میں بھی تارا بن کر چمکوں۔"

ان کی نظر ایک سب سے زیادہ چمکتے تارے پر پڑی اور دل ایک لمحے کے لیے بند ہوا تھا۔

"میں یہ دیکھ رہی تھی کہ اس چھت سے کونسا تارا واضح نظر آتا ہے۔جب میں بھی تارا بن جاؤں گی تو آپ بھی یہاں بیٹھ کر دیکھیے گا سب سے واضح نظر آنے والا تارا آپ کی برش ہوگی۔"

ایک ننھا سا قطرہ ان کی آنکھ سے باہر چھلکنے کے لیے تیار تھا لیکن ابرش سے کیے گئے وعدے نے اس کی یہ کوشش ناکام بنادی تھی۔

موٹی موٹی لکڑیاں ڈھیرے ڈھیرے راکھ میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ کہیں سے کوئی چنگاڑی اٹھتی اور کچھ بلندی پر جا کر بے موت ماری جاتی۔وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔اور پھر آگ کو پانی سے بجھاتے خیمے میں چلے گئے۔وہاں پہ عطاءاللہ بے فکر سوئے ہوئے تھے۔وہ ایک نظر ان پر ڈالتے ہوئے سونے کے لیے لیٹ گئے۔ بہت ہی جلد نیند نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

)-------(

صبح فجر کی نماز کے بعد سب نے وطن کی سلامتی کے لیے دعا کی تھی۔عطاءاللہ کے ہاتھ کی چائے پینے کے بعد میجر بلال نے ملک کے ان شیروں سے مختصر خطاب کیا تھا جو کہ ان کے خون کو گرمانے کے لیے کافی ثابت ہوا تھا۔

اللہ پر بھروسہ کر کے وہ اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔

جہاں پر دشمن پر پہلے ہی ہوائی اسٹرائک کردی گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں بہت سے شر پسند اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے۔

ضرب عضب آپریشن کا باقاعدہ آغذ کر دیا گیا تھا۔

دو دن مسلسل دشمن سے لڑائی کے بعد اس ملک کا ایک اور بیٹا شہادت کے رتبے پر فائز ہوا تھا۔

کہ جو کچھ دیر پہلے نائک عطاءاللہ غازی کے نام سے جانا جاتا تھا لیکن اب اس کا نام تاریخ کے اوراق میں نائک عطاءاللہ شہید لکھا جائے گا۔

یہی تو ان کی خواہش تھی۔۔۔

اور قدرت نے ان کی یہ خواہش ان سنگلاخ پہاڑیوں میں پوری کر دی تھی۔۔۔

میجر بلال نے انہیں کتنا روکا تھا لیکن وہ اپنے اس خواب کی تعبیر کے لیے رکے نہیں تھے۔

شہادت جن کا مقدر ہوتی ہے وہ اس منزل پر پہنچ ہی جاتے ہیں۔۔۔

ہزاروں عذر مل کر بھی قدم ڈگمگا نہیں سکتے۔۔۔

برش کے بعد ان کی زندگی کے بعد دوسرا سب سے عزیز شخص انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

برش کی جان بھی ان درندہ صفت انسانوں نے لی تھی۔۔

اور اب۔۔۔۔!

اور اب ان کے عزیز از جان عطاءاللہ کی بھی۔۔۔

کاش۔۔۔!

کاش میجر بلال اس وقت بتا سکتے کہ یہ گولیاں کتنی ظالم ہوتی ہیں۔

کیسے انہوں نے ان کے دو پیاروں کو ان سے ہمیشہ کے لیے دور کیا تھا۔۔۔۔

کاش۔۔۔۔!

)-------(

جاری ہے۔۔۔

حصہ ہشتم

میں تم لوگوں سے معذرت چاہتی ہوں۔ آج جو کچھ بھی ہوا وہ سب لاشعوری تھا۔' مجھے احساس ہے کہ میں نے اپنی اس بے خبری میں تم سب کا بہت دل دکھایا ہے۔ خاص طور پر آسٹن کا۔'' وہ سب آسٹن لوگوں کے کمرے میں بیٹھے وڈیو کی ایڈیٹنگ کر رہے تھے تبھی ماریہ ادھر آئی تھی اور سر جھکائے اپنے رویے کی معافی مانگنے لگی۔

" کوئی بات نہیں۔ہم سمجھ سکتے ہیں۔'' چارلس نے اسکرپٹ کی فائلز سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"آسٹن خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔ میں اپنے رویے کے حوالے سے بہت شرمندہ ہوں۔''اب کی بار وہ آسٹن کی جانب متوجہ تھی جو نجانے موبائل پر کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں ماریہ۔ دوستوں میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔''مسکراتے ہوئے اس نے ایک نظر اسکرین سے ہٹا کر اسے دیکھا تھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

"تم لوگوں نے واقعی مجھے معاف کر دیا ہے نا؟''اسے ابھی بھی اپنے دوستوں کی فراخدلی پر یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں جی مادام۔ کوئی تحریری ثبوت چاہیے کیا؟'' آرنلڈ نے چیونگم کا غبارہ پھلاتے ہوئے کہا۔غبارہ پھس کی آواز سے اس کے ہونٹوں پر ہی بیٹھ گیا۔

"شکریہ دوست۔'' دل سے ایک بوجھ ہٹا تھا۔

"چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ایویں فضول سوچتی رہتی ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا تھیسس کہاں تک پہنچا؟''ٹالی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی تھی۔اور اس کا گالوں پہ پیلد کرتے ہوئے وہ واقعی بہت اچھی دوست لگی تھی۔

" کچھ چیزیں رہ گئی ہیں باقی تقریباً ہو چکا ہے۔''وہ مسکراتے ہوئے اس سے گویا ہوئی۔

"واپسی کا پروگرام ہے تمہارا؟'' آسٹن موبائل چھوڑ کر پاس پڑے نوٹ پیڈ پر کچھ تحریر کرنے لگا۔

"فی الحال تو کوئی ارادہ نہیں ہے۔''وہ چہکی تھی۔

اس کے اس جواب نےسب کو اپنا اپنا کام چھوڑ کر اپنے چہرے کی جانب متوجہ کر لیا تھا۔

" کیا ہوا؟'' سب کے حیرت سے کھلے ہوئے منہ دیکھ کر وہ بھی حیرت زدہ ہوئی۔

" کیوں مادام واپس جانے کو دل نہیں کر رہا؟'' آرنلڈ ابھی بھی چیونگم کو بے دردی سے چبا رہا تھا۔

"اور اگر میں کہوں کہ نہیں۔ تو؟''اس نے جواب کے لیے اپنا سوال ادھورا چھوڑا۔

آسٹن کے ہاتھ سے پنسل نیچے گری تھی۔

"وجہ پوچھ سکتے ہیں ہم؟''چارلس فائلز ایک طرف رکھ کر پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"افف۔۔۔وجہ ہی تو نہیں بتا سکتی۔''وہ ٹالی کو ہاتھ سے پکڑ کر گول گول گھمانے لگی۔

چہرے پر خوشی کے رنگ ہرسو بکھرے تھے۔۔۔لہجہ چہکا تھا۔

جیسے کوئی بہت بڑی بات لفظوں میں بیان ہی نہ کی جاسکے۔

ایسی کیا وجہ ہوسکتی تھی کہ لندن کی وہ لڑکی جو لندن کو چھوڑنے پر سہم سی جاتی تھی آج وہی واپس جانے سے انکار کر رہی تھی؟

یہ سوال سب کے ذہنوں میں ابھرا تھا لیکن کچھ غلط ہونے کی گھنٹی صرف آسٹن کے دل میں بجی تھی۔

"آہم آہم۔۔۔کیا بات ہے جناب؟ آج اس چہرے پر بہار کدھر سے آئی ہے؟''ٹالی نے اس کے گال پر نرمی سے چٹکی کاٹی تھی۔

"بس آہی گئی کہیں سے۔'' یہ بات کہتے ہوئے وہ شرمائی تھی۔

"اوہو۔۔۔ہماری دوست تو شرما بھی رہی ہے۔''اب کی بار آرنلڈ نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر زور سے گھمایا تھا۔

اور وہ گھومی تھی۔

خوشی سے۔۔۔

ایک عجب سے احساس سے۔۔۔

"میرا خیال ہے ٹالی کہ تمہاری ریپنزل کے لیے کوئی شہزادہ اس لینڈ میں اتر آیا ہے۔''چارلس کا لہجہ ذومعنی تھا۔

جس نے آسٹن کے دل کی دھڑکن کو تیز کیا تھا۔

دل مچل ہی تو گیا تھا ایسی بات سن کر کہ جسے نہ سننے کی وہ ہمیشہ دعا مانگا کرتا تھا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔''اس نے اپنی خوشی سمیٹی۔

"اس کا مطلب ہے کہ ایسی ہی بات ہے۔''ٹالی واقعی ایک سی آئی ڈی آفیسر تھی۔

" کہاں ملا تمہیں وہ شہزادہ؟'' آرنلڈ سدا کا پر تجسس انسان۔

" کیسے ملا تمہیں؟''ٹالی نے سوال سے سوال جوڑا۔

"اور کب ملا تمہیں؟''اس کی انکوائری لگ چکی تھی۔

وہ سب آسٹن سے بے خبر ہو چکے تھے سوائے چارلس کے جو کہ آسٹن کے دل کا حال بخوبی جانتا تھا مگر وہ ماریہ پہ ابھی کچھ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

" کیا ہوا گیا ہے یار۔۔۔ میں نے کہا نا کہ فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ واپس نہ جانے کی کوئی اور بھی تو وجہ ہوسکتی ہے۔''اپنی چوری کیسے چھپائی جاسکتی ہے یہ ماریہ ابھی سیکھ رہی تھی۔

"اچھا تو پھر وہی وجہ بتادو۔'' آرنلڈ نے برا سا منہ بنایا۔

"بس میں نے اب سوچ لیا ہے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ ہی واپس جاؤں گی۔ ماما سے میں نے بات کر لی ہے۔ میں نہیں رہ پاؤں گی تم لوگوں کے بغیر۔ ویسے بھی اگلے ہفتے تو تم لوگ جارہے ہو واپس۔ تو تم لوگوں کے لیے میں اتنا تو صبر کر ہی سکتی ہوں۔"

وہ ماریہ نہیں تھی جسے وہ لندن میں ملے تھے۔۔۔

جسے وہ اپنے ساتھ لندن سے لیکر یہاں آئے تھے۔۔۔

یہ تو کوئی اور ہی چیز تھی جو ماریہ کے اندر آکر بس رہی تھی۔۔۔

لندن کا گہرا رنگ پھیکا پڑا تھا۔۔۔

اور شاردا نے اپنا مستقل رنگ ماریہ کو سونپا تھا۔۔۔

"افف۔۔۔سارا مزا خراب کردیا۔اچھا بھلا موڈ ہو رہا تھا اس نئی فیری ٹیل کو سننے کا۔''ٹالی کے تاثرات بھی آرنلڈ سے کچھ مختلف نہیں تھے۔

" بھئی میں تو کہہ بھی رہی تھی کہ ایسی بات نہیں ہے مگر تم لوگ ہو کہ اپنی ہی پسند کی بات نکالے جارہے تھے۔''وہ ان کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے مسکرائی تھی۔

آسٹن کو اس کی مسکراہٹ میں آدھا جھوٹ دکھائی دیا تھا۔

لیکن دل کو تسلی دینے کے لیے اس نے آدھے سچ کو ہی غنیمت جانا۔۔۔

دل کو ذرا سا سکون نصیب ہوا تھا۔۔۔

یہ بے نام جذبے بھی کیا کیا عطا کر دیتے ہیں جو کہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔

"ہم بھی کہیں کہ ہماری اس چڑیل کو کوئی شہزادہ کیسے پسند آ گیا۔'' آرنلڈ نے دائیں ہاتھ سے ایک ہلکی سی چپت ماریہ کے سر پر لگائی۔

"گر کبھی کوئی اچھا لگا تو سب سے پہلے تمہیں ہی بتاؤں گی۔۔۔فکر نہ کرو۔" اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔

اس سے پہلے وہ مجبوراً ہی مسکرایا کرتی تھی۔

مگر تب وہ لندن میں تھی۔

انسانی مشینوں کی دنیا میں۔۔۔۔

اور اب وہ پاکستان میں تھی۔۔

زندہ دل لوگوں میں۔۔۔

"آسٹن تم کیوں چپ سے ہو گئے ہو؟'' چارلس نے اسے دانستہ مخاطب کیا تھا۔

" بھئی میں تو تم لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔'' وہ بھی مسکراتے ہوئے ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

ماریہ سے کچھ فاصلے پر۔۔۔

جیسے وہ پہلے دن کھڑا تھا۔۔۔

جانے یہ فاصلہ کب ختم ہونا تھا۔۔۔

یا پھر اسے سدا یونہی برقرار رہنا تھا۔۔۔۔

"آج ایسے لگ رہا ہے کہ وستی کی یہ عمارت مکمل ہو گئی ہے۔'' چارلس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

جس پہ سب نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ایک کے اوپر ایک۔۔۔ہاتھوں نے دوستی کا ایک مضبوط مینار قائم کیا تھا۔

"خدا ہماری اس دوستی کو ہمیشہ یونہی رکھے۔'' ٹالی نے دعا کی تھی۔

جس کے قبول ہونے کی دعا ان سب نے اپنے اپنے دلوں میں کی تھی۔

)-------(

جو مشتاقِ شہادت ہے، اجل سے ڈر نہیں سکتا
جو مرتا ہے وطن کے نام پر وہ مر نہیں سکتا

ضربِ عضب کی پہلی کاروائی میں میجر بلال نے اپنی بٹالین کی دونوں کمپنیوں الفا اور براوو کے ساتھ مل کر اس پہاڑی کو دشمن کے چنگل سے آزاد کرا لیا تھا۔ ان کی اس کاروائی کے دوران مزید ایک سو پچیس کے قریب ملکی و غیر ملکی دشمن مارے گئے تھے۔ اور پاک فوج کے تین جوانوں نے شہادت کا آبِ حیات نوش فرمایا تھا۔ جبکہ پانچ سے سات کے قریب جوان زخمی ہوئے تھے۔

اب ان کے قدم میران شاہ کی طرف بڑھے تھے۔

جہاں پر پاک فوج کی بیس کے گرد دہشت گردوں کے کئی ٹھکانے تھے۔ اس علاقے پر دشمنوں کا سو فیصد قبضہ موجود تھا۔

اور دشمن کی کمر توڑنے کے لیے سب سے پہلے اس جگہ کو ان کے قبضے سے رہائی دلانا ضروری تھا۔ آئی ایس پی آر کی ایک رپورٹ کے مطابق دشمن کے سربراہ اسی جگہ پہ رہائش پذیر تھے۔ یہ جگہ ان کے نیٹ ورک کی ہیڈ تھی۔ یہاں پہ خود کش حملہ آور تیار کرنے کے لیے تربیتی کمپاؤنڈز موجود تھے۔ جہاں پہ بڑی تعداد میں معصوم لوگ اغواہ کر کے لائے جاتے اور پھر ان کی تربیت کر کے ان سے دھماکے کروائے جاتے۔

اس کے علاوہ ان کا سارا اسلحہ اسی جگہ ذخیرہ کیا گیا تھا۔

چھوٹے ہتھیاروں سے لیکر بڑے ہتھیاروں تک ہر قسم کا اسلحہ یہاں رکھا گیا تھا۔

یہ پورا علاقہ تمام دہشت گردی کی جڑ تھا۔ اس لیے دہشت گردی کے تناور درخت کو ختم کرنے کے لیے پہلے اس کی جڑیں کاٹنا لازمی تھیں۔ اور یہ کام پاک فوج کے جوان میجر بلال کی قیادت میں کرنے اس علاقے میں پہنچ چکے تھے۔

اس آپریشن کے لیے پاک فوج کے تیس ہزار بیٹے اپنے ملک کی خاطر قربانی دینے کے لیے نکلے تھے۔

ان کی کئی کمپنیاں بنائی گئی تھیں ہر کمپنی اپنے اپنے میجر یا کیپٹن کے انڈر کام کر رہی تھی۔

ان کے آنے سے پہلے یہاں بھی ایک دفعہ ہوائی سٹرائک کی گئی تھی۔

جس کے نتیجے میں دشمن کو بہت بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔۔۔۔ دشمن کے سربراہ کو پکڑنے کے لیے اس اسٹرائک کو ایک خاص حکمت عملی کے تحت سرانجام دیا گیا۔

جس راہ سے آئے گا اس راہ پہ ماریں گے
پانی بھی نہ مانگے گا یوں نشہ اتاریں گے
ہم موت کی وادی سے یوں تجھ کو گذاریں گے
اس قوم سے لڑنے کی ہمت نہ ہو دوبارہ
اے دشمنِ دیں تو نے کس قوم کو للکارا

اور ایسا ہی ہوا تھا۔ پاک فوج نے دشمن کو ایسے ہی سبق سکھایا تھا۔ اگر اس کاروائی کے دوران کوئی زندہ بچ بھی جاتا تو اس کی دوبارہ ہمت نہ ہوتی کہ وہ اس ملک کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکے۔

پاک فوج کے شیر دل جوانوں نے دشمنوں کی آنکھوں میں ان کے ہی علاقے کی مٹی بھر دی تھی۔ ان کے ہی ٹھکانوں کو ان کے لیے قبرستان بنا دیا تھا۔

دشمن سے غلطی ہوئی تھی۔

اور اس کا بھرپور احساس پاکستان کے شیروں نے کروایا تھا۔

بھیڑیے تعداد میں جتنے مرضی نکل آئیں جنگل میں حکمرانی و دہشت صرف شیروں کی ہی رہتی ہے۔

دنیا کی آنکھ نے یہی دیکھا تھا۔

اور تاریخ نے بھی کچھ ایسا ہی لکھا تھا۔

میرن شاہ میں پہلی کاروائی کے دوران بہت سے دشمن اپنے انجام کو پہنچے تھے۔

جنت ڈھونڈنے نکلے تھے لیکن نہیں جانتے تھے کہ بے گناہوں کو مارنے سے جنت نہیں ملتی۔

شہر کے شہر جلانے سے جنت کی ٹھنڈک حاصل نہیں ہوتی۔

یتیم ہوتے بچوں، بیوہ ہوتی عورتوں، گھر میں بچھی لاشوں پر ماتم ہونے والی آوازوں میں جنت کے لیے مانگی جانے والی دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں۔

خلقِ خدا کا خون بہانے سے جنت کی ندیاں مقدر نہیں بنتیں۔

بہنوں سے بھائی، بیویوں سے ان کے سہاگ، بوڑھے والدین سے ان کے جوان بیٹے اور بیٹیوں سے ان کے باپ چھین لینے سے حوریں نہیں ملتیں۔

کاش کوئی انہیں بتا سکتا کہ غلط راستوں کی منزلیں بھی غلط ہوا کرتی ہیں۔جہنم کی سیڑھی چڑھنے والے کبھی بھی جنت کے آکاش کو نہیں چھو سکتے۔

کاش۔۔۔۔اسلام کے یہ دعوے دار سمجھ جائیں کہ دنیا میں دہشت پھیلانے سے آخرت میں امن نصیب نہیں ہوا کرتا۔

لیکن ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ اس دنیا میں ضرور آتا ہے۔

اور ان دشمنوں کے لیے بھی آیا تھا۔پاک فوج کی صورت میں۔ جس نے وقت کے ان فرعونوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔اور یہ جوان اس کوشش میں کامیاب بھی رہے تھے۔

اور سلام ہے اس کوشش پر۔۔۔

سلام ہے ان شیروں پر۔۔۔

سلام ہے پاک افواج پر۔۔۔

سلام سلام سلام

)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(

وہ اپنے بستر پر گم کمبل اوڑھے سر کے نیچے بایاں بازو رکھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ضرب عضب آپریشن کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھے۔

"اس آپریشن کے لیے مجھے کیوں نہیں بلوایا گیا؟'' یہی بات انہیں بے چین کیے ہوئے تھی۔

وہ کیسے چاہ سکتے تھے کہ مشکل کی اس گھڑی میں انہیں پکارا نہ جائے۔

وہ اپنی انہیں سوچوں میں غرق تھے کہ تبھی انہیں اپنے موبائل پر بانسری پر بجتی یہ وطن تمہارا ہے نغمے کی دھن سنائی دی تھی۔

انہوں نے بنا دیکھے ہی کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو۔ارتضیٰ اسپیکنگ۔''فون کو کان سے لگائے وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔''وہ دوبارہ بولے لیکن اب کی بار پھر کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

فون بند ہو چکا تھا۔ میجر ارتضیٰ نے ایک نظر موبائل کی اسکرین کی طرف دیکھا جو کہ اب سیاہ ہو چکی تھی۔اور اسے واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

ایک لمبا سانس لیتے ہوئے وہ دوبارہ پہلی حالت میں لیٹ گئے۔

دوبارہ گھنٹی بجی۔

اب کی بار انہوں نے نمبر دیکھا تھا۔ نمبر پاکستانی ہی تھا۔

انہوں نے نظر اٹھا کر وال کلاک کو دیکھا تو وہاں رات کا ایک بج رہا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ "

"میں ماریہ بات کر رہی ہوں۔ "

"ماریہ؟ "

"اتنی جلدی بھول بھی گئے؟''اسے مایوسی ہوئی تھی۔

"اگر دنیا میں ایک ماریہ ہوتی تو شاید مجھے یاد بھی رہتی۔''ان کے چہرے پر ناگواریت سی ابھری تھی۔ کسی کا یوں پر تکلف ہو جانا انہیں کبھی پسند نہیں آیا تھا۔

"ہم آج دوپہر میں ملے تھے۔''اس کا لہجہ بجھ سا گیا تھا۔

"اچھا وہ پاگل سی ماریہ۔یوں کہو نا پھر۔''چہرے پر آئی ناگواریت لمحوں میں کمرے کی ہوا میں تحلیل ہوئی تھی۔

"ہاہاہاہاہا۔۔۔اب میں اتنی بھی پاگل نہیں کہ یہ چیز میرا تعارف بن جائے۔ "اسپیکر سے ایک قہقہہ آیا تھا جو ٹکرانے کے بعد میجر ارتضیٰ کی سماعتوں کو بھلا لگا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔کیا کر رہی تھی؟''وہ بیڈ کی کراؤن کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

"کسی کو یاد۔ "

"اس وقت؟''انہوں نے دوبارہ وال کلاک پر نظر ڈالی۔

"یاد کرنے کا گر کوئی وقت ہوتا تو بندہ اس وقت میں مصروف رہ کر ان یادوں سے کنارہ کشی کر لیتا۔''ایک گہری بات ایک گہرے لہجے میں کہی گئی تھی۔

"ہمم۔۔۔یہ تو ہے۔کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ رات کے اس وقت کس کو یاد کیا جا رہا تھا؟'' کراؤن سے ٹیک لگائے وہ پر تجسس نظر آئے تھے۔

"جس سے اس وقت بات کر رہی ہوں۔''مسکراتے ہوئے جواب دیا گیا تھا۔

"کیوں جناب؟''سردی بڑھ رہی تھی۔انہوں نے کمبل کندھوں تک لے لیا۔صرف دایاں ہاتھ باہر تھا جس کے ساتھ انہوں نے موبائل پکڑ رکھا تھا۔

"بس ویسے ہی۔''اس سے کوئی وجہ نہیں بن پائی تھی۔

"امید ہے کہ میری پچھلے کئی سالوں والی باتیں ہی یاد آ رہی ہوں گی۔''انہوں نے اسے شرارت سے چھیڑا۔

"کیا ہے یار۔''وہ جھنپ سی گئی۔

"تو پھر میرے حوالے سے تمہیں کیا یاد آ رہا تھا؟'' آرمی والوں کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے۔جب تک کوئی بات پوری جان نہ لیں پیچھا نہیں چھوڑتے۔

"تمہارے ڈمپلز۔''وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"میرے ڈمپلز؟''انہیں حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں تمہارے ڈمپلز۔۔۔۔بہت پیارے ہیں۔ کسی خوبصورت راج کمار کے گالوں میں پڑنے والے بھنوروں کی طرح کہ جس میں شہزادیِ وقت کا دل ڈوب جائے۔'' کیا وہ بھی ایسی باتیں کر لیتی تھی یا یہ اس رات کا خمار تھا جو کہ ستاروں سے سجے اپنے پر پھیلائے شاردا کی وادیوں میں اتر رہی تھی۔

"شکریہ۔''ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا تھا۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تم ان اجنبی گزر گاہوں میں یوں میرے سامنے آ ؤ گے کہ نہ حقیقت پر یقین آئے اور نہ ہی اس خواب کو جھٹلایا جاسکے کہ جسے پچھلے کئی سالوں سے میری یہ آنکھیں دیکھتی آئی ہیں۔ کہ جس کے پیدا کردہ سوالوں کے انبار مجھے ہمیشہ پریشان کیے رکھتے تھے کہ جس کی تعبیر اس جگہ پر سامنے آئی ہے جس کا میں نے کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ اور روائلن کی دھن ان جگہوں پر وہ شخص چھیڑے گا کہ جس کے حقیقت میں ہونے کا تصور کبھی میرے دل کی آنکھ نے بھی نہیں کیا تھا۔''وہ خاموشی سے بیڈ سے ٹکائے اسپیکر کے دوسری طرف سے آتی اس آواز کو سن رہے تھے۔ جو کچھ پریشان سی تھی کہ جس میں حیرت کا عنصر بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"میں تم سے دوبارہ ملنا چاہتی ہوں۔ اور تمہیں اپنے اس خواب کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں جو دھیرے دھیرے حقیقت کا روپ دھار رہا ہے۔''وہ اگر کچھ دیر اور بولتی تو شاید پھر سے رو دیتی۔

"ہاں کیوں نہیں۔تم جب کہو گی میں حاضر ہو جاؤں گا۔''انہیں اب کی بار معاملہ کافی سنجیدہ نظر آیا تھا۔

"شکریہ ارتضی۔''وہ رو دی تھی شاید۔ مگر اب کی بار اس رونے میں خوشی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"خوش آمدید پیاری ماریہ۔''انہوں نے فراخدلی سے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ ان کا یہ ولولہ وہ فون سے بھی محسوس کرسکتی تھی۔

"اب تمہیں سو جانا چاہیے۔ شب بخیر۔''انہوں نے دوبارہ ایک نظر کلاک پر ڈالی جہاں رات کے پونے دو ہو رہے تھے۔

"شب بخیر۔''اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا تھا۔

کسی خیال کے تحت وہ مسکرائے تھے۔

اور اس کے ساتھ ہی نیند کی دیوی انہیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے اس بستر پر اتری تھی۔

)-------(

" کہیں جا رہی ہو ماریہ؟''وہ کوریڈور سے نکل کر باہر کے گیٹ کی جانب جارہی تھی جبھی اسے اپنے بائیں پہلو سے آسٹن کی آواز سنائی دی۔

"ہاں میں بس باہر تازہ ہوا کے لیے جارہی تھی۔''موبائل سے کسی کو پیغام ارسل کر کے وہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"اس حلیے میں؟''اس نے ماریہ کا تنقیدی جائزہ لیا۔جو کہ پہلی بار اتنا سنور کر کہیں جارہی تھی۔ آسٹن نے اسے کبھی بھی اس حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔

بلیو جینز کے اوپر سرخ رنگ کی شارٹ شرٹ پہنے سرمئی رنگ کی گرم چادر لیے وہ آسٹن کو حیران ہی تو کرگئی تھی۔ چہرے پر میک اپ بھی معمول سے ہٹ کر تھا۔ لمبے بال بائیں شانے پر گرائے وہ بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔

" کیوں کیا ہوا اس حلیے کو؟''اس نے خود کو ایک نظر دیکھتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

" کچھ نہیں۔''اس نے اپنی حیرت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

"اچھی نہیں لگ رہی کیا؟"اسے اپنی تیاری پر شک سا ہوا۔ وہ پہلی بار اتنی محنت سے تیار ہوئی تھی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بلکل کسی فیری ٹیل کی پرنسز کی طرح۔''اس نے ماریہ کو اپنی نظر میں سمونا چاہا۔

"شکریہ۔'۔اب میں جاؤں؟''وہ مزید وہاں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں۔۔کیوں نہیں۔''ایک شک سے بھری نظر اس پر ڈالتے ہوئے اس نے اسے جانے کا راستہ دے دیا۔

'وہ چلی گئی جبکہ آسٹن سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آ گیا جہاں آرنلڈ ؤگ ناران کاغان جانے کے لیے پیکنگ کر رہے تھے۔

)-------(

اپنے وعدے کے مطابق وہ ماریہ کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے جہاں وہ پہلے سے ہی موجود ان کے آنے کا انتظا کر رہی تھی۔

"ہیلو۔۔۔''اس پر نظر پڑتے ہی میجر ارتضی نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔

"ہیلو۔۔۔''ان پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

" کیسی ہو؟''قریب آتے ہی انہوں نے اسے ایک تحفہ پیش کیا۔

"ٹھیک۔۔۔یہ کیا ہے؟''اس نے شاپر کو کھول کر دیکھا تو اس کے اندر کچھ پیک کیا ہوا پڑا تھا۔

"ایک اچھی لڑکی کے لیے ایک اچھا سا تحفہ۔ "

"شکریہ۔''اس نے تحفے کو سنگی بنچ پر رکھ دیا۔ جو کہ سنگِ مرمر کی ایک محراب نما شیلٹر کے نیچے بنایا گیا تھا۔

"بیٹھو۔''اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

"میں زیادہ لیٹ تو نہیں ہو گیا؟''انہوں نے اپنی گھڑی کو دیکھا جو انہیں پانچ منٹ لیٹ ہونے کا بتا رہی تھی۔

" نہیں۔۔۔بس میں جلدی آ گئی تھی۔''اس نے چادر کو شانوں پر ٹھیک سے پھیلایا تھا۔

مغرب پر مشرق نے خوبصورت رنگ چڑھایا تھا۔

"تمہارے دوست کیسے ہیں؟'' میجر ارتضی نے بازو بنچ کی ٹیک سے ٹکاتے ہوئے سامنے والے منظر کو دیکھا تھا۔ جہاں دور دور تک سبزہ ہی سبزہ تھا اور سبزے کے اس سمندر کے پیچھے اونچے اونچے پہاڑوں کی ایک باڑ تھی۔ جو مغرب سے شروع ہوکر مشرق کی طرف جارہی تھی۔

بالکل لندن کی ماریہ کی طرح۔

"اچھے ہیں۔''اس کی نظریں بھی میجر ارتضی کی نظروں کے تعاقب میں گئی تھیں۔ وہ منظر واقعی مسحور کر دینے والا تھا۔

لیکن ان ڈمپلز سے زیادہ نہیں جن سے ماریہ نے اس وقت بڑی دقت سے نظریں چرائی تھیں۔

"تم مجھ سے کوئی بات کرنا چاہ رہی تھی؟''وہ وقت ضائع کیے بنا اصل موضوع کی طرف آئے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی کہ جس کام کے لیے جاتے تھے پہلے اسے ہی سرانجام دیتے تھے۔

"میں پچھلے کچھ سالوں سے ایک خواب دیکھتی آ رہی ہوں۔''وہ سنگی بنچ سے اٹھ کر کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

"ایک بہت ہی عجیب سا خواب۔۔۔۔ بہت ہی مبہم سا۔۔۔کہ جس کی تعبیر اتنی واضح نظر آرہی ہے لیکن پھر بھی آنکھیں یقین کرنے سے انکاری ہیں۔'' میجر ارتضی اسی حالت میں بیٹھے اس کے بے ترتیب سے جملوں کو سننے لگے۔

"ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جس کے ایک طرف اونچے اونچے پہاڑ ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ایک دریا بہہ رہا ہوتا ہے۔ اور اسی دریا کے کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک لڑکا کھڑا وائلن بجا رہا ہوتا ہے۔ اور اس وائلن کی دھن پر آٹھ سے نو سال کی بچیاں رقص کر رہی ہوتی ہیں۔ وہ دھن بہت ہی خوبصورت ہوتی ہے۔ بالکل ویسی ہی جیسی اس دن تم بجا رہے تھے۔''وہ کچھ دیر کے لیے رکی تھی۔

"میں اس دھن سے کھنچی چلی آتی ہوں۔ پھر پتا نہیں کیا ہوتا ہے کہ وائلن کی دھن ماتم میں بدلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اسی دوران ان پہاڑوں کے پیچھے سے ایک سرخ گھٹا آگے بڑھنا شروع ہوتی ہے۔ وہ بچیاں رونا شروع کر دیتی ہیں۔ میں انہیں چلا چلا کر کہتی ہوں کہ رونا بند کرو مگر وہ رونا جاری رکھتی ہیں۔ وہ گھٹا لڑکے کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ میں اسے پکارنے کے لیے جیسے ہی آگے بڑھتی ہوں وہ گھٹا لڑکے کو لیکر غائب ہو جاتی ہے۔ بچیاں دور کہیں چلی جاتی ہیں لیکن ان کے رونے کی آوازیں مجھے واضح سنائی دیتی ہیں۔ ابھی یہ سب جاری ہی رہتا ہے کہ اسی لڑکے کی آواز آتی ہے کہ یہاں آؤ گی تو ماتم بن جاؤ گی۔''یہ کہتے ہوئے وہ رو دی تھی۔

میجر ارتضی جیسے جیسے اس خواب سب رہے تھے حیرت کے کئی پہاڑ ان پر ٹوٹتے ہی چلے گئے تھے۔

"اور جب میں پہلی بار تمہارے قریب سے شاردا یونی میں گزری تھی تو میرے دل نے میرے قدم اسی جگہ روک دیے تھے۔ اور تمہیں دیکھ کر یہ بالکل ویسے ہی دھڑ کا تھا جیسے مجھے خواب میں دھڑ کتا محسوس ہوتا تھا۔ پھر اس دن تم نے وہی دھن وائلن پر چھیڑی تھی۔ بالکل ویسی ہی جسے میں لاکھوں دھنوں میں سے پہچان سکتی ہوں۔ میں بالکل ویسے ہی بھاگتی ادھر آئی تھی جیسے میں نے کبھی خود کو اپنے اس خواب میں بھاگتے ہوئے پایا تھا۔ اسی دھن کے سحر میں جکڑتے ہوئے میں اس جگہ پر پہنچی تو شاردا کی اس زمین نے مجھے ایک سرپرائز دیا تھا۔

بالکل وہی جگہ۔۔۔ ویسے ہی بہتا دریا۔ وہی بلند و بالا پہاڑ۔ اس انداز میں وائلن بجاتے تم۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ اس وقت تمہارے قریب ان بچیوں کی بجائے کچھ لوگ کھڑے تھے۔'' اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کی آواز رندھنے لگی تھی۔

"لا تضی تم بالکل وہی ہو۔ بالکل وہی۔'' وہ ان کے قدموں کے قریب نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔ اور براہِ راست ان کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"میری نظروں کو تو دھوکا ہوسکتا ہے لیکن میرا دل۔۔۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ شخص تم ہی ہو۔ اور وہ جگہ یہی جگہ ہے۔۔۔ شاردا کی یہی وادی۔'' اب کی بار اس نے ان کا بایاں ہاتھ تھاما تھا۔

میجر ارتضٰی لب بھینچے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ سب کچھ ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتے جا رہا تھا۔

"تمہیں یہ سب پاگلوں جیسی باتیں لگیں گی لیکن خدا کے لیے میری ان باتوں پر یقین کرو۔ خدا کے لیے۔'' آنسوؤں کی ایک لڑی ٹوٹ کر اس کے رخساروں پر بکھری تھی۔

"میں نہیں جانتی کہ کیا ہونے جا رہا ہے لیکن ایسے لگتا ہے کہ کچھ بہت ہی غلط ہونے جا رہا ہے۔ کچھ بہت ہی غلط۔ جو میری زندگی کو ماتم بنا دینے والا ہے۔'' اب کی بار وہ ڈری ہوئی لگی تھی۔

بالکل ایک پریشان سی شہزادی جیسے۔ جسے کچھ بہت ہی غلط ہونے کا احساس ہو جائے۔

میجر ارتضٰی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نرمی سے چھڑاتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس کی ان باتوں کے جواب میں وہ کیا کہیں۔ وہ دو قدم چل کر اس سے دور ہوئے۔

شہزادی نے شہزادے کو خود سے دور ہوتے دیکھا تھا۔

'وہ بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ان کے دائیں پہلو میں آکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے ایک نظر ان کے چہرے کو دیکھا تھا جہاں ان گنت سوالوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

"مجھے پتا ہے کہ تم مسلمان ہو اس لیے تمہیں ان پیشین گوئیوں پر یقین نہیں ہے۔ لیکن میں نشانیوں پر یقین رکھتی ہوں کیونکہ یہ سچ ہوجاتی ہیں۔ اور یہ خواب بھی انہیں نشانیوں میں سے ایک ہے۔ جس کا ایک حصہ سچ ہو چکا ہے جبکہ دوسرا حصہ۔۔۔۔۔'' ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی بات کو کسی پریشانی کے تحت ادھورا چھوڑ دیا۔

اب کی بار میجر ارتضٰی نے اس کی جانب دیکھا تھا۔ اس کی چادر وہیں سنگی بنچ کے قریب گر گئی تھی۔ انہوں نے وہ چادر اٹھا کر اسے اوڑھائی تھی جیسے کہ مشرق کے یہ باشندے کسی بھی عورت کو عزت سے اوڑھاتے ہیں۔ عورت کسی بھی ملک کی ہو اس کی عزت سب کو مقدم ہوتی ہے۔ اور چادر تو مشرق میں عزت کا دوسرا نام ہے۔

وہ خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگی جو کہ جواب کا منتظر نظر آ رہا تھا۔

"دعا کرنا کہ اس خواب کا دوسرا حصہ جلد سچ ہو جائے۔'' ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے سنجیدہ لبوں پر رینگی تھی۔ انہیں لگا تھا کہ خواب کا دوسرا حصہ ان کی شہادت کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے دعا کا کہا تھا کہ اس خواب کا دوسرا حصہ بھی پورا ہو جائے۔۔۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے تھا انہیں لیکن کم عقل۔ ماریہ ان کی اس بات کو سمجھ نہ پائی۔

اس کا ہاتھ یکدم اٹھا تھا اور میجر ارتضٰی کو اپنے بائیں گال پہ پوری شدت سے محسوس ہوا تھا۔

ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز شاردا کے ان بلند پہاڑوں میں گونجی تھی۔ جس نے فیری ٹیل کے ان کرداروں کو ایک ساتھ حیرت میں ڈالا تھا۔

ہاتھ اٹھانے والے نے ہاتھ کے اٹھنے پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

جبکہ مقابل اس ہاتھ کے خود پر اٹھنے پر حیران ہوا تھا۔

"بس اتنی ہی وقعت تھی تمہارے لیے میری ان باتوں کی؟ تمہارے لیے جذبے کوئی معانی نہیں رکھتے؟ سچائیوں کی کوئی اہمیت نہیں؟ ہاں؟'' وہ چلا رہی تھی ان پر۔

" کسی کے آنسو تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟ میں جانتی ہوں کہ تمہیں یہ بات بھی مذاق لگی لیکن کیسے تم کسی کے آنسوؤں میں ڈوبے لفظوں کا مذاق اڑا لیتے ہو؟'' اس کے سر سے چادر سرک چکی تھی۔ جو کہ ڈھیرے ڈھیرے کندھوں کی طرف پھسل رہی تھی۔

میجر ارتضٰی بائیں گال پر ہاتھ رکھے اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو کل تک انہیں دنیا کی سب سے مظلوم لڑکی نظر آئی تھی۔

"تم نیلسن کے مجسمے سے بھی زیادہ برے ہو۔ بہت ہی برے۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بس۔۔۔ یا کچھ اور بھی کہنا ہے؟'' وہ بازو سینے پر باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

"میں اپنے احساسات کا مزید مذاق نہیں اڑوا سکتی۔'' گالوں کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے وہ کسی نتیجے پر پہنچی تھی۔

"تم سچ میں پاگل ہو۔'' اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔

" تمہیں ایسے لگا کہ میں نے تمہارا احساسات کا مذاق اڑایا ہے؟'' ان کا لہجہ بہت ہی دھیما تھا۔ اس لہجے نے اسے چونکنے پر مجبور کیا تھا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تھپڑ کے جواب میں تھپڑ ملتا۔

لیکن یہی تو بات تھی کہ وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ میجر ارتضٰی تھے۔

"میں نے تمہیں بس یہی کہا تھا کہ دعا کرنا کہ تمہارے اس خواب کا دوسرا حصہ جلد پورا ہوجائے۔ کیا یہ کوئی مذاق تھا؟'' وہ اسی لہجے میں پوچھ رہے تھے۔ 'میرے لیے تمہاری باتیں بھی اہمیت رکھتی ہیں تمہارے آنسو بھی مجھے عزیز ہیں۔ تمہارے الفاظ بھی میرے لیے بہت قیمتی ہیں تمہارے احساسات و جذبات میرے لیے بہت معنے رکھتے ہیں۔'' وہ ان بھوری آنکھیں میں براہِ راست ڈوب رہے تھے جن کے کٹورے کسی ساگر کی مانند جل تھل ہو رہے تھے۔

"تمہاری باتوں کو میں نے کب جھٹلایا۔۔۔ یہ سچ ہے کہ مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تمہاری ان باتوں کو میرے دل نے سچا جانا ہے۔ اور انہیں سچ جانتے ہوئے ہی میں نے کہا کہ اس کے دوسرے حصے کے سچ ہونے کی بھی دعا کرو۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ میں نے اس بات کو مانا ہے کہ تمہارے خواب کا پہلا حصہ واقعی سچا تھا؟'' انہوں نے اس کے لیے اب ایک سوال چھوڑا تھا۔

"بولو ماریہ۔۔۔ میں منتظر کھڑا ہوں۔'' وہ سینے پر بازو باندھے اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔

'اس نے دوبارہ آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں کو صاف کیا تھا اور پلکیں اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جہاں صرف سکون ہی سکون تھا۔

ان کا بایاں گال تھپڑ کی شدت سے سرخ ہو چکا تھا۔

وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

کسی ایسی شہزادی کی طرح کہ جس سے بادشاہ کے دربار میں کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو اور پھر اسے سزا کا حقدار ٹھہرا دیا گیا ہو۔

”تم بہت برے ہو ارتضی۔ بہت ہی برے۔“ وہ ان سے دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”ہاں۔۔۔وہ تو میں ہوں۔ لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔“ وہ اپنے جوگرز کی ایڑیوں کے ساتھ سخت پہاڑی کو کھرچنے کی اداکاری کرنے لگے۔

”میں کیا جواب دوں اب۔“ وہ ہاتھوں کو ایک دوسرے سے مسلنے لگی۔

”اب یہ بھی میں بتاؤں؟“ انہوں نے سچ میں سر پیٹا تھا۔

”مرضی ہے تمہاری۔“ سوں سوں کرتی ناک اس وقت شاردا کے ہر خوبصورت منظر کو مات دے رہی تھی۔

”میری مرضی پر پھر تم نے تھپڑ ہی مارنا ہے۔“ وہ لاڈ سے خفا ہوئے تھے۔

”توتم سیدھی طرح بات کیا کرو۔ مجھے اتنی مشکل باتیں سمجھ نہیں آتیں۔“ اس نے چادر کو اسی طریقے سے لے لیا جس طرح میجر ارتضی نے اسے اوڑھایا تھا۔

”اللہ۔۔۔اب اس میں کیا مشکل تھا؟“ اب کی بار واقعی ان کا دل چاہا تھا کہ وہ اس پہاڑی سے چھلانگ لگا دیں۔اس سے زیادہ آسان زبان میں وہ صرف اسے اے بی سی ہی سنا سکتے تھے۔

”اتنی گھما پھرا کر بات کرو گے تو پھر اگلے بندے کا دماغ تو گھومے گا نا؟“ وہ رونا بھول چکی تھی۔

”توتم یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ تمہارے پاس دماغ ہے؟“ ننھے گڑھوں میں مچلتی شرارت کو چھپاتے ہوئے انہوں نے نہایت سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”نہیں دنیا میں صرف تمہارے پاس ہی دماغ ہے باقی سب کا تو یہ حصہ خالی رکھا گیا ہے۔“ وہ جلد روٹھ جانے والوں میں سے تھی۔

”ہاہاہاہاہا۔۔۔۔“ گردن پیچھے کی طرف گرا کر انہوں نے ایک قہقہہ شاردا کی سماعتوں کی نذر کیا۔

”تمہاری طرف دیکھ کر یہ بات سچ ہی معلوم ہوتی ہے۔“ پتا نہیں انہیں لوگوں کو چڑانے میں اتنا مزا کیوں آتا تھا۔جواباً وہ مسکرا دی تھی۔

اس کی سفید رنگت پر سرخ ہوئی ناک اس وقت کسی کو بھی اپنے سحر میں جکڑنے کی طاقت رکھتی تھی۔

”میں تو تمہیں ایک کمزور سی لاش سمجھتا تھا مگر اس تھپڑ نے تو میرے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ افففف۔۔۔“ انہوں نے اپنے گال کو ایک دفعہ پھر بہت لاڈ سے سہلایا تھا۔ وہ ڈمپلز والے گال تھے ہی ایسے جو صرف لاڈ کا حق رکھتے تھے۔

”معاف کرنا۔یہ سب بہت ہی اچانک ہوا تھا۔مجھے نہیں پتا چلا کہ میں کیا کرنے جا رہی تھی۔ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا ہے کہ میں نے کسی پر ہاتھ اٹھایا۔ میں اپنے اس عمل کے لیے بہت شرمندہ ہوں ارتضی۔“ وہ شرمندگی کی دلدل میں دھنسنے لگی۔

"تم چاہو تو مجھے تھپڑ مار سکتے ہو۔" آنسو پھر جاری ہوئے تھے۔

اس کے رونے میں شدت آچکی تھی۔بالکل دریائے نیلم کے پانی کی طرح۔

وہ ایک قدم اس کی جانب بڑھے تھے۔

درمیان میں آئے فاصلے کو ختم کرنے کے لیے۔۔

"تم اس تھپڑ کی بجائے اگر میرا سر بھی قلم کر دیتی تو خدا کی قسم اف تک نہ کرتا۔" کیا تھا اس لہجے میں کہ جس نے ماریہ کو رونا بھلا دیا تھا۔

لندن کی وہ لڑکی پل بھر کے لیے چونکی تھی۔

شاردا کی سردی میں بھی لہجے کی گرمی محسوس ہوئی تھی۔

تو یہ فرق تھا آسٹن اور میجر ارتضی میں۔ جو بات کا غلط رخ دیکھ کر پل بھر میں ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔

اور مشرق کا یہ شہزادہ مغرب کی اس شہزادی کے ہاتھوں اپنا سر بھی قلم کروانے کو تیار تھا۔

اس محراب کے نیچے سکوت طاری ہو چکا تھا۔

دور دور تک صرف خاموشی ہی خاموشی۔

بھوری اور سیاہ آنکھیں ایک دوسرے میں کھو کر ہر آواز ہر منظر کو بھول چکی تھیں۔

کتنے ہی لمحے بیتے تھے اس منظر کو۔۔۔۔

"ایک بات تو بتاؤ۔"اور پھر اس خاموشی کو ہمیشہ کی طرح میجر ارتضی نے ہی توڑا۔

"ہاں پوچھو۔"وہ ابھی بھی ان سیاہ آنکھوں کے طلسم میں جکڑی ہوئی تھی۔

"اتنا رونے سے تمہیں ڈی ہائیڈریشن نہیں ہوتی ؟"اتنے رومان پرور ماحول میں بھی انہیں مذاق سوجھا تھا۔

"او خدایا۔۔۔"وہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے واپس بنچ کے قریب آ گئی۔

"مجھے امید ہے کہ تم ہنستی اچھی ہی لگتی ہو گی۔"وہ بھی اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس محراب کے نیچے آ گئے۔

"شاید۔۔۔۔اس تحفے کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔"اس نے ان کا دیا ہوا تحفہ دائیں ہاتھ میں اٹھالیا۔

"یہ تحفہ تمہیں ہمیشہ میری یاد دلایا کرے گا۔اس لیے اسے سنبھل کر رکھنا۔ "محراب کے ستون سے ٹیک لگا کر انہوں نے ایک خوبصورت مسکراہٹ سے اسے اس تحفے کو سنبھل کر رکھنے کی نصیحت کی تھی۔

اور یہی چیز ماریہ کے دل کو ایک دفعہ پھر بری طرح سے دھڑکا گئی تھی۔

"مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو کیونکہ مجھے کل شام یہاں سے واپس جانا ہے۔ بعد میں شاید میں تمہارے ہوتے ہوئے یہاں نہ آپاؤں۔ تم سے مل کر بہت اچھا لگا ان شاءاللہ بہت جلد دوبارہ ملاقات ہو گی۔ اپنا خیال رکھنا۔"ایک مسکراہٹ ان کے لبوں پر اپنا تخت لگا کر بیٹھنے آئی تھی۔

"الوداع۔"یہ کہہ کر وہ ستون کی ٹیک چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے۔

اسے وہیں چھوڑ کر۔۔۔

بالکل اکیلے۔۔۔۔۔

جواباً وہ انہیں الوداع بھی نہ بول پائی تھی۔

مشرقی شہزادہ مغربی شہزادی کو الوداع بول کر جا چکا تھا۔

وہیں۔۔۔جہاں سے سفر ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا۔

جہاں پہلے قدم پر وہ ابھی تنہا ہی کھڑی تھی۔۔۔

آگے بڑھنے نہ بڑھنے کی کشمکش میں۔۔۔۔

وہ انہیں جاتا دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

جیسے وہ شروع دن سے انہیں دیکھ رہی تھی۔۔۔

وہ آج بھی انہیں نہیں روک پائی تھی۔۔۔۔

ایک تیز ہوا کا سرد جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا تھا۔لمبی گرم چادر اڑ کر اس کے چہرے پھیل گئی تھی۔ آنکھوں کے آگے سرمئی رنگ کا اندھیرا چھایا تھا۔

اس نے سرعت سے چادر کو ہٹایا تو سامنے منظر سے وہ غائب ہو چکے تھے۔

ایک گھٹا آئی اور انہیں اپنی لپیٹ میں لیکر غائب ہو گئی تھی۔۔۔۔

کچھ کچھ تو ایسا ہی ہوا تھا۔

وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا سوائے اس بلدار راستے کے ، جس پر چلتے ہوئے وہ پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے۔

وہ جیسے آئے تھے بالکل ویسے ہی چلے گئے تھے۔

لندن کی اس شہزادی کو ایک آخری تحفہ دے کر۔۔۔۔ جو اسے ہمیشہ ان کی یاد دلایا کرے گا۔

سامنے کا منظر دھندلا ہوا تھا۔۔۔بالکل اسی طرح جس طرح لندن کی دھند ہر منظر کو دھندلا دیتی تھی۔

کہ جس کے پار کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔۔۔

سوائے کچھ مبہم سی چیزوں کے۔۔۔

جو دھند کے رحم و کرم پر اپنی شناخت کو ختم کرنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔

کہ۔۔۔۔

پہاڑوں پر لکھی گئی داستانوں میں جدائیاں یوں ہی تو رقم ہوتی ہیں۔

(_________)

میری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا
بڑی پاک سرز میں ہے یہاں سنتری کھڑے ہیں
کوئی دشمنوں سے کہہ دے یہاں غزنویؒ کھڑے ہیں
یہاں بدر کا ہے عالم یہاں حیدریؓ کھڑے ہیں
کبھی بھول کر نہ آنا میری سرحدوں کی جانب
میری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا

اپریل دوہزار نو میں کیے گئے سوات میں فوجی آپریشن میں پاکستان آرمی نے ہزاروں کے قریب شر پسندوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔دس ہزار کے قریب شر پسند یہاں پناہ گزیں تھے۔جنہیں چن چن کر ان کے انجام تک پہنچایا گیا۔باقی بچ جانے والے شر پسند اپنے سربراہ کے ساتھ یہاں سے فرار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ان شر پسندوں نے بعد میں شمالی وزیرستان پر اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا۔اور بہت سے علاقوں میں اپنی دہشت قائم کر کے اپنا قبضہ جمالیا۔اور شمالی وزیرستان کی کئی ایجنسیوں میں اپنی اپنی تنظیمیں قائم کر کے عسکریت پسندوں کی ایک مضبوط تنظیم تشکیل دے دی۔جس کی جڑیں دن بدن پھیلنے لگی۔ان میں زیادہ طاقت ور تنظیمیں اورکزئی،مہمند اور باجوڑ میں قائم کی گئیں۔

عسکریت پسندوں کے ان ٹھکانوں کو ختم کرنے کے لیے پہلا آپریشن "شیر دل" دوہزار آٹھ میں شروع کیا گیا۔جس میں بھی پاکستان کے ان شیر دل بیٹوں نے شاندار کارکردگی دکھائی۔اس آپریشن میں بہت سی ایجنسیوں کو شر پسندوں سے خالی کرا لیا گیا۔اس کے بعد مہمند ایجنسی کی طرف پیش قدمی کی گئی۔جس کے سربراہ کو اس ملک کے بیٹوں نے مہمند ایجنسی چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

شر پسندوں کے ایک بڑے ٹھکانے اورکزئی میں دوسرا آپریشن مارچ دوہزار دس میں شروع کیا گیا۔جس میں اللہ کے کرم و فضل سے مادرِ گیتی کے یہ بیٹے ہمیشہ کی طرح سرخرو ٹھہرے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

مری سرحدوں کے اندر نہ قدم جما سکو گے
مری سرحدوں تک آئے تو نہ بچ کے جا سکو گے
مری ضربِ حیدریؓ ہے کہاں تاب لا سکو گے
کبھی بھول کر نہ آنا میری سرحدوں کی جانب
میری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا

اس ساری کاروائی کے دوران خیبر ایجنسی کو بھی نظر انداز نہ کیا گیا۔پاکستان آرمی نے شر پسندوں کو یہاں بھی ڈیرے جمانے نہ دیئے اور مجبوراً ان عسکریت پسندوں کو فرار ہو کر وادیِ تیرہ میں پناہ حاصل کرنا پڑی۔تمام علاقوں سے فرار ہوئے شر پسند اپنے کمانڈروں سمیت اس علاقے میں آ کر اکٹھے ہو گئے۔پاک فورسز نے ادھر بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔اور یہاں بھی ایک آپریشن کا آغاز کر دیا گیا۔

اس دوران پاکستان آرمی اور حکومتِ پاکستان کی طرف سے ان شر پسندوں کو کئی بار مذاکرات کی دعوت دی جاتی رہی لیکن عسکریت پسندوں کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہ کی گئی بلکہ پہلے سے موجود معاہدات کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔

ان سب پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پاکستان آرمی نے آپریشن راہِ نجات شروع کیا۔

ان چار سالوں میں ان شر پسندوں نے قبائلی علاقہ جات میں موجود پاک آرمی کی پوسٹوں کو متعدد بار نشانہ بنایا۔

بات امن سے مذاکرات سے بہت آگے نکل چکی تھی گلی گلی میں خون کی ہولی کو دیکھنا برداشت سے باہر ہوتا گیا۔اس لیے جون دوہزار چودہ میں پاکستان آرمی نے اللہ کا نام لیکر جنرل راحیل شریف جیسے عظیم سپہ سالار کی قیادت میں ضربِ عضب آپریشن کا آغاز کیا۔

جس کی دوسری کاروائی میں پاکستان آرمی اور دیگر فورسز نے ٹل کرمیر ان شاہ کا چالیس فیصد حصہ شر پسندوں سے پاک کروالیا تھا۔

اور کامیابی کی طرف قدم ابھی جاری تھے کہ کیپٹن عمر سمیت پاک آرمی کے دو جوانوں نے شہادت کے تمغے اپنے سینوں پر سجا لیے۔

کیپٹن عمر کی شادی کو ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔

ان کی دلہن کے ہاتھوں سے ابھی مہندی اتری بھی نہیں تھی کہ ان کی شہادت نے اس کے ماتھے پر شہید کی بیوہ کا جھومر سجا دیا تھا۔

فقط اک خدا کو سجدہ ہے نشانِ سرفرازی
مرا نام ہے مجاہد مری آن ہے نمازی
گئی جان تو شہادت،ہوئے سرخرو تو غازی
کبھی بھول کر نہ آنا میری سرحدوں کی جانب
میری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا

(________________)

یہی گر ضد تمہاری ہے

چلو ہم بھول جاتے ہیں
سبھی وعدے، سبھی قسمیں
محبت کی سبھی رسمیں
نہیں منظور جو تم کو
کریں رنجور جو تم کو
تمہاری شادمانی ہی، عزیز از جان ہے جب تو
تمہیں پھر ٹوکنا کیسا؟
زیاں، سود کی بابت، بھلا پھر سوچنا کیسا
چلو ہم بھول جاتے ہیں
محبت کی ریاضت میں
وفاؤں کی مسافت میں
قدم کس کے کہاں بہکے، ہوئی کس سے کہاں لرزش
بسا دی جس نے اک پل میں، ہماری آنکھوں میں بارش
کہ جس کی تیز بوندوں سے
کسی تیزاب کی صورت
نشانِ منزلِ دل ہی، جلا ڈالا مٹا ڈالا
مگر جاناں
کہاں آسان ہوتا ہے؟
جگر کا خون اشکوں میں، بدلنا اور بہا دینا
خس و خاشاک چن چن کر
گھروندہ اک بنانا اور اسی کو پھر جلا دینا
جواں سپنوں کی لاشوں کو
درونِ جاں چھپا کر مسکرا دینا
خزائیں پالنا خود میں، بہاریں بانٹتے پھرنا
کہاں آسان ہوتا ہے؟
بہت ممکن ہے ہم بھی ہار ہی جائیں
جواں ہے ضبط جو اب تک
مقابل غم کے آئیں۔۔۔ اور ڈھے جائیں
اور اس میں بھی تعجب کیا؟

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تمہارے لوٹ آنے کی بچی ہو آس جو کوئی
نوائے بے زباں بن کر
سسک کر پھر سے اٹھے اور تم تک بھی پہنچ جائے
سو تم سے یہ گزارش ہے
تب اک احسان تم کرنا
پلٹ کر دیکھنا یوں سرد نظروں سے
کہ جو بھی آس زندہ ہو۔۔۔
اسے یکسر مٹا دینا
ہمیں پتھر بنا دینا

وہ ان کا فون کئی بار ٹرائی کر چکی تھی اور ہر بار سوئچڈ آف آ رہا تھا۔بلا آخر وہ ان کے گیسٹ ہاؤس آ گئی۔ جہاں ریسپشنسٹ نے اسے میجر ارتضی کی صبح سے غیر موجودگی سے آگاہ کیا تھا۔

اس نے وہیں ریسپشنسٹ سے نوٹ بک لیکر اس پر ایک خط میجر ارتضی کے نام لکھا تھا۔

اس نے خط ریسپشنسٹ کو دینے سے پہلے ایک بار پھر ان کا نمبر ٹرائی کیا تھا اور اس بار بھی وہ آف تھا۔

مایوس ہوتے ہوئے اس نے وہ خط میجر ارتضی کے لیے وہاں چھوڑ دیا۔

اور بارش برساتی آنکھوں سے باہر آ گئی۔اسے آج ہی آسٹن لوگوں کے ساتھ یہاں سے جانا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔اور جانے سے پہلے وہ ایک بار میجر ارتضی سے اپنے دل کی بات کہنا چاہتی تھی اور ان کے لبوں سے اپنی محبت کا اقرار سننا چاہتی تھی۔

لیکن آہ۔۔۔۔

یہ وقت بھی کب کسی کو من چاہے موقع دیتا ہے۔

بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ جہاں ٹالی اپنی پیکنگ کر رہی تھی۔ماریہ بھی اپنے آنسو چھپاتے ہوئے اپنی چیزیں بیگ میں رکھنے لگی۔

"ماریہ سب ٹھیک ہے؟" ٹالی کا بیگ میں کپڑے رکھتا ہاتھ رکا تھا۔اس نے جانچتی نظروں سے ماریہ کی سرخ ہوتی آنکھوں اور ناک کو دیکھا۔

"ہاں۔۔۔سب ٹھیک ہی ہے۔" آنکھ میں آئے آنسوؤں کو اس نے بے دردی سے صاف کیا تھا۔

وہ چیزوں کو پھینکنے کے سے انداز میں بیگ میں رکھ رہی تھی۔

ٹالی نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

بے ترتیبی سے چیزیں رکھ کر اس نے بیگ کی زپ کو بند کیا اور اسے بیڈ کے ایک کنارے پر رکھ دیا۔

"یہ تحفہ تو رہ گیا تمہارا۔" ٹالی کی نظر سامنے دیوار کے قریب پڑی میز پر رکھے ہوئے ایک تحفے پر پڑی جسے بہت نفاست سے پیک کیا گیا تھا۔

ماریہ کی نظروں نے بھی اس کی نظروں کا تعاقب کیا تھا۔

اور اس کے ساتھ ہی میجر ارتضی کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں گونجے تھے۔

"یہ تحفہ تمہیں ہمیشہ میری یاد دلایا کرے گا۔اسے سنبھال کر رکھنا۔" تھمے ہوئے آنسو پھر جاری ہو چکے تھے۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے وہ اس تحفے کے قریب پہنچی۔مرے ہوئے ہاتھوں سے اس نے اس تحفے کو اٹھایا تھا۔

"کس نے دیا یہ تحفہ ماریہ؟" ٹالی کو اس کی یہ حرکتیں مشکوک لگ رہی تھیں۔

"بس دے ہی دیا کسی نے۔۔۔۔۔عمر بھر کے لیے۔ "

وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اسے یہ تحفہ عمر بھر کے لیے دے کر جا رہے تھے یا محبت کی پہلی ہی سیڑھی سے گرنے کا روگ۔

کاش وہ جان پاتے کہ ماریہ کے قدم کس منزل کی طرف اٹھ چکے تھے۔

وہ کیا سوچنے لگی تھی ان کے بارے میں۔

کاش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

ٹالی خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔تحفے کو گلے سے لگاتے ہوئے وہ اپنے بیڈ پر آ گئی۔

اس نے اسے ابھی تک نہیں کھولا تھا۔

"جلدی کرو ٹالی اور ماریہ۔" باہر سے آسٹن کی آواز آئی تھی۔

اور اس کے ساتھ ہی آنسوؤں کا سیلاب تھما تھا۔

وہ سامان لیے اس تحفے کو گلے سے لگائے ٹالی کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی۔اس کے چہرے پر نظر ڈالے بغیر آسٹن نے اس کا بیگ اٹھایا۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے وہ ان دونوں کے پیچھے چل دی۔

" شاردا میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" پہاڑی سے اترتے ہوئے اس کی نظر میجر ارتضی کے گیسٹ ہاؤس پر پڑی۔آنسو پیتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔

وہ کچھ دیر کے لیے وہاں رکی تھی۔

اسے اب بھی ان کے لوٹ کر آنے کی امید تھی۔وہ آخری بار ہی سہی پر ان سے ملنا ضرور چاہتی تھی۔

"او تمہیں بھی ارتضی۔" جب وہاں سے ان کے آنے کی امید مدھم ہوئی تو وہ روتے ہوئے پہاڑی سے اتر آئی۔

"کاش تم اب بھی لوٹ آؤ ارتضی۔۔۔کاش۔" جیپ میں بیٹھتے ہوئے اس نے چاروں اطراف میں نظریں گھمائی تھیں کہ شاید کہیں سے ہی ان کا چہرہ نظر آ جائے۔

مگر ایسا ہوا نہیں تھا۔

آسٹن نے اسے یوں دیوانہ وار نظریں گھماتے ہوئے دیکھا تھا۔مگر خاموش رہا۔

ب کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

یہی چیز تھی جو اس کے دل کو ہمیشہ پاکستان آنے سے ڈراتی تھی۔

وہ میجر ارتضی اور ماریہ کے بارے میں جان چکا تھا۔اس دن اس نے ماریہ کا پیچھا کر کے اس راز کی حقیقت کو جان لیا تھا۔

آخری نظر گیسٹ ہاؤس پر ڈال کر وہ پچھلی سیٹوں پر آرنلڈ اور ٹالی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ڈرائیونگ سیٹ پر چارلس جبکہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر آسٹن بجھے ہوئے دل کے ساتھ بیٹھ گیا۔

انہوں نے یہ جیپ شہر سے باہر تک جانے کے لیے کرایے پر لی تھی۔

تحفے کو گلے سے لگا کر بانہوں میں بھینچے اس نے ایک بار پھر ان کے لوٹ کر آنے کی دعا کی تھی۔

دعا قبول ہو چکی تھی لیکن تب تک ان کی جیپ شہر سے دور جا چکی تھی۔

)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(

وہ دوپہر کے بعد گیسٹ ہاؤس میں واپس آ چکے تھے۔جہاں ریسپشنسٹ سے ماریہ کا خط لیکر وہ سیدھا اپنے کمرے میں آ گئے۔

اوور کوٹ کو دیوار کے ساتھ لگی کھونٹی سے لٹکاتے ہوئے انہوں نے اس خط کے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا پچھلی سائیڈ پر سیدھی لکھائی میں بڑے بڑے حروف سے ماریہ لکھا ہوا تھا۔

خط ایک طرف رکھ کر انہوں نے سب سے پہلے موبائل کو چارجنگ پہ لگایا جو کہ بیٹری ختم ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔

موبائل کے آن ہوتے ہی ماریہ کی کالز اور کئی ٹیکسٹس کے ساتھ انہیں دیگر اہم پیغامات بھی موصول ہوئے تھے۔

"اففف۔۔اتنی کالز۔" چھبیس ستائیس کے قریب کالز ان کے موبائل پر ماریہ کے نمبر سے آ چکی تھیں۔انہوں نے چارجنگ پہ لگے موبائل سے ہی اس کے ٹیکسٹ کو سرسری انداز میں دیکھا تھا جہاں پر زیادہ تر پیغامات کال اٹھانے کے متعلق تھے۔

ایک خیال نے ان کے اندر بجلی کی سی لہر پیدا کی۔وہ اس خط کے قریب آئے اور سرعت سے اس لفافے کے منہ کو پھاڑ کر اس میں سے ایک صفحہ نکالا تھا جسے چار تہوں میں لپیٹ کر اس لفافے میں بند کیا تھا۔انہوں نے اس صفحے کو کھولا تو اندر انگریزی کے سیدھے حروف میں ان کے لیے کوئی پیغام لکھا تھا۔وہ خط کھول کر بیڈ پر آ گئے اور خط پڑھنے لگے۔

"ارتضی۔۔۔!

جب تک تمہیں یہ خط ملے گا میں تب تک یہاں سے جا چکی ہوں گی۔ میں نے تمہیں کئی کالز کیں۔۔۔کئی پیغامات بھیجے مگر تم نے شاید اپنا موبائل بند کر رکھا تھا۔ میں جانے سے پہلے تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔ لیکن شاید قسمت کو ہمارا دوبارہ ملن منظور نہیں تھا۔ میں تم سے مل کر بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔وہ سب باتیں جو میں کئی سالوں سے محسوس کرتی آ رہی تھی۔اور وہ سب باتیں بھی جو تم سے ملنے کے بعد میرے دل نے محسوس کی تھیں۔

شاید وہ اقرار تھیں۔۔۔

تم سے محبت کا۔۔۔

میں نہیں جانتی کہ میں اس رہ گزر پر کب قدم رکھ بیٹھی۔شاید تب سے جب میں نے پہلی بار اپنے خواب میں اس دھن کو سنا تھا۔اس دھن کے بعد مجھے دنیا کی کوئی دھن کبھی بھی اچھی نہیں لگی تھی۔اور شاید یہی محبت کا پہلا قدم تھا جو میں تمہاری طرف اٹھا چکی تھی۔اور پھر میرے قدم تمہارے سحر سے تمہاری طرف مسلسل اٹھنے لگے۔ان پر سے میری طاقت اٹھ چکی تھی۔میرا دل تمہاری طرف مکمل طور پر جھک چکا تھا۔واپسی کی راہیں میں کھو بیٹھی تھی۔اس وقت میں جس مقام پر کھڑی ہوں وہاں سے واپسی ناممکن ہو گئی ہے۔اور یہاں سے آگے کا سفر صرف تمہارے ساتھ ہی ممکن ہے۔

پہلے مجھے لگا تھا کہ شاید قدرت نے تمہیں میرے لیے ہی بنایا تھا اور پھر تم سے ملوانے کے لیے وہ اتنی دوری سے ادھر لیکر آئی تھی۔یہ سب اتفاق نہیں ہو سکتا۔۔۔کبھی بھی نہیں۔۔۔۔!

مگر مجھے ہمیشہ کی طرح غلط لگا۔تم میرے بارے میں وہ نہیں سوچتے تھے جو میں تمہارے بارے میں سوچتی تھی۔ میں بھول گئی تھی کہ وہ خواب تو صرف مجھے نظر آتا تھا، تمہیں نہیں۔ تو پھر اس کی تعبیر میں محبت بھی صرف مجھے ہی ہونی چاہیے تھی، تمہیں نہیں۔

محبت کو صرف میری ہی زندگی کو ماتم بنانا چاہیے، تمہاری زندگی کو نہیں۔

لو، دیکھ لو۔۔۔۔۔!

محبت نے صرف مجھے ہی چنا بربادی کے لیے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بڑی سی بڑی بربادیوں میں سے ایک بربادی محبت کی بربادی ہوتی ہے اور میں ہمیشہ اس بربادی سے پناہ مانگا کرتی تھی۔ لیکن یہ بلا کہاں دعاؤں سے ٹلنے والی ہے۔

کاش۔۔۔! یہ محبت دو دلوں میں ایک جیسی ہی تڑپ پیدا کیا کرتی۔ دونوں کی منزل ایک ہی مقرر کرتی۔

لیکن افسوس۔۔۔۔ یہ ظالم یہی تو ظلم کرتی ہے۔ ایک ہی نفس کو مشکل میں ڈالتی ہے۔ ایک ہی دل کو تڑپ کے لیے مختص کرتی ہے۔

دو میں سے ایک کی آنکھیں ہی برسنے کے لیے چنی جاتی ہیں اور مجھے چن لیا گیا ہے ارتضی۔

تمہاری محبت نے مجھے چن لیا ہے۔ اس بربادی کے لیے۔

اب ہر دھن ماتم لگا کرے گی۔۔۔۔

ہر دھن ماتم اور ہر ماتم صرف موت۔۔۔۔

مجھے معاف کرنا۔ میں ان دنوں میں خود سے بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ لندن کی سادہ سی ماریہ کو بہت پیچھے چھوڑ کر۔

میں خوش فہمیاں نہیں پالتی لیکن افسوس تم سے ملنے کے بعد اس دل نے ایک خوش پال لی تھی کہ شاید تم بھی مجھ سے۔۔۔۔۔۔۔

خیر۔ میں ہمیشہ تمہاری خیریت کے لیے دعا کیا کروں گی۔ تم ہر مشکل وقت میں میری دعاؤں کو اپنے پاس پایا کرو گے۔ اگر کبھی میں بھی تمہیں یاد آیا کروں تو میرے قرار کے لیے دعا کر دیا کرنا جو اس محبت نے مجھ سے چھین لیا ہے۔

میں لندن میں اپنے گھر کا پتہ اس خط کے آخر میں لکھ رہی ہوں اگر کبھی لندن آؤ تو خدا کے لیے مجھ سے ضرور ملنا۔ وعدہ کرتی ہوں صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گی۔ گزرے وقت کو تمہارے سامنے نہیں دہراؤں گی۔

ارتضی میں تم سے اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی کاش کہ تم اپنی وعدے پر قائم رہتے اور اپنی ساعتوں کو میرے لیے منتظر رکھتے۔

کاش۔۔۔۔!

اور رہاں۔۔۔۔!

ماریہ تمہیں کبھی بھی نہیں بھولے گی۔۔۔

کبھی بھی نہیں۔۔۔!

اپنا خیال رکھنا۔۔۔۔

ماریہ"

اور آخری لائنز پر اس کے گھر کا پتہ درج تھا۔

کافی دیر وہ ساکت سے اس خط کو دیکھتے رہے۔ آنکھیں پتھرا سی گئی ہوں جیسے۔

یقین کا سفر بے یقین میں تبدیل ہوا تھا۔

وہ چلی گئی تھی۔۔۔۔

ہمیشہ کے لیے۔۔۔۔ واپس۔

اپنے دیس۔۔۔۔

ایک ننھا سا نمکین پانی کا قطرہ ان کی آنکھ سے نکلا تھا اور گال سے پھسلتے ہوئے دائیں گال کے بھنور میں پھنسا تھا اور پھر راہ بناتے ہوئے ان کی شرٹ کے کالر میں جذب ہو گیا۔

"کاش تم اب بھی سمجھنے میں غلطی نہ کرتی ماریہ۔" خط کو مٹھی میں بھینچ کر وہ بیڈ پر پیچھے کی جانب گر سے پڑے۔

"کاش۔۔۔" آنکھیں بند کرتے ہوئے انہیں اس کے جانے کا افسوس ہوا تھا۔

(۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

(جاری ہے۔)

حصہ نہم

ناران کاغان اور گلگت بلتستان کے اہم مقامات کی خوبصورتی کو اپنے کیمرے کی آنکھ میں قید کرنے کے بعد انہوں نے لندن واپسی کے لیے ٹکٹس بک کروائے۔ شاردا سے جانے کے بعد وہ اگلے پانچ دنوں میں لندن میں تھے۔ پاکستان میں اپنے قیام کے آخری دنوں میں وہ کئی بار میجر ارتضی کا فون ٹرائے کر چکی تھی لیکن ہر بار اسے مایوسی ہی ہوئی۔

چار و ناچار ہی سہی اسے واپس آنا پڑا۔

شاید ہمیشہ کے لیے۔۔۔۔

اسے میجر ارتضی سے اس قدر بے رخی کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے ایک دفعہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

کوئی پیغام تک نہ اس کے لیے چھوڑا۔

ٹریفلگر اسکوائر کے سامنے بیٹھی وہ اپنے آنسوؤں پر سے اختیار کھو بیٹھی تھی۔

لندن آنے کے بعد اس نے آسٹن لوگوں سے رابطہ تقریباً ختم کر دیا تھا۔ وہ بالکل ویسی ہی تنہا ہو چکی تھی جیسے کہ کبھی ہوا کرتی تھی۔

ٹریفلگر اسکوائر کے سامنے بیٹھے اسے لندن سے وحشت ہو رہی تھی۔ خاص طور پر نیلسن کے مجسمے سے۔

وہ بالکل ارتضی جیسا تھا۔

لبوں پر مسکراہٹ سجائے۔۔۔۔

جسم میں دل کی جگہ پتھر چھپائے۔۔۔۔

جو اپنے پاس آنے والوں کو صرف ایک نظر دیکھتا تھا۔۔۔

پھر اپنے سحر میں جکڑتا تھا۔۔۔

انہیں اپنا دیوانہ بناتا تھا لیکن خود اسی جگہ پر قائم رہتا تھا۔ اپنی طرف بڑھنے والے قدموں کی کہاں پروا تھی اسے۔

وہ تو اک مجسمہ تھا۔۔۔۔ پتھر کا بنا ایک مجسمہ۔

بے حس، سنگ دل۔۔۔

لیکن میجر ارتضی تو انسان تھے۔ جسے وہ زندہ دل سمجھتی تھی۔

لیکن شاید غلط ہی سمجھتی تھی۔۔۔۔ انسانوں سے بڑھ کر کوئی بھی سنگ دل نہیں ہوتا۔ پتھر کے مجسمے بھی نہیں۔

اس نے آنسو بہاتی آنکھوں سے وہاں پر اڑتے کبوتروں کو دیکھا۔

اور پھر ان پر رشک کیا۔

"تم سب بہت اچھے ہو۔ اپنا دیس چھوڑ کر تو نہیں جاتے نا۔ اور نہ ہی تمہیں محبت کے زخم لگتے ہیں۔" اس نے دل ہی دل میں ان کبوتروں سے ہمکلامی کی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جانور دلوں کی زبان ضرور سمجھتے ہیں۔

"دیکھو۔اس لندن کی بدقسمت ماریہ کو۔ جو دنیا دیکھنے کے لیے لندن سے پہلی دفعہ نکلی تھی۔اور دنیا نے ایسا رنگ دکھادیا کہ اب تو ہر رنگ سے نفرت سی ہونے لگی ہے۔تم سب کبھی بھی لندن چھوڑ کر نہ جانا۔لندن سب سے اچھا ہے۔ کم از کم یہاں کوئی کسی کو دکھ تو نہیں دیتانا۔ جیسے ارتضی نے دیا ہے مجھے۔لندن سے باہر کی دنیا بہت سنگدل ہے۔ کسی کو کسی کے جذبات واحساسات کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔لندن سے باہر ہر انسان ایک مجسمہ ہے۔بالکل ان مجسموں کی طرح جو یہاں پچھلی کئی دہائیوں سے موجود ہیں۔لندن کو کبھی نہ چھوڑنا ورنہ پھر یہ تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔''وہ دل ہی دل میں انہیں نصیحتیں کررہی تھی۔جو غلطی وہ خود کرچکی تھی وہ نہیں چاہتی کہ لندن کا کوئی اور باسی اس غلطی کو دہرائے۔

وہ وہاں بیٹھے کافی دیر ٹریفلگر اسکوائر کی ہر چیز کو اپنی بربادی کی داستان سرگوشیوں میں سناتی رہی اور پھر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد وہ اپنے گھر لوٹ آئی۔

"ماریہ۔''وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں جانے لگی تبھی اس کی ماں نے اسے پیچھے سے پکارا۔

وہ دھیرے سے پلٹی تو نظر اپنی ماں کے پریشان چہرے پر پڑی۔

"ادھر بیٹھو۔''وہ نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے سٹنگ روم میں رکھے صوفے پر اسے لے آئی۔

"میرے بچے میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے تم پاکستان سے آئی ہو یونہی کھوئی کھوئی سی رہتی ہو۔سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی ہو۔اگر کبھی باہر نکلو بھی تو مجھ سے ملنے سے کتراتی ہو۔آسٹن لوگوں سے بھی اب تم ملنے نہیں جاتی۔تم لوگوں میں وہاں کوئی بات ہوئی ہے کیا؟''وہ ماں تھی اس کی۔ بیٹی کی اس حالت پر پریشان کیونکر نہ ہوتی۔

وہ خاموش رہی۔

اس کے پاس کہنے کو اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

"مجھے بتاؤ بیٹا۔ کیا غم ہے جو تمہیں کھائے جارہا ہے؟ ہر وقت کا یوں رونا بے سبب تو نہیں ہوتا نا؟''وہ اس کی خاموشی سے معاملے کی سنجیدگی کو سمجھ رہی تھیں۔

"ماں جب اپنی کوئی قیمتی چیز کھو جائے تو ہر وقت کا رونا مقدر بن جاتا ہے۔''سرخ ہوتی متورم آنکھوں سے اس نے ایک نظر اپنی ماں کو دیکھا تھا۔جو کہ اس کے چہرے پر درج مبہم سی داستان پڑھنے کی ناکام کوشش کررہی تھیں۔

"کیا کھودیا ہے تم نے میرے بچے؟''ان کا دل دہل ہی تو گیا تھا۔

"وہی جو میرا سب کچھ تھا۔اور جس کے لیے قسمت نے میرے ساتھ ایسا مذاق کیا کہ میری زندگی کو میرے لیے ہی سزا بنادیا۔ایک ایسی سزا کہ جس کی شدت میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتے چلا جارہا ہے۔"آنکھیں ایک دفعہ پھر چھلک گئی تھیں۔

"میں کچھ سمجھی نہیں میری جان۔''اور یہ پہلی بات تھی جو ماریہ کی ماں سمجھی نہیں تھیں کیونکہ وہ ایسی باتیں پہلے کبھی کیا ہی نہیں کرتی تھی۔ گھما پھرا کر کرنے والی باتیں اسے ہمیشہ مشکل لگا کرتی تھیں۔ مگر اب وہ خود ایسی باتوں کی کشتی میں سوار ہوگئی تھی۔

"میں بھی نہیں سمجھی تھی۔ مگر جب سمجھ آئی تو خود کو اس مقام پر کھڑے پایا کہ جہاں واپسی کے تمام راستے بند تھے اور آگے کی راہیں بہت ہی الجھی ہوئیں۔''
اس کی اس بات پر اس کی ماں نے اسے بغور دیکھا تھا۔وہ پہلے والی ماریہ نہیں رہی تھی۔

پہلے والی ماریہ ایسی باتیں کبھی نہیں کیا کرتی تھی کبھی بھی نہیں۔۔۔۔

وہ پہلے سے کہیں زیادہ کمزور بھی ہوچکی تھی۔آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔اس کی آنکھیں ہر وقت رونے سے سرخ سی رہتی تھیں۔

"پہیلیاں کیوں بجھا رہی ہو؟''اس کی ماں کا دل دہل رہا تھا۔

"اس پہیلی کو پہیلی ہی رہنے دیں ماں۔ جتنا اسے سلجھانے کی کوشش کریں گی اتنا ہی الجھیں گی۔''اپنا ہاتھ اپنی ماں کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

کمرے کا دروازہ بند کرکے اس نے ایک دفعہ پھر خود کو لاکڈ کرلیا تھا۔

سامنے ٹیبل پر میجر ارتضی کا دیا گیا تحفہ اسی حالت میں پیکڈ پڑا تھا۔اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس تحفے کو کھول کر ہی دیکھ لے۔

وہ جب اسے کھولنے کا سوچتی تو میجر ارتضی کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے۔

"یہ تحفہ تمہیں ہمیشہ میری یاد دلایا کرے گا۔اسے سنبھال کر رکھنا۔"

شاید اس نے اسے سنبھال کر ہی رکھا تھا کیونکہ اگر وہ اسے کھولتی تو شاید وہ اپنی اصل شکل میں زیادہ عرصے قائم نہ رہتا۔

اس نے اس تحفے کو اٹھا کر اپنی الماری میں ہمیشہ کے لیے بند کردیا۔

وہ جب جب بھی اسے دیکھتی تھی میجر ارتضی کی یادیں اس کے آنسوؤں پر رقص کرتی اس کے گرد آموجود ہوتیں۔

اور اسی اذیت سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے اس تحفے کو الماری کے لاکر میں رکھا تھا۔

جہاں اس کی قیمتی چیزوں کے نام پر ایک ڈائری اور اس کے والد کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ پہلے یہی اس کی سب سے قیمتی چیزیں تھیں مگر اب ان قیمتی چیزوں میں اور بھی بہت سی چیزوں کا اضافہ ہوا تھا جن میں سے ایک وہ تحفہ تھا جو اسے جان سے پیارے انسان نے آخری لمحات میں اسے عمر بھر کے لیے سونپا تھا۔

(------------------)

اسی شام انہیں ایمرجنسی میں واپس بلالیا گیا۔ان کی پوسٹنگ سیاچن میں کردی گئی جہاں انہیں اپنی یونٹ کے جوانوں کو سیاچن کی پوسٹس پر ڈیوٹی کے لیے ٹریننگ دینا تھی۔چار ماہ کی مسلسل اور بہترین ٹریننگ کے بعد یہ جوان سیاچن جیسے برفیلے قبرستان میں جانے کے لیے مکمل تیار تھے۔اسی دوران انہیں اپنی قائد پوسٹ سے دشمن کی مشکوک سرگرمیوں کی اطلاع ملی تھی۔اور اسی سلسلے میں میجر ارتضی کو اپنے تربیت شدہ جوانوں کے ساتھ اس خطرناک مہم کے لیے چنا گیا۔ جسے فخر سمجھتے ہوئے میجر ارتضی نے اپنے جوانوں سمیت قبول کرلیا۔

بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع یہ برف کے دوزخ کسی بھی عقل کو یہاں آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ان دنوں میں برفیلی ہوائیں ستر کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے چلا کرتی تھیں۔

'' کیسے ہو جوان؟''دس ہزار کی بلندی پر واقع پاک آرمی کی ایک پوسٹ پر کھڑے میجر ارتضی نے اپنے سامنے موجود ان چٹانوں کو دیکھا جو کہ برف کے اس صحرا کو شکست دینے جارہے تھے۔

''الحمداللہ سر۔''سب نے الرٹ ہو کر بیک وقت جواب دیا۔

''اور مورل کیسا ہے؟''وہ سب کے چہرے کو باری باری دیکھ رہے تھے۔ یہ چہرے ایک نئی داستان رقم کرنے جارہے تھے۔

ہمت و بہادری کی۔۔۔

جوش و ولولے کی۔۔۔۔

حب الوطنی کی۔۔۔۔

ایک لازوال داستان۔۔۔۔

کبھی نہ مٹنے والی۔۔۔۔

کبھی نہ بھولنے والی۔۔۔۔۔

''آج ہم بادلوں سے بھی اونچے ایک محاز پر جنگ لڑنے جا رہے ہیں۔جہاں آپ کو اپنے چاروں طرف صرف برف ہی برف نظر آئے گی۔برف کے ایسے سمندر میں جس کا دور دور تک کوئی کنارہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس وطن نے ہمیں اسی دن کے لیے چنا تھا۔اسی محاز کے لیے ہی ہمارے ناموں کو منتخب کیا گیا ہے۔یہ ہمارے لیے بہت فخر کی بات ہے کہ دھرتی ماں نے اس بلند اور مشکل محاز کے لیے ہمارا انتخاب کیا ہے۔ تو میرے جوانو گھبرانا نہیں۔دنیا میں ابھی تک کوئی ایسی چیز پیدا نہیں ہوئی جسے اس ملک کے بیٹے شکست نہیں دے سکتے۔یہ برف مقدار میں بے شک جتنی مرضی ہوجائے،رہے گی ہمارے قدموں تلے ہی۔یہ برف تب تک ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی جب تک ہمارے دلوں میں جذبہ ایمانی اور جسموں میں خون کی آخری بوندیں ختم نہیں ہوجاتیں۔ ہم اس محاز پر دو دو دشمنوں سے لڑنے جا رہے ہیں۔ایک جو سرحد پار ہو گا اور ایک وہ جو ہمارے چاروں طرف ہوگا۔یعنی کہ ان بلند گلیشیرز کا موسم۔ مگر میں اپنی بات پھر دہرانا چاہوں گا کہ دنیا میں ابھی تک کوئی بھی چیز ایسی پیدا نہیں ہوئی جسے اس ملک کے بیٹے شکست نہیں دے سکتے۔یہ تو پھر بدلتا ہوا ایک موسم ہے۔آج ہے کل نہیں۔یہاں موت آپ کے سامنے دو آپشن رکھے گی۔۔۔شہید اور غازی۔ تیسرا آپشن اس ملک کے بیٹے اپنے انتخاب میں رکھتے ہی نہیں ہیں۔اللہ کا نام لیکر آگے بڑھتے رہنا۔تا کہ دشمن کو اس غلطی کا احساس ہوجائے کہ فولادی دیواروں سے سر پیٹنے کی غلطی کا نقصان کیا ہوتا ہے۔اللہ پر بھروسہ رکھو۔ان شاءاللہ ہم کامیاب لوٹیں گے۔اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔''اس مختصر سے خطاب نے ان شیر دل سپاہیوں میں جوش وولولے کی ایک نئی روح پھونکی تھی۔

دس ہزار کی بلندی پر اللہ اکبر کی صدائیں گونجی تھیں جنہوں نے اس بلند ترین گلیشیر کو خوش خبری دی تھی کہ پاکستان کے جوانوں کے قدم اس کی زمین پر پڑنے والے ہیں۔

''اب مورل کیسا ہے جوانو؟''آخر میں انہوں نے پھر دریافت کیا۔

''اپ ٹو سیاچن سر۔'' سیکنڈ لیفٹننٹ احمد کمال نے پوری شدت سے چلاتے ہوئے اس گلیشیر کو بھی خبردل کر دیا تھا۔

''سب سے پہلے ہم اپنی سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر موجود زاہد پوسٹ کی طرف بڑھیں گے۔اس کے بعد ہماری نفری کئی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر اکیس ہزار فٹ کی بلندی پر موجود قائد پوسٹ کی طرف روانہ ہو گی۔ان شاءاللہ۔اس سارے سفر کے دوران اللہ کے بعد تم سب ایک دوسرے کا سہارا ہوگے۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ہماری مدد کے لیے بیس سے کمان آتی رہے گی۔ تو پھر سب تیار ہو؟"

انہوں نے پوری قوت سے چلاتے ہوئے دریافت کیا۔

''یس سر۔''اور اس کے ساتھ ہی میجر ارتضی نے سب جوانوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور کندھا تھپکتے ہوئے ان کے خونوں کو مزید گرمایا۔اس برفیلے صحرا میں ایک ہی چیز ان کی زندگی کی ضمانت ہوسکتی تھی اور وہ تھی ان کا جوشیلا خون۔جب تک یہ خون گرم تھا تبھی تک ان کی زندگی تھی۔

''اللہ کا نام لیکر آگے بڑھو۔''ان سب نے اپنے ضروری سامان اپنی کمروں کے ساتھ باندھے اور یہ پراسرار بندے برف سے کھیلنے چل دیے۔

(__________)

شام کے ساڑھے پانچ بجے پاکستان آرمی کی دو پارٹیوں میں سے ایک الفا پارٹی نے زاہد پوسٹ کی جانب سفر کا آغاز کیا۔ جبکہ براوو پارٹی کو ان سے ایک دن کے بعد اپنے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ ستمبر کے دن چل رہے تھے۔پھر بھی سردی اپنے عروج پر تھی۔

الفا پارٹی کی قیادت میجر ارتضی جبکہ براوو پارٹی کی قیادت کیپٹن شہریار کر رہے تھے۔

ہر پارٹی میں پانچ پانچ سپاہی،ایک لیڈر اور ایک ڈاکٹر تھا۔اور یوں ہر پارٹی سات افراد پر مشتمل تھی۔

اپنی کمروں کے ساتھ رسی باندھے الفا پارٹی کے جوان اپنے گائیڈر کے پیچھے چل رہے تھے۔ گائیڈر کے پیچھے میجر ارتضی کچھ فاصلے پر چل رہے تھے۔ میجر ارتضی سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر تھا جبکہ باقی جوان بھی اسی طرح ایک ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے تھے۔یہ ان کے چلنے کی ایک خاص ترتیب تھی جو اس علاقے میں نقل و حمل کے لیے کام آتی تھی۔

ان سب نے کمروں کے ساتھ ایک رسی کو باندھا ہوا تھا جو کہ گائیڈر یا کسی بھی سپاہی کے کسی برفیلی دراڑ میں گرنے سے بچنے کے لیے تھی۔اگر ایسے کوئی گر جاتا تو باقی کے جوان اس رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیتے اور اپنے ساتھی کو مزید گہرائی میں جانے سے بچاتے۔ان بلند پہاڑوں پر یہی اللہ کے بعد ایک دوسرے کا سہارا ہوتے۔

اس رسی کی مضبوطی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ یہ تین ہزار کلو وزن اٹھانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ان جوانوں نے اپنی کمروں پر اس بلند محاز کے لیے روزمرہ کی ضروریات کے لیے بھاری سامان بھی اٹھایا ہوا تھا۔

جیسے جیسے بلندی پر قدم بڑھ رہے تھے فضا میں سے آکسیجن کم ہوتی جارہی تھی۔جس کی وجہ سے سانس لینے میں ہر قدم کے ساتھ مشکل بڑھ رہی تھی۔ہر جوان کا سانس پھول رہا تھا لیکن میجر ارتضی خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ اس وقت اگر وہی ہمت چھوڑ جاتے تو ان کی پارٹی کے جوان آگے بڑھنے کی ہمت کھو دیتے۔

''حوالدار شیر خان؟''سانس کی رفتار کو نارمل رکھتے ہوئے انہوں نے ڈاکٹر سے پیچھے والے سپاہی کو پکارا۔

''یس سر۔"پھولتے ہوئے سانس کے ساتھ جواب آیا۔

"طبیعت ٹھیک ہے جوان؟''وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں ان کے کسی ساتھی کو کوئی مشکل نہ پیش آرہی ہو۔حوالدار شیر خان کی طبیعت انہیں ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

''یس سر۔''اب کی بار بھی ویسے ہی جواب آیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں کچھ دیر کے لیے رک جانا چاہیے۔''ان کے ڈاکٹر میجر عامر نے رکتے ہوئے کہا۔

میجر ارتضی ان کی جانب پلٹے۔

''کیوں؟"

''کیونکہ ہم دو ہزار کی بلندی چڑھ آئے ہیں۔اور پل بھر کے لیے بھی نہیں رکے۔اگر یونہی اس سفر کو جاری رکھا تو منزل پر پہنچنا مشکل ہوجائے گا۔عام حالات میں یہاں ایک ہزار فٹ کی بلندی چڑھنے کے بعد ایک رات رکنے کا کہا جاتا ہے اور پھر اگلی ایک ہزار فٹ کی چڑھائی کے لیے سفر کا غاز کیا جاتا ہے۔'' میجر عامر کا سانس بھی پھول رہا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔جوانوں کا اپنے حواس میں رہنا بھی ضروری ہے۔''یہ کہہ کر میجر ارتضی نے اپنی پارٹی کو وہیں رکنے کا حکم دیا۔

حکم کی تعمیل میں سب جوان کچھ دیر ستانے کے لیے برف کے بستروں پر بیٹھ گئے۔

انہیں اتنی چڑھائی کے لیے تربیت پہلے سے ہی دی گئی تھی۔ مگر اتنی برف میں وہ پہلی بار اس سفر پر جا رہے تھے۔

شام کا وقت تھا۔سورج تو کبھی دن کے وقت یہاں مہربان نہیں ہوا تھا۔اب تو پھر رات ہو رہی تھی۔

میجر ارتضی نے بیٹھنے سے پہلے ایک نظر اپنے اد گرد گھمائی۔ نیچے زمین سے لیکر آسمان تک اور مشرق سے لیکر مغرب تک صرف سفید برف ہی نظر آرہی تھی۔

حوالدار شیر خان کے سر میں درد ہو رہا تھا۔باقی جوانوں کی حالت بھی ان سے کسی طرح کم نہ تھی۔وہ مسلسل دو ہزار فٹ کی بلندی چڑھے تھے۔

اگر اب بھی نہ رکتے تو شاید مزید سفر بھی نہ کر پاتے۔

''میجر عامر سر درد کی کچھ گولیاں دیں مجھے۔'' میجر عامر سے سر درد کی گولیاں لیکر وہ اپنے ساتھیوں کے پاس خود آئے اور انہیں سر درد کی گولیاں دیں۔

''ان شاءاللہ ابھی یہ ٹھیک ہوجائے گا۔''ان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے وہ دوبارہ اپنی پوزیشن پر آگئے۔چاکلیٹ کا ایک ٹکرا منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے اس برفیلے پہاڑ کی اونچائی دیکھی۔

اور لبوں سے "اللہ اکبر" کی صدا نکلی۔ جسے صرف اس پہاڑ نے سنا تھا۔ یا پھر اس برف نے جس پر وہ کمر کے بل لیٹ گئے تھے۔

برف کا بستر۔۔۔برف کی چادر۔۔۔۔عجب زندگی تھی ان برف والوں کی بھی۔

"ہاں بھئی شیرو! تیار ہو؟" کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد انہوں نے سب سے پوچھا۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رک سکتے تھے۔ ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔

"یس سر۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ سب اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

" چلیں پھر اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔" ایک دفعہ پھر اس برف کے قبرستان میں اللہ اکبر کا نعرہ گونجا تھا جسے شاید پہاڑ کی چوٹی نے بھی سنا تھا۔

اس پہاڑ پر اس وقت صرف اللہ کہ یہی سات سپاہی موجود تھے۔ یہ جگہ اتنی بلند تھی کہ اس سے آگے آکسیجن بھی جانے سے گھبراتی تھی لیکن مادرِ گیتی کے یہ بیٹے تو اکیس ہزار فٹ کی بلندی پر بھی اپنی ڈیوٹی کو سرانجام دیتے تھے۔

تو پھر یہ پہاڑ کیسے نہ ان کی اس ہمت پر انہیں سلام کریں؟

سلام ہے ان جانبازوں پر۔۔۔۔

سلام ہے ان شیر دلوں پر۔۔۔۔

سلام ہے دین کے ان سپاہیوں پر۔۔۔۔۔۔

(______________)

اگست کے آخر تک میرام شاہ اور میر علی کے علاقوں کو دشمن کے چنگل سے آزاد کروا لیا گیا۔ شرپسندوں کی ایک بڑی تعداد اس آپریشن میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

اس دوران شرپسند نیٹ ورکس کے کئی ہیڈ کوارٹرز کو پاک آرمی نے تباہ کر دیا تھا۔ دھماکہ خیز مواد اور دیگر اسلحہ آرمی نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

اگست کے آخر میں آئی ایس پی آر نے ایک رپورٹ جاری کی جس کے مطابق نو سو دس کے قریب دہشت گرد مارے گئے تھے۔ اور اسی آپریشن کے دوران پاکستان آرمی کے دو سو انہتر کے قریب زخمی ہوئے جبکہ بیاسی کے قریب بیٹے اپنی زندگیوں کو اپنے وطن پر وار گئے ۔

اس عرصے کے دوران پاک آرمی اور دیگر فورسز نے میرام شاہ، میر علی، دتا خیل اور بویا کے علاقوں کو شرپسندوں سے صاف کر دیا۔

یہی علاقے ان عسکریت پسندوں کے نیٹ ورکس کے ہیڈ کوارٹرز تھے۔ اور پاکستان آرمی نے تین ماہ کے مختصر عرصے میں ان تمام ٹھکانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔

ستمبر کے پہلے ہفتے میں بویا میں دس کے قریب دہشت گردوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا اور ان کی پانچ گاڑیوں جن میں دھماکہ خیز مواد اور دیگر اسلحہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا تھا، کو اڑا دیا گیا۔

انہی دنوں میں ایک آپریشن دتا خیل میں میجر ناصر کی قیادت میں شروع کیا گیا۔ اور ستمبر کے دوسرے ہفتے میں آئی ایس پی آر نے اپنی ایک اور رپورٹ جاری کی جس میں اس بات کا دعوی کیا گیا کہ دس دہشت گرد جو کہ زیارت ریزیڈنسی کے واقعے میں ملوث تھے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اسی رپورٹ میں یہ بیان بھی جاری کیا گیا کہ ایک ہزار کے قریب دہشت گرد مارے گئے جبکہ ایک سو چونتیس کے قریب خطرناک دہشت گرد گرفتار بھی کر لیے گئے۔ اس دوران ملک کا ایک بیٹا اپنی جان اپنی دھرتی ماں پر قربان کر گیا۔

ستمبر کے تیسرے ہفتے میں ایک آپریشن خیبر ایجنسی میں شروع کیا گیا۔ اس آپریشن کی پہلی جھڑپ کے دورن گیارہ کے قریب شرپسند ہلاک ہوئے جبکہ ایک کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور اسی جھڑپ کے دوران تین اور جوانوں کو قدرت نے شہادت کا جام پلا دیا۔

اسی ہفتے کے دوران ائیر اسٹرائک بھی کی گئی جس میں تئیس کے قریب دہشت گرد مارے گئے۔ اور آنے والے دنوں میں مزید ائیر اسٹرائکس کی گئیں جس میں شرپسندوں کی ایک بڑی تعداد جہنم واصل ہوئی تھی۔

ستمبر کے آخر تک خیبر ایجنسی کو ان شرپسند عوامل سے صاف کر لیا گیا۔

اکتوبر میں وادیِ تیرہ، جمرود اور ان کے اردگرد کے علاقوں میں شرپسندوں کے خلاف آپریشن کیا گیا۔

اکتوبر کے آخر میں ڈی جی عاصم باجوہ نے پریس کو یہ بیان جاری کیا کہ اس آپریشن کے دورن گیارہ سو کے قریب دہشت گرد ہلاک کر دیے گئے ہیں۔

دتا خیل کو پوری طرح اپنے قبضے میں لینے کے لیے اس علاقے میں ہوائی حملے کے گئے اور نومبر کے آخر میں آپریشن ضربِ عضب کے کمانڈر میجر جنرل ظفر اللہ خاں نے یہ دعوی کیا کہ پاکستان آرمی نے اللہ کے کرم و فضل سے ان علاقوں کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ اور نئی رپورٹ جاری کی جس میں ہونے والے دہشت گردوں کی تعدد گیارہ سو اٹھانوے بتائی گئی۔

دسمبر کے شروع میں ایک آپریشن اورکزئی ایجنسی میں کیا گیا۔

اس آپریشن کے لیے میجر بلال کا ایک بار پھر انتخاب کیا گیا تھا۔

اورکزئی ایجنسی کے پچپن فیصد حصے کو صف کروا لیا گیا تھا کہ اسی دوران دشمن کی ایک گولی میجر بلال کے سینے میں لگی۔ وہ ابھی سنبھلے ہی نہ تھے کہ ایک گولی برق رفتاری سے آتے ہوئے ان کے کندھے کو چیرتے ہوئے گزر گئی۔

"اللہ اکبر" کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ نیچے زمین پر گر گئے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا تھا شاید کبھی نہ ختم ہونے کے لیے۔

چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جس کا ہر کوئی شیدائی تھا۔۔ وعدہ جو کیا تھا ابرش سے کہ جان بھی نکلنے لگے گی تو بھی وہ اس مسکراہٹ سے ناطہ نہیں توڑیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔

اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا وہ کوئی اور نہیں تھے۔ پاکستان آرمی کے بیٹے تھے۔ گولیاں بھی لگتیں تو بھی مسکراتے تھے۔

اور اس کے ساتھ ہی اس مردِ مجاہد کے لیے آسمانوں سے سلامی آئی تھی۔ اور اس سلامی پر زمین والوں نے فخر کیا تھا۔

سلام۔۔۔۔

سلام۔۔۔۔

سلام۔۔۔۔

(____________)

وہ ہمت و حوصلے کے ساتھ مسلسل ایک دن چلتے ہوئے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ مزید ایک ہزار فٹ کی بلندی پر ان کی پہلی پوسٹ موجود تھی۔ منزل کی جانب سفر جاری تھا کہ اسی دوران میجر ارتضی کو اپنا دل بہت تیزی کے ساتھ دھڑکتے ہوئے محسوس ہوا۔ انہیں اپنے دل کے قریب درد سا اٹھتے محسوس ہوا تھا۔ وہ پل بھر کے لیے رکے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی پارٹی بھی رک گئی۔

"اگر ہم ایک دوسرے سے دور بھی ہوئے تو دیکھ لینا ہمارے دل ایک دوسرے کی شہادت کی خبر دیں گے۔" ان بلند پہاڑوں میں میجر ارتضی کو میجر بلال کے یہ الفاظ گونجتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے میجر ارتضی کو وہ پہاڑ پوری شدت سے ہلتے ہوئے محسوس ہوا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے ہر طرف سے بڑے بڑے ایوالانچز آئیں گے اور وہ ان کے نیچے دب جائیں گے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

" کیا ہوا سر۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟" ان کے گائیڈر کی آواز نے اس بلندی پر آنے والے زلزلے کو روکا تھا۔

ایوالانچز رکے تھے۔ زمین ٹھہر گئی تھی۔ شاید سنبھل گئی تھی۔

''ہاں۔ آپ سفر جاری رکھیں۔''بوجھل ہوتے دل کے ساتھ انہوں نے اسے سفر جاری رکھنے کی ہدایت دی۔

وہ پھنس چکے تھے شاید۔۔۔

دوستی اور ملک کے درمیان۔۔۔

دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔۔۔پندرہ ہزار فٹ کی اس بلندی پر۔

اور۔۔

اور۔۔۔

اور وطن جیت گیا تھا۔۔۔وہ اپنے دوست کے لیے پیچھے نہیں جا سکتے تھے۔

کیونکہ دوست بعد میں آتا تھا۔درجوں میں سب سے پہلا درجہ وطن کو دیا جاتا ہے۔

باقی سب بعد میں آتا ہے۔۔۔

چاہے وہ ماں باپ ہوں یا بہن بھائی۔ یا پھر بھائیوں سے بڑھ کر دوست۔۔۔

یہ سب دوسرے اور تیسرے درجے میں آتے ہیں۔۔ پہلا درجہ صرف وطن کا ہی ہوتا ہے۔۔

کیونکہ یہی درجہ سب سے مقدم ہوتا ہے۔۔۔

اور یہ ملک اسی درجے کا اہل ہے۔۔۔

''اور تو پھر جیت گیا بلال۔۔۔ تمہارے پاس ہوتا تو گلے سے لگا کر تجھے مبارکباد دیتا اور تجھے اپنے ہاتھوں سے رخصت کرتا۔ بالکل دلہا بنا کر۔۔۔۔جنت کی حوروں کے لیے۔۔۔ مگر میری قسمت میں تو تجھے مبارکباد کہنا بھی نہیں لکھا شاید۔۔۔میرے دوست میرے آنے کی بھی دعا کرنا۔۔۔اللہ کرے جنتی تمہارے مقدر پر رشک کریں اور تم سرخرو ٹھہرو۔ آمین۔''

سیاچن کے ان بلند پہاڑوں پر سے ایک دعا بلند ہوتی اوپر آسمانوں تک پہنچ رہی تھی۔

کون تھا دعا مانگنے والا؟

ایک دوست۔۔۔۔

اور اس سے آگے وضاحت ہی ختم

کہ دوستی خود ایک بہت بڑی وضاحت ہوتی ہے۔۔۔اور وہ بھی برسہابرس کی دوستی۔۔۔

کہ جس کی مثالیں دنیا آنے والے وقتوں میں دیا کرے گی۔۔

جب جب بھی لازوال دوستی کی داستانوں کا ذکر ہو گا تو میجر بلال اور میجر مرتضی کی دوستی کو ان میں پہلا درجہ دیا جائے گا۔

کہ امر ہوئی داستانیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔۔۔

(__________)

''ماریہ؟''وہ رولز ریسٹورنٹ سے باہر نکل رہی تھی تبھی اسے اپنے پیچھے سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پیچھے اس کا سب سے اچھا دوست آسٹن کھڑا تھا۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ رولز ریسٹورنٹ خود پر کلوزڈ کا بورڈ لگا چکا تھا۔

نومبر کے دن تھے۔ سردی لندن کی اس میڈن روڈ پر بڑے راج سے اتر رہی تھی۔

'' کیسی ہو؟''وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔

'' جیسی تم چھوڑ کر گئے تھے۔'' تلخ لہجے میں کہتے ہوئے وہ اپنی سائیکل کو آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

'' کیا میں گیا تھا تمہیں چھوڑ کر؟''وہ بھی اس کے بائیں طرف چلنے لگا۔

اسٹریٹ لائٹس رات کی تاریکی کو مات دے رہی تھیں۔

میڈن روڈ کی تمام شاپس تقریبا بند ہو چکی تھی لوگ اپنی اپنی دکانیں بند کر کے اپنے گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔

'' مجھے تو شاید سبھی چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔'' پھیکی سی مسکراہٹ سے کہتے ہوئے اس نے ایک سرد سی آہ بھری۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' آسٹن نے اسے اس کی اس غلط فہمی کی نشاندہی کروانا چاہی۔وہ ہمیشہ ایسی باتوں کے جال میں جلدی پھنس جایا کرتی تھی اور اس میں سے نکلنے کی کوشش بھی نہیں کیا کرتی تھی۔

'' کبھی خوش فہمی تو کبھی غلط فہمی۔ عجیب سا مذاق ہو رہا ہے میرے ساتھ۔۔۔نہیں؟''اس کے اندر ایک دفعہ پھر کچھ ٹوٹا تھا۔

شاید اس کے سینے میں دھڑکتا اس کا دل۔۔۔

''اگر دنیا کو دل کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا جائے تو قسمت ایسے ہی مذاق کرتی ہے۔۔۔''اس کی پی کیپ اس کے چہرے پر سایہ سی کر رہی تھی۔

''تم کیوں دنیا کو صرف ایک سوراخ سے ہی دیکھتی ہو جہاں سے تصویر کا ایک چھوٹا سا ہی حصہ نظر آتا ہے جو شاید بدصورت ہوتا ہے؟ کیوں نہیں اس کھلی کھڑکی سے دیکھتی جس کے پار تصویر واضح نظر آتی ہے۔۔۔۔بہت ہی خوبصورت؟''اسے ماریہ کی یہی باتیں جانے انجانے میں دکھ دیتی تھیں۔وہ ہمیشہ دل سے فیصلہ کر کے نقصان اٹھایا کرتی تھی۔

''تمہارا دل سوراخ ہے اور تمہارا دماغ کھڑکی۔جس کی جتنی رسائی وہ تمہیں اتنا ہی فائدہ دے گا ماریہ۔''پی کیپ کو اتارتے ہوئے اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

ماریہ نے پہلی بار اسے پی کیپ کے بغیر دیکھا تھا۔

اس کے بال بہت سنہری تھے۔

اسٹریٹ لائٹس میں بھی وہ سنہری دکھائی دے رہے تھے۔

''میں نہ دل سے سوچتی ہوں اور نہ دماغ سے۔ میں تو قسمت کی شطرنج کا ایک مہرہ ہوں جسے چلانے والا اپنی مرضی سے چلا رہا ہے۔اور میں بس چلتے ہی جا رہی ہوں۔'' چلتے ہوئے وہ رکی تھی۔اسٹریٹ کے کونے میں بوڑھے جانسن اور سارا والی جگہ سنسان پڑی ہوئی تھی۔ پچھلے ایک مہینے میں پورا لندن بدل گیا تھا۔

شاید ویران ہو گیا تھا۔

پہلے سرد راتوں میں اس وقت سارا کی آواز پر لوگوں کا ایک ہجوم کھڑا رہتا تھا۔

اور اب۔۔۔۔وہ کونا بالکل خالی تھا۔

بالکل ماریہ کی طرح۔۔۔

سنسان سا۔۔۔۔

ویران سا۔۔۔۔

'' تو اس میں بھی تمہارا قصور ہے۔تمہاری اپنی زندگی ہے۔ تمہیں اپنی مرضی سے جینی چاہیے۔''اس کا لہجہ قدرے دھیما تھا۔

وہ خاموش سی اس خالی کونے کو خالی نظروں سے تکنے لگی۔

''ایک بات کہوں ماریہ؟''وہ بھی اس کے ساتھ ہی کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔پی کیپ فولڈ کر کے اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

''ہل کہو؟''اس کی نظریں ابھی بھی اسی جگہ پر تھیں جہاں کبھی سارا کھڑے ہو کر گانے گایا کرتی تھی اور اس کے پاس ہی بوڑھا جانسن گٹار بجایا کرتا تھا۔

''تمہیں ارتضی سے دوبارہ رابطہ کرنا چاہیے تھا۔'' یہ کہتے ہوئے ایک درد بھری لہر آسٹن کے جسم سے گزری تھی۔

دکھ تو ہوتا ہے نا اپنی سب سے قیمتی چیز کسی دوسرے کو دیتے وقت۔

وہ حیرت سے اس کی جانب پلٹی۔ وہ بہت پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

''کون ارتضی؟''اس نے انجان بننا چاہا۔

''وہی جس کے ہاتھوں میں تم اپنی زندگی کا مہرہ دے آئی ہو۔''وہ ایک بار پھر غلط ثابت ہوئی تھی۔

وہ ہمیشہ دھوکا کھاجاتی تھی۔اب بھی اس نے کھایا تھا آسٹن کو غلط سمجھ کر۔

وہ تو اسے خود سے زیادہ جانتا تھا شاید۔

وہ جان چکی تھی کہ وہ اس سے کبھی بھی جھوٹ نہیں بول پائے گی۔

"بولو ماریہ۔ میں منتظر کھڑا ہوں۔'' سینے پر بازو باندھے وہ کچھ دیر کے لیے اسے ارتضی جیسا ہی لگا تھا۔

اب اسے ہر انسان میں میجر ارتضی ہی نظر آتے تھے۔ ہر چیز میں وہ انہیں تلاش کرنے لگی تھی۔

ہر انسان کچھ دیر کے لیے اسے میجر ارتضی جیسا لگتا لیکن افسوس وہ میجر ارتضی ہوتا۔

''میں نے اپنے کردار کو اس کہانی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا ہے آسٹن۔وقت کی کتاب کی ورق گردانی کرنے سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ بہتر ہے کہ اس کہانی کو تم بھی یہی چھوڑ دو۔ ہمیشہ کے لیے۔''اسٹریٹ لائٹس میں اس کی آنکھوں میں آنسو چمکے تھے۔

وقت کی کہانی سے خود کو نکالنا اتنا آسان ہوتا تو یقیناہر کردار فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

"چھوڑ دوں گا۔اگر تم بھی اسے اپنی کتاب سے نکال دو تو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس سے بہتر کوئی مل جائے۔جو تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا ہو۔ جو اس دنیا میں صرف تمہارے لیے زندہ ہو۔ جو تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہو۔''اس نے برستی آنکھیں اٹھا کر آسٹن کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔اس کی نیلی آنکھوں میں بھی پانی کی سطح بلند ہو رہی تھی جو کہ آنکھوں کا بند توڑ کر باہر نکل چکی تھی۔

اس کی گالوں پر وہ پانی پھسلتا ہی جا رہا تھا۔

اس نے آسٹن کو آج سے پہلے کبھی بھی ایسے نہیں دیکھا تھا۔

شکستہ سا۔۔۔

وہ آسٹن بھی بدل چکا تھا۔۔۔وہ ویسا نہیں تھا جسے اس نے اپنا دوست بنایا تھا۔

آنکھ میں آنسوؤں کی پرواہ کیے بغیر وہ اس کی جانب دھیرے سے پلٹا تھا۔

اظہار کرنے۔۔۔

اقرار کرنے۔۔۔۔

''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماریہ۔''میڈن روڈ پر ایک لمحے کے لیے زندگی رکی تھی۔

گھر جاتے لوگ مجسمہ ہوئے تھے۔ ہر چیز پر سکوت اترا تھا۔

پورا لندن شاید غائب ہو گیا تھا۔

اس زمین پر تھے تو صرف ماریہ اور آسٹن۔

''میں ساری زندگی شاید تم سے خاموش محبت کرتا رہتا مگر یہ بوجھ تھا کہ اب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جب تمہاری نظروں میں میں نے ارتضی کے لیے پسندیدگی کی چمک دیکھی تھی تو میں نے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ خاموشی سے تم دونوں کی زندگی سے دور چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔'' آنکھ میں آئے آنسوؤں کو صف کرتے ہوئے اس نے ماریہ کے بھیگتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

'' مگر ارتضی کے چلے جانے کے بعد میں اپنے دل کو اس بات پر قائم نہ رکھ سکا کیونکہ یہ محبت تھی جو مجبور کیے جا رہی تھی۔ میں خود کو روک نہیں پایا ماریہ۔اور آج ہمت کر کے تم سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔ تمہارے بغیر جینے کا میں اب تصور بھی نہیں کر سکتا۔اگر تم نہیں تو پھر یہ زندگی بھی نہیں۔''وہ گھٹنوں کے بل گر گڑاتے ہوئے اس کے سامنے گر پڑا۔

اپنی زندگی کی بھیک مانگنے کے لیے۔۔۔

جیسے اس نے ہسپتال کے ٹھنڈے فرش پر گر کر بھیک مانگی تھی۔

ماریہ کی زندگی کی بھیک۔۔۔۔

اور اب وہ پہلی بار اپنے لیے گرا تھا میڈن روڈ کے اس ٹھنڈے کنارے پر۔

''آسٹن۔'' آواز وہیں کہیں گلے میں ہی پھنس گئی تھی۔

وہ ماتھے کے قریب ہاتھ جوڑے سر جھکائے اس سے واقعی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

''یہ خیانت ہوگی لاتضی کی محبت کے ساتھ۔'' کپکپاتی آواز میڈن روڈ میں گونجی تھی۔

'' تو محبت مانگی بھی کس نے ہے تم سے؟ میں تو اپنی زندگی مانگ رہا ہوں جو صرف تمہارے ساتھ سے ممکن ہے۔ کیا یہ بھی نہیں دے سکتی تم؟'' کبھی کوئی نیلسن کے سامنے بھی اپنی زندگی کے لیے اتنا گر گڑایا نہیں ہوگا۔

''آسٹن مجھے مزید امتحان میں مت ڈالو۔''اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے وہ بھی اس سے کچھ فاصلے پر گھٹنوں کے بل گر پڑی۔

"میں کبھی بھی تم سے محبت نہیں مانگوں گا۔ کبھی بھی نہیں۔'' یہ بےبسی تھی جو محبت نے اسے عطا کر دی تھی۔

''بولو ماریہ۔ کیا تمہیں میرا ساتھ قبول ہے؟''اس نے اس کے چہرے کو دیکھا جہاں سے وہ کسی جواب کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

انداز ایسا تھا کہ جیسے کہہ رہا ہو کہ کیا ماریہ تمہیں میری زندگی قبول ہے؟

یہ اقرار تھا یا بھیک؟

ٹھنڈے پڑتے لندن کے یہ سمجھنا مشکل تھا

میڈن روڈ پر صرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔

آوز تھی تو صرف اس ملکہ کی۔۔۔

یا پھر اس گر گڑاتے ہوئے فقیر کی جو اس ملکہ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

وہ کچھ سوچنے لگی۔

اس دوران اس کا چہرہ مسلسل بھیگتا رہا۔

کچھ سوچنے کے بعد وہ ہاں میں سر ہلاتے ہوئے آسٹن کے گلے سے لگ گئی۔اس کے کندھے پر سر لگائے اسے اب لندن کی پروا بھی نہ رہی تھی۔وہ دونوں اسی حالت میں اسٹریٹ کے کنارے پر بیٹھے تھے۔

آہ۔۔۔۔ جلد باز لندن کی جلد باز لڑکی۔

''بہت بہت مبارک ہو آسٹن۔'' کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ انہیں اپنے سر کے اوپر غبارے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے تھے جن سے گلیٹرز نکل کر ان کے اوپر گر رہے تھے۔

ان دونوں نے بیک وقت سر اٹھا کر دیکھا تو وہاں ان کے تینوں دوست ٹالی، آرنلڈ اور رچارلس کھڑے تھے۔

وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے اس کونے کی دوسری طرف چھپے ہوئے تھے۔اس طرف اندھیرا تھا شاید اسی وجہ سے انہیں ان کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

آسٹن نے ماریہ کو یونہی ساتھ لگاتے ہوئے اٹھایا۔

یکے بعد دیگرے کئی غبارے پھٹ چکے تھے۔اور رچارلس کے ہاتھ میں پکڑی سنو سپرے نے ان کے سر اور چہرے کو سفید جھاگ سے ڈھانپ دیا تھا۔

''نئی زندگی کا آغاز مبارک ہو پیاری ماریہ۔''ٹالی نے آگے بڑھ کر اسے محبت سے گلے لگایا۔

'میڈن روڈ پر زندگی ایک دفعہ پھر چل پڑی تھی۔

پوری اسٹریٹ جشن میں ڈوبی نظر آرہی تھی۔۔۔

ایک اور رومیو کو اس کی جولیٹ مل گئی تھی۔۔۔

اور لندن اسی بات پر خوش تھا۔۔۔

مگر اس کہانی کے انجام سے بے خبر تھا۔

(_________)

''ڈاکٹر ب کیسی حالت ہے میجر بلال کی؟''بریگیڈئر نثار فاروقی آئی سی یو سے نکلتے ایک ڈاکٹر کی طرف لپکے۔

''الحمداللہ۔وہ اب خطرے سے باہر ہیں۔ گولیاں ہم نے نکال دی ہیں۔ کچھ دیر بعد ہم اُنہیں کمرے میں منتقل کر دیں گے۔''چہرے سے ماسک اتارتے ہوئے اس مسیحا نے خوش خبری سنائی تھی۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔''آنکھوں میں آئے آنسوؤں سے انہوں نے اوپر کی جانب سر اٹھا کر اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

برگیڈئر نثار فاروقی کے لیے میجر بلال ان کی اولاد سے بھی بڑھ کر تھے۔اور ان کے دوست کی آخری نشانی بھی۔

کچھ دیر بعد میجر بلال کو کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔

"جہاں دو گھنٹے کے بعد وہ اپنے ہوش وحواس میں لوٹ چکے تھے۔

'' کیسے ہو جوان؟''بریگیڈئر نثار ان کے بیڈ کے قریب آکر کھڑے ہوگئے۔

''الحمداللہ سر۔''نرم سی مسکراہٹ سے جواب دیتے ہوئے انہوں نے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''اور مورال؟''وہ بھی مسکرائے تھے۔

''ویری ہائی سر۔''وہ موت کو شکست دے چکے تھے۔ایسے میں ان کا مورال تو آسمانوں سے بھی بلند تھا۔

''تمہارے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔اور کزئی ایجنسی کو بھی دشمن کے قبضے سے چھڑوا لیا گیا ہے۔''بریگیڈئر صاحب کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجی تھی۔

''الحمداللہ۔''چہرے پر ابھی بھی وہی مسکراہٹ تھی جو آرمی کا ہر فرد ان کے چہرے پر ہمیشہ سے دیکھتے آیا تھا۔

''کاش شہادت میرا بھی مقدر بن جاتی۔''

ایک خلش تھی جو ن کہ دل میں باقی بچی تھی یا پھر ایک خواہش جو ناکام ہوکر حسرت میں بدلی تھی۔

''میرے بیٹے اس زمین پر صرف یہی ایک محاز نہیں تھا۔ابھی تو تم سے قدرت نے اور بھی کام لینے ہیں شاید۔''انہوں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے ان کے افسوس کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''ان شاء اللہ سر۔''وہ پھر پر عزم ہوئے تھے۔دو عدد گولیاں اُنہیں کمزور نہیں کر سکتی تھیں۔

''اب آرام کرو۔جب تک صحت یاب نہیں ہوجاتے اس بستر سے پاؤں نہیں نیچے اتارو گے۔''بریگیڈئر صاحب کی طرف سے وارننگ ملی تھی۔

''یہ تو مشکل ہے سر۔''ان کا اشارہ ضربِ عضب آپریشن کی طرف تھا۔

''دیکھتے ہیں۔''وہ جانے کے لیے مڑے۔

''سوری سر۔''انہوں نے انہیں دوبارہ مخاطب کیا۔

''سر میجر ارتضی کی کوئی خبر آئی؟''اس حالت میں بھی انہیں صرف اپنے دوست کا خیال آیا تھا۔

''ہاں اب تک وہ پہلی پوسٹ پر پہنچ چکے ہوں گے۔'دعا کرو کہ اللہ ہمیں اس میدان میں بھی کامیابی سے سرخرو کرے۔''اب کی بار ان کا لہجہ دھیما پڑا تھا۔

''ان شاءاللہ سر۔''میجر بلال بھی کسی احساس کے تحت خاموش ہوئے تھے۔

''اوکے ینگ مین۔اپنا خیال رکھنا۔اللہ حافظ۔''وہ چلے گئے تھے۔

جبکہ میجر بلال مختلف سوچوں کے بھنور میں پھنس گئے۔سوچتے سوچتے جانے کب ان کی آنکھ لگی تھی۔شاید یہ ان دوائیوں کا جلد اثر تھا جو نرس کچھ دیر پہلے انہیں دے کر گئی تھی۔

(_________)

''ناظرین یہاں ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ سیاچن کے محاز پر ایک بڑے ایوالانچ آنے پر پاکستان آرمی کی زاہد پوسٹ برف کے ملبے تلے دب گئی ہے۔"

چائے کے ہوٹلوں سے لیکر گھر کے ڈرائنگ رومز میں پڑے ٹی وی، شاندار عمارتوں میں نصب بڑی بڑی ایل سی ڈیز پر ایک ہی خبر رواں دواں تھی۔

''ایک اطلاع کے مطابق اس پوسٹ پر پاکستان آرمی کے تقریبا چودہ کے قریب جوان اس وقت ڈیوٹی پر موجود تھے۔"

چائے کے ہوٹلوں اور دکانوں کے قریب لوگ اس خبر کو سننے کے لیے لمحہ بھر کے لیے رکتے اور پھر افسوس کرکے آگے بڑھ جاتے۔جگہ جگہ چینلز بدلنے جانے لگے لیکن ہر چینل سرخ رنگ کا دکھائی دیتا جس پر موٹے موٹے حروف میں اس واقعے کی اطلاع درج ہوتی۔اور ساتھ میں نیوز اینکرز کے چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں عجب ماحول پیدا کر رہی تھیں۔

''نہایت افسوس کے ساتھ بتاتے چلیں کہ پوری پوسٹ مکمل طور پر برف کے تودے تلے دب چکی ہے۔"

گھر میں لگے ٹی ویز پر بوڑھے لوگ تبصرہ کرنے لگے۔ کیچن میں سے نکل کر کوئی خاتون آتی اور کچھ دیر خبر سننے کے بعد دوبارہ اپنا کھانا بنانے چلی جاتی۔

زندگی ایک لمحہ رکتی اور پھر چل پڑتی۔

''ایک رپورٹ کے مطابق یہ ایوالانچ رات ساڑھے دس اور گیارہ بجے قریب اس پوسٹ کی طرف آیا تھا۔"

''پاکستان آرمی کی ریسکیو کی ٹیمیں باڈیز کی ری کوری کے لیے سیاچن کی طرف چل دی ہیں۔"

بڑے آفس میں بیٹھا کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے اپنی فائلز سے سر اٹھا کر اسکرین کو دیکھتا اور دوبارہ اپنے کام میں متوجہ ہوتا۔

آفس کے کیبنز میں کی بورڈز کی ٹک ٹک ایک لمحہ کے لیے رکتی اور دوبارہ وہی آوازیں بلند ہونا شروع ہوجاتیں۔

''افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ حالیہ سیاچن پر میجر ارتضی حدید کی کمانڈ میں بھیجی جانے والی الفا پارٹی بھی اسی پوسٹ پر موجود تھی۔"

دنیا میں اس وقت بڑی ظالم چیزیں موجود تھیں لیکن ان برفیلے پہاڑوں سے زیادہ نہیں۔

کتنے جوان تھے جو اس برفیلے قبرستان میں دفن تھے۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس برف نے کتنے ہنستے چہروں کو سرد کیا تھا۔

کتنی جوان لاشوں کو نگلا تھا۔

کتنے ہی اپنے تھے جو ان پہاڑوں پر آئے تھے لیکن کبھی لوٹ کر واپس نہیں گئے تھے۔

یہاں کتنے بیٹوں کا خون اس برف پر بہا تھا۔

لیکن کہیں بھی ایسا نظر نہیں آتا تھا۔

وہ پہاڑ نہیں تھے۔۔۔۔۔برف کی دلدل تھے۔

جس میں کوئی جوان بیٹا اترتا تو بس اس کے اندر دھنستا ہی چلا جاتا۔

تاریخ نے ایک دفعہ خود کو دہرایا تھا شاید۔

گیاری کا حادثہ اس بلندی پر ایک دفعہ پھر رونما ہوا تھا۔

تب ایک سو چالیس کے قریب اس ملک کے جوان سالہ بیٹے برف کے نیچے ابدی نیند سو گئے تھے۔

یہ کیسا خراج تھا جو اس بلندی پر وصول کیا گیا تھا؟

اب زاہد پوسٹ ایوالانچ کا لقمہ بنی تھی جس میں میجر ارتضی سمیت چودہ شیر دل جوان برف تلے دب گئے تھے۔

شاید ہمیشہ کے لیے۔

ریسکیو کی ٹیمیں بڑی دقت کے ساتھ اس جگہ پہنچ چکی تھیں۔ ستر کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے چلنے والی ہوائیں ہر بڑھتے قدم کو دو فٹ پیچھے کی جانب دھکیل رہی تھیں۔ اس حالت میں ریسکیو آپریشن کرنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔

مشکل تھا مگر پاک آرمی کے ناممکن نہیں۔

''ناظرین یہاں ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ پاکستان آرمی کی ریسکیو کی ٹیمیں سیاچن پر پہنچ چکی ہیں۔ لیکن یہ بتایا جا رہا ہے کہ موسم کی شدت کی وجہ سے آپریشن میں دقت پیش آ رہی ہے۔''

لمحہ لمحہ سے آگاہی دی جا رہی تھی۔

بعض دفعہ یہ آگاہی بھی کتنی جان لیوا ہوتی ہے۔

کاش کوئی اس بات کا اندازہ میجر بلال سے لگاتا۔ یہ خبریں نہیں تھیں بلکہ بہت بڑے ایوالانچز تھے جو میجر بلال کو اس وقت اپنے اوپر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔

ہر ایک منٹ بعد ایک ایوالانچ آتا اور میجر بلال اس کے نیچے دب جاتے۔

سردی کی لہر پورے جسم میں دوڑتی اور جسم جمود اختیار کر لیتا۔

پھر یہ جمود ٹوٹتا اور خون گردش کرنے لگتا لیکن دل دھڑکنے سے انکاری ہو جاتا۔

کیسے دھڑکتا وہ اب میجر ارتضی کے بغیر۔

اگر میجر بلال دل تھے تو میجر ارتضی ان کی دھڑکن۔

جب دھڑکن ہی نہ رہے تو پھر دل کا دھڑکنا کیسا؟

خون کا جمنا یا گردش کرنا کیسا؟

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سانس کا آنا یا جانا کیسا؟

زندہ رہنا یا نہ رہنا کیسا؟

یہ پہلا واقعہ نہیں تھا جس نے ہر آنکھ کو نم کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ حادثات ان بلندیوں پر رونما ہوتے رہتے تھے۔

کوئی بیٹا گھر سے جاتا تھا ان بلندیوں کو اپنے قدموں تلے محسوس کرنے لیکن برف کی دلدل میں دھنس جاتا۔

کوئی بھائی بہن سے جلد لوٹ کر آنے کا وعدہ کرتا لیکن اس ظالم برف کی دراڑوں میں ہمیشہ کے لیے پھنس جاتا۔

کوئی باپ اپنی بیٹی کو واپسی پر گڑیا دلوانے کے بہانے سے ان پہاڑوں پر آتا لیکن ہمیشہ کے لیے برفیلی چادر اوڑھ کر سو جاتا۔

کوئی ماں اپنے بیٹے کے لوٹ کر آنے کی امید میں بوڑھی ہو جاتی لیکن بیٹا لوٹ کر نہیں آتا۔

کوئی باپ بیٹے کے جسدِ خاکی کی تلاش میں آنسو بہا بہا کر اپنی قوتِ بصیرت کمزور کر لیتا۔

ایسا پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ یہ تو ان پہاڑوں کا معمول تھا۔

بظاہر یہ سفید دامن والے پہاڑ حقیقت میں بہت سے جوانوں کی شہادتوں کے ذمہ دار تھا۔ ان کا سفید دامن اپنے اندر سرخ رنگ کی ایک بڑی مقدار رکھتا تھا۔

کاش یہ پہاڑ جان سکتے کہ کیسے مائیں اپنے بیٹوں کی واپسی کے لیے بوڑھی ہوتی ہیں؟

کاش یہ جان سکتے کہ بہنیں کیسے اپنے بھائیوں کے لوٹ آنے کی منتظر ہوتی ہیں؟

کاش یہ ظالم پہاڑ جان سکتے کہ بیٹیاں کیسے اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہو جاتی ہیں؟

کاش یہ جان سکتے کہ بوڑھے باپ کیسے اپنے بیٹوں کی جوان لاشیں اپنے کندھوں پر اٹھاتے ہیں؟

کاش۔۔۔۔۔۔!

کاش۔۔۔۔۔۔!

(__________)

''اب تک کے پاک آرمی ریسکیو آپریشن میں گیارہ کے قریب جوانوں کی باڈیز کو ریکور کر لیا گیا ہے جبکہ تین باڈیز کی تلاش ابھی بھی جاری ہے۔ جن میں میجر ارتضی حدید، حوالدار گل ریز خان اور نائیک صوبیدار سلیم نواز کی باڈیز شامل ہیں۔ پاک آرمی کا کہنا ہے کہ وہ جلد آپریشن کر کے ان تین جوانوں کے جسدِ خاکی بھی تلاش کر لے گی۔''

آہ۔۔۔

یہ خبریں بھی کتنی قیامت ڈھا دیتی ہیں۔ ہنستے مسکراتے چہروں پر ٹی وی کی سرخ اسکرینز ماتم کے رنگ سجا دیتی ہیں۔ چلتی پھرتی دنیا کو ایک لمحہ کے لیے وہیں روک دیتی ہیں۔

کاش ایسی خبریں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

گولیوں کے زخم بھولے بھی نہ تھے کہ برف ایک اور گہرا زخم دے گئی۔

گولیاں لگنے کے باوجود میجر بلال اس آپریشن کے لیے پاک آرمی کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

ان کا بس چلتا تو وہ اس برف کی قبر کو اپنے ہاتھوں سے کھود کر اس میں دفن اپنے دوست کو نکالتے۔

ان کا بس چلتا تو شاید وہ اس برفیلے ریگستان کو آگ لگا دیتے۔

لیکن ان کا بس ہی تو نہیں چلا تھا۔ ہاسپیٹل کے کمرے میں بند وہ اس وقت دنیا کے سب سے بے بس انسان ثابت ہوئے تھے۔

بہت ہی لاچار۔۔۔

جوڑ کر بھی ان بلندیوں پر نہیں جا سکتے تھے۔

ان کا دل اس بات کو ماننے سے انکاری تھا۔

لیکن اب تک کی پہنچنے والی خبروں سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ میجر راتضی حدید اب ان کے ساتھ مزید نہیں رہے۔

وہ پہلے روئے تھے ابرش کے لیے۔۔۔

پھر نائیک عطااللہ شہید کے لیے۔۔۔

اور اب۔۔۔۔

اب اپنے دوست میجر راتضی حدید شہید کے لیے۔۔۔۔

یہ آخری لفظ ایسا تھا کہ ان کے جسم سے جیسے روح کھینچلی گئی ہو۔۔۔

اتنی تکلیف نہیں گولیاں لگنے کے دوران محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اب اپنے دوست کے نام کے ساتھ شہید لگاتے ہوئے ہو رہی تھی۔

''کاش میں تمہارے پاس آ سکتا ارتضی۔ تمہیں اس ٹھنڈی قبر سے نکل کر اپنے سینے سے لگا کر اپنی ساری حرارت تمہیں دے سکتا۔ کاش میں رشک سے تمہارے ماتھے پر ایک بوسہ دے سکتا۔ لیکن میرے دوست میں مجبور رہوں۔ بہت ہی مجبور۔ بار بار اجازت مانگنے کے باوجود مجھے تمہارے پاس آنے کی اجازت نہیں ملی۔ اللہ تمہیں سرخرو کرے آمین۔''

یہ لفظ نہیں تھے۔ دل سے اٹھنے والے جذبات تھے جو زبان کے راستے نکل رہے تھے۔

روتے ہوئے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

وہ ابرش کےبعد مسکرا سکتے تھے کیونکہ تب میجر راتضی تھے۔

لیکن اب وہ کبھی بھی مسکرا نہیں سکتے تھے۔۔۔کیونکہ اب میجر راتضی کے بعد کوئی دوسرا میجر راتضی نہیں تھا۔

(۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

زندہ رہیں ہم تو کیا، جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا
ہستی ہی کیا ہے اپنی زمانے کے سامنے
اک خواب ہیں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا
ب کون منتظر ہے ہمارے لیے وہاں
شام آ گئی ہے لوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا

وہ بیڈ کی چادریں درست کر رہی تھی کہ جبھی اسے ڈور بیل سنائی دی۔ تکیہ بیڈ کی کراؤن سے لگا کر وہ دروازہ کھولنے چلی گئی۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے کوئی نہیں تھا۔ اس نے دروازے سے گردن نکال کر دائیں بائیں دیکھا تو فلیٹس کے باہر بنے کوریڈور میں اسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔

دروازہ بند کر کے وہ واپسی کے لیے مڑی تو اسے اپنے پاؤں تلے کچھ محسوس ہوا۔ اس نے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو وہاں نیچے ایک بند لفافہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے جھکتے ہوئے اس لفافے کو اٹھایا تو اس بند لفافے پر اس کی ماما کے گھر کے پتا لکھا ہوا تھا۔ یعنی وہ خط اس کی ماں نے لکھا تھا۔

وہ حیرت سے اس خط کو لیکر کمرے میں آ گئی۔

اس کی ماں نے اسے خط کیوں لکھا تھا حالانکہ وہ اسے کال بھی کر سکتی تھیں۔ یہی بات اسے پریشانی میں بھی مبتلا کر گئی تھی۔

آسٹن باہر ایک ضروری کام سے گیا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے ہی انہوں نے شادی کی تھی۔ وہ ماریہ کو اپنے ساتھ اس نئے فلیٹ میں لے آیا تھا۔

لفافہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنی ماں کو فون کیا تھا۔

دو تین گھنٹیاں جانے کے بعد اس کی ماں نے فون اٹھا لیا تھا۔

''ماں یہ خط آپ نے بھیجا ہے؟'' حال چال پوچھنے کے بعد اس نے دریافت کیا۔

''ہاں یہ خط پاکستان سے آیا تھا تمہارے نام پر۔ میں تو اب تمہاری طرف آ نہیں سکتی تھی اس لیے تمہارے فلیٹ پر ہی پوسٹ کر دیا۔ خیریت تو ہے نا بیٹا؟'' اس کی ماں نے خط کا دریافت کیا۔

''جی۔''

ایک دو ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

''پاکستان سے؟'' دل ایک عجیب سے خیال سے تیزی سے دھڑکا تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافے کو کھولا تو اس کے اندر سے دو صفحے نکلے تھے۔ ایک صفحہ سادہ تھا جبکہ دوسرا کسی ڈائری کا ایک خوبصورت صفحہ تھا۔

فطرت کے عین مطابق اس نے ڈائری والے صفحے کو پہلے اٹھایا تھا۔

وہ صفحہ کھول کر پڑھنے لگی۔

'ماریہ۔۔۔۔!

سمجھ نہیں آ رہا کہ میں اپنی بات کہاں سے شروع کروں۔ مجھے لفظوں کا استعمال نہیں آتا اور نہ ہی میں یہاں ان کا استعمال کروں گا۔

اپنی اصل بات کی طرف آنے سے پہلے میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔ تم نے اس دن مجھ سے بہت بار رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ایک مجبوری کے تحت میں تمہارے کسی پیغام کا جواب نہ دے سکا۔ شاید تم اس بات سے بے خبر ہو کہ میرا تعلق پاکستان آرمی سے ہے۔ اس لیے اس دن بھی مجھے ایک ضروری کام کے لیے قریبی شہر میں بنے ایک ہیڈ کوارٹر جانا تھا لیکن تم سے ملاقات بھی ضروری تھی۔ اس لیے مزید تم سے کوئی بات کیے میں وہاں سے چلا گیا۔ اگلے دن صبح ہونے سے پہلے مجھے پھر ہیڈ کوارٹر جانا پڑا۔ ہماری تربیت کے دنوں کا آغاز ہونے جا رہا تھا بس اس کی بریفنگ کے لیے مجھے جانا پڑا۔

افسوس میرے موبائل کی بیٹری بھی ختم ہو گئی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو میں ضرور تمہارے فون کا جواب دیتا۔ جب دوپہر کے بعد میں واپس گیسٹ ہاؤس آیا تو وہاں ریسپشنسٹ سے تمہارا خط ملا جس میں تم نے اپنے جانے کی اطلاع دی۔ جسے پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ تم بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو چکی ہو۔ تمہیں لگا کہ میں نے اس ملاقات کو آخری ملاقات اس لیے کہا کہ میں تم سے دوبارہ ملنا نہیں چاہتا تھا تو یہ بات بالکل غلط تھی۔ میں نے شاردہ کا حوالہ دیا تھا کہ شاید یہاں ہماری ملاقات آخری ہو۔ اپنے کام کی حساسیت کی وجہ سے میں تمہیں اس کی وضاحت نہیں دے سکا۔

میں واپسی پر بھی تم سے کوئی رابطہ نہیں کر سکا کیونکہ مجھے اپنی پوسٹنگ والی جگہ پر جلدی جانا تھا۔ اور یہ خط بھی تمہیں جانے سے پہلے لکھ رہا ہوں۔ اگر اللہ نے چاہا تو میں اسے واپسی پر تمہارے پتے پر بھیجوں گا۔

تم جانے سے پہلے مجھ سے اپنی محبت کا اقرار کرنا چاہتی تھی اور میں بھی لیکن قسمت نے واقعی موقع نہیں دیا۔''

یہ پڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح سے کانپے تھے اور بھوری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"تم نے مجھے خواب میں دیکھا تھا لیکن میں نے تمہیں حقیقت میں تم سے بھی پہلے دیکھا تھااور پہلی نظر میں ہی میرا دل تمہاری محبت میں گرفتار ہوا تھا۔اس پہلی نظر میں محسوس کیے گئے جذبات میں تمہیں لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ مجھے لگا تھا کہ تمہیں خاص طور پر میرے لیے ہی آسمانوں سے اتارا گیا تھا۔"

کتنا خوبصورت اقرار ہو رہا تھا۔

آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔۔۔

محبت کی بارشیں برس رہی تھیں۔۔۔

تمہیں لگا تھا کہ شاید مجھے تمہارے لیے بنایا گیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ تمہیں صرف میرے لیے ہی بنایا گیا ہے۔

ماریہ محبت کبھی بھی کسی ایک دل کو اپنے سحر میں گرفتار نہیں کرتی۔ایک دوسرے کے لیے نہ سہی لیکن چاہے جانے والے دل کو یہ کسی اور کی محبت میں ضرور گرفتار کرتی ہے۔

میرے دل کو بھی اس نے گرفتار کیا تھا۔اس لڑکی کی محبت میں جو میرے کسی عکس سے پچھلے کئی سالوں سے محبت کرتے آ رہی تھی۔اس حقیقت کے کھلنے سے پہلے ہی میرے دل کو تمہاری محبت کا مرض لاحق ہوا تھا۔اور اس کا احساس مجھے شاردہ یونیورسٹی میں ہی ہوا تھا جب یہ دل تم پر پڑنے والی پہلی نظر پر دھڑکا تھا۔"

کپکپاتے ہونٹوں سے پڑھتے ہوئے اس نے صفحے کو پلٹا۔

"تو مجھے کہنے دو ماریہ کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماریہ۔اتنی کہ تم اس کی پیمائش کبھی بھی نہیں کر سکتی۔۔کبھی نہیں۔

تم بہت جذباتی ہو ماریہ۔اگر تم اس دن بھی جذبات سے کام نہ لیتی تو شاید آج ہم دونوں ایک ہوتے اور ایک ساتھ ہوتے۔ لیکن خیر ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔شاید تب ہمارا ملنا منظور نہیں تھا لیکن اب ایسے لگتا ہے کہ یہ دعا قبول ہو جائے گی۔ میں ابھی بھی تمہارے لوٹ کر آنے کا منتظر ہوں۔

امید ہے کہ تمہیں میرا تحفہ بہت پسند آیا ہوگا۔وہ دھن میں نے خاص طور پر تمہارے لیے ریکارڈ کروا کر اس کارڈ میں بھری تھی۔تاکہ میں لندن میں بھی تم سے جدا نہ رہوں۔۔شاید تم نے اسے ابھی تک کھولا نہیں ہے ورنہ تمہیں وہ خط لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔۔۔ایسا ہی ہے نا؟

اپنا خیال رکھنا پیاری ماریہ۔۔۔۔۔۔!

تمہارا منتظر!

میجر ارتضی حدید

خط کو گلے لگائے وہ الماری کی طرف بھاگی جہاں اس نے میجر ارتضی کا دیا گیا تحفہ رکھا تھا۔وہ اس تحفے کو اپنے ساتھ ہی آسٹن کی اجازت سے ادھر لے آئی تھی۔

اس نے بے دردی سے اس سرخ رنگ کے ریپر کو پھاڑا۔اس کے اندر چوکور شکل کا ایک ڈبہ تھا۔اس نے جلدی سے اس ڈبے کو کھولا۔اس نے اس تحفے کو باہر نکالا تو اس میں ایک چھوٹا سا کسی آدمی کا بت بنا تھا جس نے ہاتھ میں وائلن کی اسٹک پکڑی ہوئی تھی اور اپنی ٹھوری کو چن ریسٹ سے ٹکائے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ وائلن بجا رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے آن کا بٹن دبایا تو اس کا اسٹک والا ہاتھ چلنے لگا۔

وہی دھن اس کمرے میں چاروں طرف پھیلنے لگی۔

آنکھوں میں آنسوؤں کو رگڑتے ہوئے اس نے ڈبے کے اندر جھانکا تو وہاں ایک چھوٹا سا کارڈ رکھا گیا تھا۔اس نے اس کارڈ کو نکل کر کھولا تو اس کے اندر لکھے گئے الفاظ کو پڑھ کر اس کا دل چاہا تھا کہ وہ خود کو اسی وقت ختم کر لے۔

"A GIFT FOR MY LOVE"

لیکن نہ قیامت ٹوٹی اور نہ اسے موت آئی۔

ایک اور پچھتاوا۔۔۔۔عمر بھر کے لیے۔۔۔۔

کاش وہ اس تحفے کو پہلے کھول لیتی۔۔۔

کاش۔۔۔۔!

وہ اس سارے عمل کے دوران دوسرے صفحے کو بھول چکی تھی جو کہ میجر ارتضی کے خط کے ساتھ ہی تھا۔اس کا خیال آتے ہی اس نے اس صفحے کو کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"امید ہے کہ تم ٹھیک ہو گی ماریہ۔ میں ارتضی کا دوست بلال ہوں۔ یہ خط ارتضی نے تمہیں اپنی زندگی میں لکھا تھا۔ مگر مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے تمہیں پوسٹ نہ کر سکا۔ یہ خط مجھے اس کی ڈائری سے ملا تھا جسے وہ شاید تمہیں جلد پوسٹ کرنا چاہتا تھا لیکن ایسا ہو نہ سکا۔

کیونکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ لیکن اس کی خواہش تھی کہ وہ تم سے اپنے دل کی بات کہہ سکے۔اسی لیے یہ خط میں تمہیں پوسٹ کر رہا ہوں۔

اگر ہو سکے تو اسے معاف کر دینا۔

بلال احمد"

اب کی بار اس نے شدت سے چاہا تھا کہ اسے واقعی موت آ جائے۔

دھن بجتی جا رہی تھی۔اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے ری ایکٹ کرے۔

محبت کے اقرار پر اس دھن میں رقص کرے؟

یا پھر۔۔۔

میجر ارتضی کے دنیا چھوڑ جانے پر اسی دھن پر ماتم کرے؟

دوسرا آپشن بہتر تھا۔

پورے کمرے میں اس کی رنج میں ڈوبی چیخیں گونجنے لگیں۔اور انہیں چیخوں میں بچیوں کے رونے کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔وہ آوازیں کانوں کے پردے پھاڑنے تک کی حد تک بلند ہورہی تھیں۔۔۔

"ارتضی!!!!!!!!!۔۔۔"وہ اپنا سر دیوار میں دیوانہ وار مارنے لگی۔

وائلن کی دھن گونج رہی تھی اور اس میں ان بچیوں کے رونے کی آوازیں۔۔۔

کچھ کچھ خواب جیسا تھا۔

کاش وہ خواب ہو اور اس کی آنکھ کھل جائے۔۔۔مگر ہر حادثہ خواب بھی تو نہیں ہوتا۔

"خاموش ہوجاؤووو۔۔۔"وہ چاروں سمت گھوم کر ان غائبی آوازوں کو خاموش کروانے لگی جیسے کہ وہ اپنے خواب میں کیا کرتی تھی۔

لیکن آوازیں بلند سے بلند تر ہورہی تھیں۔

"خاموش ہوجاؤ خدا کے لیے۔"وہ بالوں کو مٹھیوں میں بھینچے زمین پر گر پڑی تھی۔

وہ مجسمہ ابھی بھی وہی دھن بجا رہا تھا لیکن ماریہ کو وہ دھن بھلی لگنے کی بجائے ماتم میں ڈوبی لگ رہی تھی۔۔۔

دل کے اندر کا موسم ہی دھن کو بھلا بناتا ہے۔جب اندر ہی بین جاری ہو تو کیا دھن اور کیا اس کی مٹھاس۔

"کاش یہ سب ہونے سے پہلے میری روح میرا جسم چھوڑ جاتی۔۔۔"

"کاش۔۔۔۔۔!"اس کے ساتھ ہی ایک اور چیخ غم میں ڈوبی ہوئی بلند ہوئی تھی۔

وہ خود کو پیٹنے لگی۔اپنے بالوں کو نوچنے لگی۔۔

پچھتاوا۔۔۔

صرف پچھتاوا۔۔۔

اور دکھ۔۔۔

ارتضی کے اس دنیا سے چلے جانے کا۔۔۔اس کی کیفیت کو لکھنا مشکل تھا۔۔

بہت ہی مشکل۔۔۔

دنیا میں کوئی ایسا لفظ نہیں ایجاد ہوا جو کہ اپنے کسی بہت ہی پیارے کے اس دنیا سے چلے جانے کو بیان کرسکے۔

"کاش تمہاری جگہ مجھے موت آجاتی ارتضی۔۔۔کاش۔"

زندگی ماتم بننا شروع ہوگئی تھی۔۔۔

خواب کا دوسرا حصہ سچ ہونے لگا تھا۔۔۔۔

ارتضی کی دعائیں قبول ہونے لگی تھیں۔۔۔

وہی ماتم میں ڈوبی دھن۔۔۔

وہی بین کرتیں بچیوں کی آوازیں۔۔۔

اور وہی پاگل ہوتی ماریہ۔۔۔۔۔

جلد بازی ہمیشہ خسارے کے سمندر کی لہروں کے حوالے کرتی ہے۔جن کے بھنوروں سے نکلنا بعض دفعہ مشکل ہوجاتا ہے۔اور پھر یہ کشتی اس سمندر میں اترتے ہی چلی جاتی ہے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کاش اس غم کو بیان کیا جاسکتا جو ماریہ نے اس وقت محسوس کیا تھا۔۔۔کاش۔۔!

ساری زندگی وہ اسی پچھتاوے میں مبتلا ہونے جارہی تھی کہ کاش وہ پاکستان نہ جاتی۔۔

کاش وہ ارتضی سے نہ ملتی۔۔۔

کاش وہ ارتضی کی محبت میں گرفتار نہ ہوتی۔۔

کاش وہ اسے اس دن بچانے نہ آتا۔۔۔

کاش وہ اس کا تحفے میں رکھا گیا کارڈ پہلے پڑھ لیتی۔۔۔

اور غموں میں سب سے بڑا غم۔۔۔

کاش ارتضی اس دنیا سے نہ جاتا۔۔۔

مگر اب گزرے وقت کو واپس نہیں بلایا جاسکتا تھا۔۔۔۔۔

کبھی بھی نہیں۔۔۔

کہ لندن کی لڑکی کی یہ داستان ایسی ہی تھی۔۔۔

(-----------)

جہاں میں ہوں۔۔۔۔!
وہاں پر ذی نفس کوئی نہیں رہتا
سوائے کاروانِ سخت جاں کے رہ نوردوں کے
جو اپنی سرزمین میں دشمن کے قدموں سے بچانے کو
ان اونچے کوہساروں، برف زاروں پر اتر آیا
جہاں میں ہوں۔۔۔!
وہاں پر برف اندر برف اگتی ہے
جہاں اتنی بلندی ہے کہ سانسیں ڈگمگا اٹھیں
ہوائیں بے حیات اتنی کہ موسم تھر تھرا اٹھیں
جہاں پر زندگی ہونے کے امکاں ٹوٹ جاتے ہیں
جہاں موسم مزاجِ یار کی صورت
گھڑی پل میں بدلتا ہے
عدو کے تنگ سینے کی طرح یہ تنگ رستے ہیں
شبوں کے بے کرم لمحوں میں ان راہوں پہ چلتا ہوں
کہ جن پر برف کی چادر رگوں کو سرد کرتی ہے
جہاں میں ہوں۔۔۔۔!
وہاں سورج نظر آتا ہے مشکل سے

جہاں پر دھوپ میں بس روشنی کا نام ہوتا ہے
جہاں گرمی کے موسم پر جاڑے کا گماں ہوتا ہے
جہاں پارہ نہیں اٹھتا
جہاں سبزہ نہیں اگتا
جہاں رنگوں کی پریوں کا کوئی میلہ نہیں لگتا
جہاں خوشبو گلابوں کی
پرندے تتلیاں اور جگنو
اسی صورت پہنچتے ہیں
کہ جب اپنوں کے خط آئیں
عدو کی بے حسی ایسی
کہ اس اندھی بلندی پر
نہ جانے کتنے سالوں سے
فقط بارود کی صورت ہمارا رزق آتا ہے
جہاں میں ہوں۔۔۔!
وہاں تصویر کا چہرہ سوالی ہے
نمودِ فن سے خالی ہے
وجودِ زن سے خالی ہے
جہاں بچوں کی باتوں کا کوئی جھرنا نہیں بہتا
جہاں بوڑھوں کی لاٹھی کی ٹک ٹک کوئی نہیں سنتا
جہاں میلوں مسافت تک
کوئی ہستی نہیں بستی
جہاں میں ہوں۔۔۔!
وہاں پر لذتِ کام و دہن کیسی
جہاں مخصوص کھانا ہے
جو باسی ہے، پرانا ہے
میرے یہ نوجوان ساتھی
کہ جن کے عزم کا پرچم ہمالیہ سے بھی اونچا ہے
یہ برفانی فضاؤں میں
مخالف سمت آتی ہواؤں سے بھی لڑتے ہیں

دلوں میں یہ ارادہ ہے
وطن کا نام اونچا ہو۔۔۔!
ہمارا امان اونچا ہو۔۔۔!
(میجر شہزاد نیر)

برفیلے ریگستان پر چلتے ہوئے وہ بالآخر زاہد پوسٹ پر پہنچ چکے تھے۔ اسی دوران موسم کے تیور بدلے تھے۔

ستر اسی کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے ہوائیں پھر ان بلندیوں پر چلنے لگی تھیں۔ جو کہ ہر قدم کو دو فٹ پیچھے دھکیل رہی تھیں۔

برف کے ٹکڑے چہرے پر پوری قوت سے ٹکرا رہے تھے۔ انہیں اگلے گھنٹے میں زاہد پوسٹ پر پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن اس برفیلے طوفان کے باعث یہ منصوبہ ناکام ہوتے دکھائی دے رہا تھا۔

اس جان لیوا طوفان میں بھی یہ شیر دل جوان ڈٹے رہے۔ یہ برفیلی اور یخ بستہ ہوائیں ان کے عزم کے ساتھ ساتھ ان کے قدموں کو ڈگمگانے میں بھی ناکام ہو رہی تھیں۔

ہر قدم کے ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ فضا میں بلند ہوتا اور دل میں جوش مزید ابھر آتا۔

''جوانو بس تھوڑی سی اور ہمت چاہیے۔ ہم اللہ کے کرم و فضل سے زاہد پوسٹ پر پہنچنے والے ہیں۔'' پھولتے ہوئے سانس کے ساتھ میجر لاتضی کی آواز پارٹی کے آخری جوان تک پہنچی تھی۔

ان کی حالت بگڑ رہی تھی۔

طوفان بہت شدید تھا۔ ایسے میں اگر کوئی بھی دوسرا ہوتا تو وہ اس سفر کو یہیں ختم کر دیتا۔

لیکن وہاں کوئی دوسرا ہوتا بھی کیسے؟

سیاچن کی ان بلند پہاڑیوں کو زندگی کا یہ اعزاز صرف پاک آرمی نے بخشا تھا۔

رات ساڑھے نو بجے کے قریب وہ لوگ اس پوسٹ پر اپنے قدم جما چکے تھے۔

اِیگلو میں پہنچ کر انہوں نے اپنی کمروں کے ساتھ بندھے ضروریات زندگی کے سامان کو اتارا۔ جس میں چنوں اور تیل کے کینز کی تعداد زیادہ تھی۔

یہ تیل یہاں چولہا جلانے کے کام آتا تھا جو اس اِیگلو میں ہر وقت چلتا رہتا تھا۔

یہ چولہا جلتا تھا تو ہی وہاں زندگی ممکن تھی۔ اسی لیے اِیگلو والے اس چولہے کو ''زندگی'' کہتے تھے۔

''شکر ہے سر آپ یہاں پہنچ گئے ورنہ راشن تو صبح کا ختم ہو چکا ہے۔ بس اس چولہے میں تیل برائے نام ہی رہ گیا تھا۔'' صوبیدار رفیق بہت ممنون دکھائی دیے۔

''بس یہ طوفان کی وجہ سے دیر ہو گئی ورنہ ہم شاید اس سے بھی پہلے پہنچ جاتے۔'' میجر ارتضی نے شوز اتارتے ہوئے اِیگلو کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔

ان کے ساتھیوں کی کمریں رسی پھرنے سے زخمی ہو چکی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ میجر عامر ان کی کمروں پر مرہم لگانے لگے۔

''صوبیدار رفیق؟'' آنکھیں بند کیے ہی انہوں نے صوبیدار رفیق کو آواز دی۔

''یس سر۔'' صوبیدار رفیق باہر سے برف اٹھا کر لائے تھے اور اسے پینے کے لیے چولہا جلا کر پگھلانے لگے۔ یہاں برف کو پگھلا کر ہی پانی کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اور اس برف کو پگھلانے کے لیے کئی گھنٹے درکار ہوتے تھے۔

یہ جوان اسی پانی کو پیتے تھے۔

''آپ کا قائد پوسٹ سے رابطہ ہوا؟''اتنی تھکن میں بھی انہیں قائد پوسٹ پر تعینات اپنے فوجی بھائیوں کا خیال تھا جن کا رابطہ اس طوفان کے باعث کئی دنوں سے زمین والوں سے کٹ گیا تھا اور اوپر سے دشمن کی حرکت کی وجہ سے وہ جوان اس پوسٹ سے کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔ میجر ارتضی اپنی پارٹی کے ہمراہ ان کے لیے ضرورت کا سامان لیکر آئے تھے جبکہ باقی کا سامان اور اسلحہ براو پارٹی ایک دن کے فرق سے لیکر آرہی تھی۔

''نہیں سر۔ تین دن سے ہم ان سے کوئی رابطہ نہیں کر پا رہے۔''وہ برف پتیلے میں رکھ کر چولہے کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

''اوپر جانے والا راستہ ابھی موجود ہے؟'' کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے صوبیدار صاحب سے دریافت کیا۔

''نہیں سر۔طوفان کی وجہ سے راستہ برف تلے دب گیا ہے۔''وہ برف کو ہاتھ کی مدد سے وقفے وقفے سے ہلاتے جا رہے تھے۔

''پتا نہیں وہ کس حالت میں ہوں گے۔میرا خیال ہے کہ ہمیں کچھ سامان لیکر ادھر چلے جانا چاہیے۔ کیا پتا وہاں بھی تیل ختم ہو گیا ہو۔'' میجر ارتضی اپنے بھاری جوتوں کے تسمے باندھنے لگے۔

''سر آپ کا اس طوفان میں وہاں جانا کسی خطرے سے کم نہیں ہے۔''وہ پریشان دکھائی دیے۔

''اور میرا یہاں رکنا قائد پوسٹ کے لیے کسی خطرے سے کم نہیں ہے۔"

میجر ارتضی کیسے اس مشکل کی گھڑی میں آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔

''سر اس گمنام راستے پر آپ سے رات کے اس وقت سفر نہیں ہو گا۔''وہ نہیں کسی بھی طرح روکنا چاہ رہے تھے۔

''آرمی گمنام راستوں کو کھودنا اچھی طرح جانتی ہے۔"وہ تسمے باندھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

پندرہ منٹ بعد ان کے ساتھ دو اور شیر دل جوان نائیک صوبیدار سلیم نواز اور حوالدار گلریز خان بھی چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

''ہم لوگ رسی کی مدد سے راستہ بناتے جائیں گے۔ صبح آپ لوگ بھی ادھر سے نکلنے کی کوشش کرنا اور اسی راستے پر چلتے ہوئے پوسٹ تک پہنچ جانا۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔آمین۔''اس کے ساتھ ہی وہ سامان اپنے ساتھ باندھ کر قائد پوسٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

طوفان کی شدت میں اضافہ ہوتے جا رہا تھا۔اس موسم میں سفر کرنا اپنی جان کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف تھا۔ لیکن پاکستان آرمی کے یہ بیٹے ہر روز اپنی جانوں کو موت کے منہ میں دھکیلتے تھے۔

حوالدار گلریز خان اور نائیک صوبیدار سلیم نواز ابھی تازہ دم تھے کیونکہ وہ اسی پوسٹ پر موجود تھے۔اپنی پارٹی میں سے صرف میجر ارتضی حدید ہی اس وقت جا رہے تھے۔اتنے لمبے سفر کے باوجود وہ آرام کی غرض سے رکے نہیں تھے۔ کیونکہ ان کے آرام سے زیادہ قائد پوسٹ میں مدد کے منتظر جوان ضروری تھے۔

برف اس وقت لوہے کے تیز او رنوکیلے ٹکروں کی طرح چہروں سے ٹکرا رہی تھی۔طوفان اتنا شدید تھا کہ اسی سے نوے فیصد کے قریب کسی بھی بڑے ایوالانچ کے آنے کے خدشات موجود تھے۔

لیکن یہ پراسرار بندے رات کے اس پراسرار پہر میں اللہ کا نام لیکر آگے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

رات کے اس وقت کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔سوائے اڑتی ہوئی برف کے جو کہ چاند کی مدہم روشنی میں انہیں اپنے چہروں کی طرف آتے محسوس ہو رہے تھے۔وہ چہرے کے پاس آتے اور پوری شدت سے ٹکراتے۔

وہ بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔اپنے بھائیوں کی محبت نے میجر ارتضی کو پھر تازہ دم کر دیا تھا۔

ان کی محبت ان شیردلوں کو اپنی طرف کھینچتے چلی جا رہی تھی۔وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کتنا سفر طے کر آئے ہیں اور ٹھیک سمت بھی جا رہے ہیں یا نہیں؟ لیکن ایک اندازہ تھا بس، جس کے تحت وہ چلتے جا رہے تھے۔

(---------)

''صوبیدار صاحب اور کب تک پانی کے لیے ترسائیں گے آپ؟'' میجر عامر کو اپنا حلق خشک ہوتے محسوس ہوا تھا۔وہ کب سے برف کے پگھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''میجر صاحب جب تک اسے پینے کا وقت نہیں آجاتا۔''ان کے جھری دار چہرے پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ کھانا کھانے کا وقت اس کے بھی بعد آئے گا۔''حوالدار شیر خان جو سفر کی تھکن کم کرنے کے لیے سیدھے لیٹے ہوئے تھے،ان کی یہ باتیں سن کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''جی بالکل حوالدار صاحب۔ لیکن آپ تب تک ہمارا دماغ کھا کر اپنی بھوک کو کم کر سکتے ہیں۔'' سیکنڈ لیفٹینٹ احمد کمال تاش کے پتے سیدھے کرتے ہوئے ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔

ان کی یونٹ میں سب سے زیادہ باتونی حوالدار شیر خان تھے۔ جو مرضی مشکل آجائے وہ خاموش نہیں ہوتے تھے۔

''ایسا ہے جون کہ بھوکے پیٹ مجھے کسی کا دماغ بھی اچھا نہیں لگتا۔''انہوں نے اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرا جس میں سے غرغوں کی آوازیں آتے محسوس ہو رہی تھیں۔

''ہاہاہا چلیں شکر ہے ہمارا دماغ اب ہماری کھوپڑیوں میں محفوظ رہے گا۔''انہوں نے تاش کے پتے یکجا کر کے ہاتھ میں پکڑ لیے۔

ایگلو کے اندر کی زندگی ایسی ہی تھی۔وقت گزاری کے لیے یہ جوان تاش یا لڈو کھیلا کرتے تھے۔

ڈیوٹی کے بعد بھی یہاں یہی گیمز کھیلی جاتی تھیں اور یہ لوگ اسی سے دل بہلاتے تھے۔

''یہ لیں میجر صاحب پانی۔''انہوں نے پانی کو ذرا سا ٹھنڈا ہونے کے بعد پلاسٹک کے گلاس میں ڈل کر میجر عامر کو پیش کیا۔

''مہربانی جناب۔''مسکرا کر گلاس تھامتے ہوئے انہوں نے گلاس کو اپنے لبوں سے لگایا ابھی ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا کہ انہیں پہاڑ کی زمین ہلتے ہوئے محسوس ہوئی۔

''جوانوں کلمہ پڑھ لو۔''باہر سے کسی سپاہی کی آواز آئی تھی جو کہ ایک بڑے ایوالانچ کو ایگلو کی طرف حرکت کرتے دیکھ چکا تھا۔اس کی رفتار ہی اتنی تھی کہ اس سپاہی کو بھی اندر داخل ہونے کا موقع نہ ملا اور نہ ہی کسی کو اس سے کچھ پوچھنے کو موقع ملا۔

ابھی کلمے کا ورد جاری ہی تھا کہ سیاچن پر بسائی گئی پوری کی پوری بستی برف کے بڑے ٹکڑے کے نیچے دب گئی۔اور یوں وہ ہنستے چہرے ہمیشہ کے لیے اس برفیلی چادر کو اوڑھ کر سو گئے۔

میجر عامر نے تو جانے سے پہلے پانی کا ایک گھونٹ تک نہ بھرا۔

کتنے پیاسے تھے وہ۔ حلق میں کانٹے اگتے محسوس ہو رہے تھے۔۔۔کاش موت تو اتنا تو انتظار کر لیتی۔

ابھی تو حولدار شیر خان نے بہت پیاری کھٹی میٹھی باتیں سنانی تھیں۔

کاش موت تو اتنا تو انتظار کر لیتی۔

ابھی تو سیکنڈ لیفٹننٹ احمد کمال نے کھیل کی ایک بازی لگانی تھی۔

کاش موت تو اتنا تو انتظار کر لیتی۔

ابھی تو باہر کھڑے سپاہی نے اپنے ساتھیوں کا چہرہ آخری بار دیکھنا تھا۔

کاش موت تو اتنا تو انتظار کر لیتی۔

ابھی تو ان کی تھکن بھی نہیں اتری تھی۔ابھی تو وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے بھی نہیں تھے۔

کاش موت تو اتنا تو انتظار کرلیتی۔

ابھی تو کلمے بھی پورے ادا نہیں ہوئے تھے۔۔۔

کاش موت تو اتنا تو انتظار کرلیتی۔

اس وقت دیکھ کر یہ کہاہی نہیں جاسکتا تھا کہ اب سے کچھ دیر پہلے یہاں ہنستے مسکراتے چہرے چٹکلے سنار ہے تھے۔ خوش گپیوں میں مصروف ہو کر اپنی تھکن کو ختم کرر ہے تھے۔

وہاں تو اس پوسٹ کانام ونشان تک مٹ چکا تھا۔

صرف برف کاایک بڑا ٹکڑا تھااور اس کے نیچے دم توڑتے پاک آرمی کے بیٹے۔

چاند سلامی دینے کے لیے پوری آب وتاب سے چمکا تھا۔

زمین سے لیکر جنت تک جانے والے راستے ان بیٹوں کے لیے سجائے جانے لگے۔

جنت والے رشک کرنے لگے۔۔۔

روحیں پرواز بھرنے لگیں۔

کاش کوئی اس وقت اس برف کے اندر جھانک سکتا۔۔۔

دیکھ سکتا کہ کیسے خواب دیکھتی آنکھیں برف کے نیچے بند ہوئی تھیں۔۔۔

کیسے دھڑکتے ہوئے دل پل بھر میں دھڑکنا بھول گئے تھے۔۔۔

رگوں میں گردش کرتا خون کیسے برف نے ٹھنڈا کیا تھا۔

جوان جسم کیسے برف کا مجسمہ بنے تھے۔۔۔۔

کیسے کسی بیٹے، بھائی، باپ یا شوہر کی روح نے اس کے جسم کا ساتھ چھوڑا تھا۔۔۔

برف اتنا ظالم تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ ان بیٹوں کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے تجھے ذرا بھی ترس نہیں آتا کہ کسی کی ماں اپنے بیٹے کے آنے کی منتظر ہوگی۔ کسی کی بہن اپنے بھائی کے آنے کا انتظار کر رہی ہوگی۔ کوئی بیٹی اپنے باپ کا راستہ تک رہی ہوگی۔ کوئی بیوی اپنے سہاگ کو ایک نظر دیکھنے کی دعا مانگ رہی ہوگی۔۔

مگر تو کیا جانے۔۔۔تیرے اندر زندگی کی حرارت ہی کہاں۔

(--------)

''اللہ رحم کرے۔ قریب ہی کہیں ایوالانچ آیا ہے شاید۔'' زمین ہلی تھی۔ میجر ارتضی نے اندازہ لگاتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں کو آگاہ کیا۔

''جی سر۔ اللہ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔'' حوالدار گل ریز خان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے سلامتی کی دعائیں کی تھیں۔

وہ چلنے لگے۔ رسی کو ان تینوں نے اپنے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ زمین ایک دفعہ پھر ہلی تھی۔ چلتے چلتے تیسرے نمبر پر موجود نائیک صوبیدار سلیم رضا کا پاؤں یکدم پھسلا تھا وہ توازن کو برقرار رکھنے میں ناکام ہوتے ہوئے نیچے کی طرف لڑھکنے لگے۔

یوں پیچھے کی طرف اچانک جھٹکا لگنے کی وجہ سے میجر ارتضی اور حوالدار گل ریز خان بھی اپنے توازن کو برقرار نہ رکھ سکے۔ وہ بھی تیزی کے ساتھ اس ڈھلوان پر لڑھکنے لگے۔ ان کے جسم پوسٹ کے دوسری جانب والی ڈھلوان کی طرف تیزی سے لڑھک رہے تھے۔ ڈھلوان بہت زیادہ تھی۔

اس لیے وہ اپنے جسموں کو روک بھی نہ سکے۔

موت کا پیٹ شاید ابھی بھی نہیں بھرا تھا اس لیے نئے شکار کی تلاش میں ان کے پیچھے بھی آگئی۔

اسی دوران ان کی اسٹکس ان کے ہاتھ سے چھوٹ پڑیں۔

موت دھیرے دھیرے انہیں بے آسرا کرنے لگی۔

رسی میں بندھنے کی وجہ سے وہ تینوں ابھی بھی ایک ساتھ تھے۔ کافی دیر وہ اسی حالت میں بے سمت لڑھکتے رہے۔ ایک بڑے سے پتھر کو شاید ان پر ترس آیا تھا اسی لیے وہ ان کے راستے میں آ گیا اور ان کے گیندوں کی طرح گھومتے جسموں کو قرار آیا۔

وہ باری باری اس بھاری پتھر سے ٹکرائے تھے۔ پتھر میں لگنے کی وجہ سے ان کے سروں پر چوٹ آئی تھی۔ اتنی شدت سے ٹکرانے کی وجہ سے وہ اپنے حواس کھو بیٹھے اور اس برفیلے بستر پر بے ہوش ہوکر خود کو سپردِ خدا کر دیا۔

(---------)

ریسکیو آپریشن میں زاہد پوسٹ پر موجود گیارہ ساتھیوں کے جسدِ خاکی مل گئے تھے۔ ان سب کے جسدِ خاکی ان کے آبائی علاقوں میں دفنا دیے گئے تھے۔ جبکہ میجر ارتضی اور ان کے باقی دونوں ساتھیوں کی لاشیں کسی کو بھی نہیں مل پائی تھیں۔ لیکن وہاں پہ ہونے والی صورتحال کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ بھی اس حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ اسی لیے ہیڈ کوارٹر میں پہنچائی گئی رپورٹ کے مطابق میجر ارتضی اور ان کے باقی ساتھیوں کی شہادت کا آفیشلی اعلان کر دیا گیا۔ جبکہ ان کی لاشوں کی تلاش جاری رکھی گئی۔

(---------)

میجر بلال دو دن بعد ان کے فلیٹ میں آئے تھے۔ ان دونوں کے پاس ایک دوسرے کے فلیٹس کی چابیاں تھیں۔ وہ ان کی ہر چیز کو چھو کر دیکھ رہے تھے کیونکہ ان کے دوست نے ان چیزوں کا چھوا تھا۔ وہ ان کے لمس کو محسوس کرنا چاہ رہے تھے جس سے وہ اب ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے تھے۔

ان کی اسٹڈی ٹیبل پر ہر چیز سلیقے سے رکھی گئی تھی۔ کتابوں کی جلدوں کو چھوتے ہوئے ان کی نظر میجر ارتضی کی ڈائری کی طرف پڑی تھی۔

جس میں سے ایک صفحہ باہر جھانک رہا تھا۔

آنسو برساتی آنکھوں سے انہوں نے اس صفحے کو نکالا تو وہ خط ماریہ کے نام لکھا گیا تھا۔ بنا کچھ سوچے سمجھے انہوں نے ایک سادہ سی نوٹ بک سے کاغذ لیکر ماریہ کے لیے کچھ لکھا اور فلیٹ کو لاک کر کے پوسٹ آفس چلے گئے۔ جہاں انہوں نے وہ خط ماریہ کے اس ایڈریس پر بھیج دیا جو میجر ارتضی نے ڈائری کے اوپر ایک اسٹکی نوٹ پر لکھا تھا۔

(--------)

ان تینوں کی لاشوں کو ڈھونڈنے کے لیے ایک ہیلی کو بھیجا گیا کیونکہ آپریشن کے دوران انہیں ایک بے سمت جاتیں نوکیلی ہکیں ملی تھیں جو کہ ایک خاص راستے کی طرف جارہی تھیں۔ ان ہکوں کے ساتھ رسیاں لگائی گئی تھیں تا کہ راستہ واضح ہو سکے۔ وہ ہکیں کچھ فاصلے کے بعد ختم ہوگئی تھیں۔

ریسکیو ٹیم کے مطابق وہ ہکیں میجر ارتضی اور ان کے باقی دو ساتھیوں نے ہی لگائی تھیں۔ اس سے پہلے وہ راستہ اس جگہ موجود نہیں تھا۔

کافی دیر پرواز کرنے کے بعد بالآخر ہیلی کو ان کے وجود مل ہی گئے۔

میجر سکندر ہیلی میں سے ایک رسے کی مدد سے نیچے لٹکے تھے۔ میجر ارتضی اور ان کے ساتھ اس برف پر بے ہوش پڑے تھے شاید۔

وہ رسہ کو نیچے لاتے ہوئے ان کے قریب اترے اور خوشی سے اوکے کا سگنل دیتے ہوئے ان کے بھاری جسموں کو اٹھاتے ہوئے ہیلی میں لائے تھے جہاں سے انہیں ہاسپٹل منتقل کر دیا گیا۔

کافی دیر برف پر پڑے رہنے کی وجہ سے حوالدار گلریز خان فراسٹ بائیٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ جبکہ میجر ارتضی اور نائک صوبیدار سلیم رضا اس سے محفوظ رہے تھے۔

حوالدار گلریز خان کے بائیں بازو اور ٹانگ کو کاٹنے کی ہدایات دے دی گئی تھیں۔۔۔

یہ بیٹے اپنے جسم کے کئی حصے اسی برف کی نذر کر دیتے تھے۔ کسی کا بازو کٹ جاتا تو کسی کی ٹانگیں۔

اور بعض تو اس ملک کو اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ ان کے دونوں بازو اور ٹانگیں ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر دی جاتیں۔ صرف ایک دھڑ رہ جاتا۔

کہ یہ ملک ایسی ہی تو قربانیاں مانگتا ہے۔

جان نہیں تو اعضاء ہی سہی۔۔۔تا کہ پتا چل سکے کہ اس ملک کے بیٹوں کو اپنی جانوں اور اپنے اعضاء سے زیادہ یہ ملک عزیز ہے۔

سلام۔۔۔

سلام۔۔

(----------)

میجر بلال کو جیسے ہی میجر ارتضی کی خیریت کی خبر ملی تو وہ اسی وقت اللہ کے حضور شکر کے لیے سجدے میں گر گئے۔ سجدے میں انہوں نے میجر ارتضی کی مکمل صحت یابی کی دعائیں مانگی تھیں جو آسمان پر سن لی گئی تھیں۔

اس کے بعد وہ سیدھا ہاسپٹل پہنچے تھے۔ ریپشنسٹ سے میجر ارتضی کے کمرے کا پوچھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر اس درمیانی فاصلے کو آن کی آن میں ختم کر لیں۔

لیکن ایسا کب ہوتا ہے۔

وقت اتنا تو انتظار کرواتا ہی ہے نا۔

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے تو میجر ارتضی کی عیادت کے لیے اس وقت دو اور آفیسر کھڑے تھے۔ میجر بلال کو دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے انہیں جلد صحت یابی کی دعا دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

'' کیسا ہے تو؟''بیڈ کی طرف لپکتے ہوئے ان کا چہرہ انہیں یوں زندہ دیکھ کر کھلکھلا ہی تو اٹھا تھا۔

''جیسا گیا تھا۔ اب کونسا سینگ نکل آئے ہیں میرے۔'' بے جان سے بھنوروں میں میجر بلال کو دیکھ کر جان آئی تھی۔

''ڈھیٹ آدمی تیری صحت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''ایک ہلکا سا مکا میجر ارتضی کے کندھے کو نصیب ہوا تھا۔

''بے شرم آدمی کسی کی عیادت کو جائیں تو خالی ہاتھ جاتے ہیں کیا؟''اس حالت میں بھی انہیں مذاق سوجھ رہا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ برف ان کی ساری رعنائی کو لوٹ کر جا چکی تھی۔

مگر جواب الٹا آیا تھا۔

انہیں شاید ابھی زاہد پوسٹ والے واقعے کا نہیں پتا چلا تھا ورنہ وہ تو شاید کئی دن بھولے سے بھی نہ مسکرا پاتے۔

''بیس کلو مٹھائی کا دیا ہے آرڈر۔۔۔ بس تیار ہو کر آتی ہی ہو گی۔'' لہجے میں غصے کے ساتھ طنز بھی امڈ آیا تھا۔

''کوئی پھول ہوتے ہیں کوئی گیٹ ویل سون کے کارڈ ہوتے ہیں لیکن تمہیں کیا پتا کہ یہ کیا ہوتے ہیں۔''برا سا منہ بناتے ہوئے وہ رخ پھیر کر بیٹھ گئے۔

''وہ دوستوں کے لیے نہیں ہوتے۔''اتنے دنوں کے بعد ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

''تو کیا مٹھائی ہوتی ہے؟ شرم تو نہیں آتی۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر تجھے مٹھائی کی سوجھ رہی ہے۔'' کتنے ماہ ہو چکے تھے انہیں میجر بلال سے لڑائی کیے ہوئے۔ یہی لڑائی ان کے پیار کی نشانی تھی۔

''دوستوں کے لیے پیار سے گلے لگا کر دی جانے والی دعائیں ہوتی ہیں۔''یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے تھے۔

ترس ہی تو گئے تھے وہ دونوں ایک دوسرے کو گلے سے لگانے کے لیے۔

اب ملے تھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی بہت صدیوں بعد مل رہا ہو۔ اور صرف اسی ملنے کی آس میں زندہ ہو۔

آنسو دونوں کی آنکھوں میں چمکے تھے۔

دوستی کیا ہوتی ہے؟

اس کا ایک ہی جواب ہے۔۔۔

میجر ارتضی اور میجر بلال۔۔۔

''ایک لمحے کے لیے مجھے لگا تھا کہ شاید اب ہم دوبارہ کبھی نہیں مل پائیں۔'' میجر ارتضی کے ذہن میں وہی بات گونجی تھی جس نے میجر بلال کی شہادت کی خبر دی تھی۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

'' مجھے بھی۔'' میجر بلال کا دل ان کی شہادت سے انکاری تھا لیکن حالات نے انہیں اس پر یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ہاں تمہیں تو لگنا ہی تھا آخر کو مجھ سے رینک میں سینئر جو ہونا چاہتے ہو۔''مصنوعی طنز بھرے لہجے سے انہوں نے میجر بلال کو خود سے جدا کیا۔

''ہاں یہ تو ہے۔''وہ سائیڈ ٹیبل پر میجر ارتضی کی میڈیکل رپورٹ والی فائل اٹھا کر دیکھنے لگے۔

جواباً میجر ارتضی مسکرا دیے۔

''اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ ابھی بہت سے کام پڑے ہوئے ہیں جو ہمیں مل کر کرنے ہیں۔''ان کا اشارہ میجر ارتضی کی بہنوں کی شادی کی طرف تھا۔

''ہاں ان شاءاللہ۔''وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے تھے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن وہ میجر بلال کی وجہ سے خود کو ہشاش بشاش دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہی حال میجر بلال کا بھی تھا۔ گولیاں لگنے کے باوجود وہ ایسے بیٹھے تھے جیسے انہیں کوئی کانٹا تک بھی نہ چبھا ہو۔

میجر بلال کے دل پر ایک بوجھ سا گر پڑا تھا۔ وہ جلد بازی میں بہت بڑا قدم اٹھا چکے تھے۔

انہیں اتنی جلدی وہ خط ماریہ کو نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ اب کیا کر سکتے تھے؟ یہی فکر انہیں کھائے جا رہی تھی۔

''پتا نہیں وہ خط اسے ابھی تک ملا بھی ہو گا یا نہیں؟'' میجر ارتضی کے پرسکون چہرے کو دیکھ کر ان کا دل پھر بے چین ہوا تھا۔ کیونکہ ان کی ایک غلطی کا پتا چلنے سے میجر ارتضی کے دل پر کیا گزرے گی وہ صرف ان کا دوست ہی سمجھ سکتا تھا۔

'' کیا ہوا؟''ان کے چہرے پر سائے سے لہراتے دیکھ کر میجر ارتضی نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں۔''وہ فی الحال انہیں کچھ بھی نہیں بتانا چاہتے تھے۔ لیکن موقع دیکھ کر وہ انہیں یہ بات ضرور بتا دیں گے۔ یہی سوچ کر انہوں نے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''تمہارے زخم اب کیسے ہیں؟''انہیں پھر سے خاموش دیکھ کر میجر ارتضی نے بات کو آگے بڑھایا۔

''کونسے زخم؟''انہوں نے انجان بننا چاہا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو جائے گا اور مجھے خبر تک نہیں ہو گی۔''مرمرا کے بھنور پھر گہرے ہوئے تھے۔

''تمہاری سلامتی کی خبرسن کر جلد ہی بھر گئے ہیں۔''ان سے بیٹھا نہیں جارہا تھا مگر وہ میجر لاتضی کو چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے تھے۔پچھلے کئی ماہ کی باتیں ابھی کرنے والی رہتی تھیں۔

''تمہیں پتا ہے جب تمہیں گولیاں لگی تھیں تو مجھے بھی ویسی ہی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔اور مجھے لگا کہ تو اب نہیں رہا۔ مگر کچھ دیر کے بعد ہی یہ دل سنبھل گیا۔ میں نے ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے کیپٹن مصطفی سے تمہارے بارے میں ہی دریافت کیا تھا۔اور پھر پتا چلا کہ دل نے جو اطلاع دی تھی وہ بالکل ٹھیک تھی۔''انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ کر اسے صحیح اطلاع دینے پر شاباش دی۔

''جاسوس کہیں کا۔'' میجر بلال نے ان کے ہاتھ کی طرف دیکھاجو کہ ابھی بھی ان کے دل والی جگہ پر تھا۔

''تمہارے معاملے میں یہ کچھ ایسا ہی ہے۔''انہیں اپنے دل پر فخر محسوس ہوا تھا۔

''اچھا۔اب تم آرام کرو۔ میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔''اپنے سینے کو ہاتھ سے سہارا دیتے ہوئے وہ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

'جواباً میجر لاتضی سراثبات میں سر ہلا کر آنکھیں موند کر لیٹ گئے۔

(________________)

دو ماہ مزید گزر چکے تھے۔آج اس کی یونیورسٹی آف لندن میں کانوکیشن تھی جس میں اسے بہترین تھیسس بنانے پر سونے کے تمغے سے نوازا جانا تھا۔

ایک خواب تھا جسے اس یونی کا ہر اسٹوڈنٹ دیکھتا تھا۔

اسٹیج ہو اور گلے میں سونے کا تمغہ۔

ماریہ کا یہی خواب پورا ہونے جارہا تھا۔

ہال میں وہ اپنی کرسی پر بیٹھے اسٹیج پر جا کر بولنے والے لفظ ترتیب دینے لگی۔

پورا ہال سنہری روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔اسٹیج کو شاندار طریقے سے سجایا گیا تھا۔ ہر چیز ایک سحر سا فضا میں پیدا کر رہی تھی جو کہ ہر آنکھ کو خیرہ کر رہا تھا۔وہاں انٹر نیشنل میڈیا بھی موجود تھا جو کہ اپنے چینلز اور اخبارات کے لیے اس پر وقار تقریب کی کوریج کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اس کا نام سونے کا تمغہ لینے کے لیے بولا گیا خوشی سے اچھلتے ہوئے وہ اپنے قریب بیٹھے یونی فیلوز کے گلے ملی تھی۔

مہمانِ خصوصی نے اس کے گلے میں تمغہ ڈالا اور اس لڑکی کو یونی آف لندن میں ہمیشہ کے لیے سرخرو کر دیا۔وہ پورے لندن تو کیا پورے برطانیہ میں سے پہلی لڑکی تھی جس نے پاکستان کی تاریخ پر اتنا شاندار تھیسس بنایا تھا۔

تمغہ وصول کر کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجائے وہ ڈائس کی طرف بڑھی۔

''میری اس کامیابی کا سہرا صرف پاکستانی لوگوں کے سر جاتا ہے۔میری اس کامیابی کے حقدار صرف پاکستانی لوگ ہیں۔ آج مجھے بین الاقوامی میڈیا کے ذریعے ایک بات پوری دنیا سے کہہ لینے دیجیے کہ جو خاکہ پاکستانی قوم کے لیے ہمارے ذہنوں میں نقش کر دیا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ یقین جانیے وہ لوگ ہماری دنیا کے لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔ بہت ہی زیادہ۔اتنا تعاون میرا نہیں خیل کہ دنیا کی کوئی قوم بھی کسی دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہو گی جتنا ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا۔اتنا پیار، اتنا امن صرف اس خطے میں ہی پایا جاتا ہے۔ میں اپنے اس تھیسس کے لیے جتنے دن بھی ادھر رہی ایک بات میرے ذہن میں گردش کرتی رہی کہ اتنے پیار کرنے والے، اتنے پرخلوص اور اتنے امن پسند لوگ کیسے دہشت گرد ہو سکتے ہیں؟ پھر ایک جواب میرے اندر سے آیا کہ وہاں دہشت وہ لوگ پھیلاتے ہیں جنہیں وہاں کی دنیا میں امن برداشت نہیں ہوتا۔ وہ کوئی بھی انسان ہو سکتا ہے لیکن وہ پاکستانی نہیں ہوسکتا۔ آج میں پورے دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ دنیا کا ہر انسان دہشت گرد ہوسکتا ہے مگر ایک پاکستانی کبھی نہیں۔۔۔کبھی بھی نہیں۔ شکریہ۔''اس کے ساتھ ہی پورا ہال کھڑا ہوا تھا اور تالیوں کی بلند آواز ان محرابوں تلے گونجی تھیں جو کہ بہت بلندی پر بنائے گئے تھے۔خوشی سے نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس نے اس داد کو وصول کیا تھا۔

تمغہ سینے سے سجائے اس کے ذہن میں میجر لاتضی کا خیال آیا تھا۔

اور اس نے دل میں اس کامیابی کا سارا کریڈٹ میجر لاتضی کو دیا تھا۔تالیوں کی گونج میں وہ اپنی کرسی پر آ گئی۔اس کے دوست نہیں آ سکے تھے۔کیونکہ اس دن انہیں چینل والوں نے بلوا لیا تھا ڈاکومیٹری آن ائیر کرنے کے لیے۔

انہوں نے اپنی ڈاکومیٹری کا نام ہی ایسا رکھا تھا کہ ہر کسی کے دل میں تجسس پیدا ہوا تھا اس ڈاکومیٹری کو دیکھنے کے لیے۔

"(THE HEAVEN ON THE EARTH(the place of love and peace"

وہ دن ان دوستوں کی زندگیوں کا سب سے یادگار دن تھا۔

کامیابی کا دن۔۔۔

کبھی نہ بھولنے والا دن۔۔۔

اپنی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے ماریہ نے ایک سرد آہ بھری تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔ لیکن یہ خوشی نامکمل تھی۔

مکمل ہوتی بھی کیسے؟

خوشیاں مکمل تو صرف میجر لاتضی کی ذات سے ہی تھیں۔

وہ بظاہر جتنا خوش نظر آتی تھی اندر سے اتنا ہی ٹوٹ چکی تھی۔

باہر اگر رومان بھری دھنیں بجتی تھیں تو اندر نوحہ کنی جاری تھی۔

وہ نہ خوش تھی اور نہ غم زدہ۔۔

بس درمیان میں ایک نقطے پر کھڑی تھی اور یہی نقطہ بہت تکلیف دہ تھا۔

گھر آ کر اس نے وہ تمغہ اس وائلن بجانے والے مجسمے کے گلے میں پہنا دیا کیونکہ وہی اس کا اصل حقدار تھا۔ آنسو پھر بہنے لگے۔ یہ آنسو پچھلے کئی ماہ سے اس کی آنکھوں میں سجے رہنے لگے تھے۔

اس کا رشتہ ان آنسوؤں کے ساتھ ہمیشہ جوڑ دیا گیا تھا۔

آسٹن اسے بہت خوش رکھنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا کیونکہ ماریہ کی خوشیاں صرف ایک شخص سے منسلک تھیں جو بدقسمتی سے اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

'' کتنا روتی ہو یار تم؟ تمہارے سر میں درد نہیں ہوتا؟'' میجر لاتضی کے الفاظ اس بند کمرے میں گونجے تھے۔

''اتنا رونے سے تمہیں ڈی ہائیڈریشن نہیں ہوتی کیا؟''

''امید ہے کہ تم ہنستے ہوئے اچھی ہی لگتی ہو گی۔''روتی آنکھیں مسکرانے لگی تھیں۔

اس کا ماننا تھا کہ روحیں ہر وقت ہمارے اردگرد موجود رہتی ہیں۔اسی لیے وہ میجر لاتضی کی روح کے سامنے صرف مسکرانا چاہتی تھی تا کہ ان کی روح کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔

اسی لیے وہ روتے روتے ہنسنے لگتی اور ہنستے ہنستے رو دیتی۔ عجب پاگل سی زندگی بنی تھی۔

ماتم۔۔۔

صرف ماتم۔۔۔

اس کامیابی کی خوشی میں اس کے دوستوں نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ایک نظر اس مجسمے پر ڈالتے ہوئے وہ اس پارٹی میں جانے کی تیاری کرنے لگی۔
اس نے آسٹن کا تحفے میں دیا ہوا ڈریس پہنا اور مکمل تیاری کے بعد فلیٹ کو دوبارہ لاک کر کے چلی گئی۔
یہی اس کی زندگی تھی۔۔۔
اور یہی اس کی کہانی۔۔۔۔
(۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

اک عزمِ مسلسل تھا
وہ عزم کیا پورا
جو ضرب لگانی تھی
وہ ضرب لگائی ہے
دشمن کو بتانا ہے
مٹی یہ ہماری ہے
ہم اس کے تقدس کا
سودا نہیں کرتے ہیں
سر رکھ کر ہتھیلی پر
اس کے لیے شعلوں کے
دریا سے گزرتے ہیں
تلوارِ عضب پھر سے
اس بار اٹھائی ہے
جو ضرب لگانی تھی
وہ ضرب لگائی ہے
طوفان کے رستے میں
دیوار کی مانند ہے
یہ قوم ہماری سب
تلوار کی مانند ہے
دشمن کے کلیجے میں
اک آگ لگائی ہے
جو ضرب لگانی تھی
وہ ضرب لگائی ہے

اسلام کے غازی ہیں
یہ ملک ہمارا ہے
دشمن کو بتادیں گے
دھرتی کے لیے ہم کو
مرنا بھی گوارا ہے
ہر دور میں ہم
اک ضرب لگائیں گے
وہ ضرب عضب ہو گی
دشمن کے شبستان پر
وہ کہر غضب ہو گی
وہ ضرب عضب ہو گی

اپریل دو ہزار سولہ کے آخر تک ضربِ عضب آپریشن کی پہلی فیز مکمل کر دی گئی۔ جس میں شمالی وزیرستان کو مکمل طور پر پاک آرمی نے اپنے قبضے میں لے لیا۔
اس آپریشن کے دوران دہشت گردوں کے بڑے نیٹ ورکس ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے گئے۔اس کے بعد آئی ایس پی آر نے ایک دعوی کیا کہ پاک آرمی نے اللہ کے کرم و فضل سے پاکستان سے دہشت گردی کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔
اس آپریشن میں چھ سو کے قریب پاک آرمی کے جوانوں نے اپنی جانوں کے نذرانے اپنی دھرتی ماں کے لیے پیش کیے۔ جن میں سینئر افسران بھی شامل تھے۔
تین ہزار کے قریب جوان زخمی ہوئے۔
جبکہ پینتیس سو کے قریب دہشت گرد مارے گئے۔اس عرصے کے دوران چار سو پچاس کے قریب دہشت گردوں کو پھانسی لگایا گیا جبکہ گیارہ سو کو گرفتار کر لیا گیا۔
بلاشبہ یہ آپریشن پاکستان کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا لیکن پاک آرمی نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس چیلنج کو قبول کیا اور پھر اللہ کی نصرت سے اس میں بڑی کامیابی بھی حاصل کی۔
یہ دنیا کی پہلی بڑی جنگ تھی جو دہشت گردی کے خلاف لڑی گئی۔
اور یہ پہلی فتح بھی تھی جو کہ دہشت گردی کے خلاف حاصل کی گئی تھی۔
اس آپریشن کے دوران پاکستان آرمی کی دی جانے والی قربانیوں کو خراجِ تحسین لفظوں میں نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی یہ قربانیاں ایسی تھیں کہ انہیں لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔
پوری قوم ان بیٹوں کو سلام پیش کرتی ہے۔
سلام ہو ان بیٹوں پر۔۔۔
سلام ہو ان جانثاروں پر۔۔۔
سلام ہو پاک آرمی پر۔۔۔۔

اس زمین کی مٹی میں
خون ہے شہیدوں کا
ارضِ پاک مرکز ہے
قوم کی امیدوں کا
دیکھنا گنوانا مت
دولتِ یقین لوگو
یہ وطن امانت ہے
اور تم امیں لوگو
(_______)

میجر بلال کئی دفعہ ماریہ کو خط لکھ چکے تھے۔ لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

آتا بھی کیسے؟

وہ یہ گھر بیچ کر اپنی ماں کو اپنے پاس ہی لے آئی تھی۔ اس لیے اس گھر میں آئے نئے لوگ اس خط کو محفوظ رکھ لیتے کہ گر کبھی وہ اس گھر میں آئیں تو وہ انہیں دے دیں گے۔ نئے گھر کا پتا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس لیے وہ خط اسی گھر میں جمع ہوتے جارہے تھے۔

کاش وہ اب لوٹ کے آئے بھی نہ ورنہ جینے کے نام پر چلنے والی سانسیں بھی رک جاتیں۔

وہ اس کی طرف جواب ملنے سے مایوس ہو چکے تھے۔

آخر ایک دن وہ ہمت جمع کر کے میجر ارتضی کو بتانے ہی چلے آئے۔

وہ سیٹنگ ہال میں بیٹھے ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھے۔ جس پر آج کا خبر نامہ چل رہا تھا۔

وہ ان کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

''ارتضی مجھے معف کر دو یار۔ مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔'' کچھ باتیں کرنے کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف لوٹ آئے۔

''کیسی غلطی؟'' میجر ارتضی نے آوذ کم کرتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔

اس پر انہوں نے سارا واقعہ شروع سے لیکر آخر تک میجر ارتضی کو بتا دیا۔

''مجھ سے یہ سب بہت جلدی میں ہو گیا۔ مجھے معف کر دو میرے دوست۔'' التجائیہ نظریں میجر ارتضی کے چہرے سے ٹکرائی تھیں جہاں کوئی تاثر نظر نہیں آرہا تھا۔

''کوئی بات نہیں دوست۔'' وہ یہ کہہ کر دوبارہ خبریں سننے میں مصروف ہو گئے۔ اور وہ کہتے بھی کیا

''میں نے اسے بعد میں کئی خط لکھے لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔'' میجر بلال کو لگا کہ شاید وہ خفا ہو گئے تھے۔

''اس نے جواب دینا ہوتا تو پہلے خط کا ہی دے دیتی۔'' ایک درد بھری مسکراہٹ ان کے لبوں پر رینگی تھی۔

''لیکن یار یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ پچھتاوے کی دلدل سے نکل نہیں پا رہے تھے۔

''بلال قسمت ایسے ہی تو ہمیں آزماتی ہے۔ پہلے کسی کے لیے ہمارے دل میں بہت محبت پیدا کرتی ہے اور پھر اسی چیز کو ہم سے چھین لیتی ہے تا کہ بندے کے صابر وشاکر ہونے کا امتحان لے سکے۔ اور جانتے ہو اس کے اس امتحان میں ہی ہمارے لیے بہتری ہوتی ہے۔ وہ ہماری خواہشوں کے تحت نہیں چلتی۔ وہ ہمارے

لیے اسے ہی منتخب کرتی ہے جو بہت بہتر ہوتا ہے۔ اس سارے معاملے میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر اس نے لوٹ کر آنا ہوتا تو میری قبر پر ایک پھول رکھنے ضرور آتی۔'' ایک درد بھری لہر انہیں اپنے جسم سے گزرتی محسوس ہوئی۔

وہ واقعی نہیں آئی تھی۔

اگر وہ سچی محبت کرتی تو ایک بار ان کی قبر پر ضرور آتی۔

ان کی خاموش قبر کو بتاتی کہ وہ ان کے بغیر کتنا تڑپ رہی ہے۔

مگر ایسا نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔

وہ خاموشی سے ٹی وی دیکھنے لگے۔ ان کا دل چاہا تھا کہ وہ بھی ایک دفعہ پھوٹ پھوٹ کر رولیں مگر وہ خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میجر بلال سر جھکائے بیٹھے رہے۔

پورا کمرہ سناٹے میں ڈوب چکا تھا کہ۔ اگر سوئی بھی گرتی تو چھن کی آواز سنائی دیتی۔ اور میجر ارتضی کے لیے اتنی خاموشی برداشت کرنا ناممکن تھا۔ حقیقت میں وہ خود کو میجر بلال پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے ورنہ وہ ساری زندگی خود کو ہی اس بات کا قصوروار ٹھہراتے رہتے۔

''دراصل قدرت کو یہ منظور ہی نہیں ہے کہ ہمارے درمیان کوئی تیسرا آئے۔'' انہوں نے شرارت سے میجر بلال کو کندھے سے پکڑ کر پیچھے کی طرف دھکا دیا جس سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور صوفے سے نیچے گر گئے۔

''لیکن قدرت کو میرے ہاتھوں سے تمہارا قتل ضرور منظور ہو گا۔'' انہوں نے کشن اٹھا کر میجر ارتضی کو دے مارا۔

''دیکھتے ہیں کہ کون کس کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے۔'' شرارت بھنوروں میں چھپائے انہوں نے دونوں کشن ایک ساتھ اٹھا کر میجر بلال کو پوری قوت سے مارے۔

اس چھوٹے سے ٹی وی ہال میں ایک دفعہ پھر ہمیشہ کی طرح محاذ کھل چکا تھا۔

جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر شروع ہوتا اور پھر گلے لگنے پر ختم ہو جاتا۔

ان کی بے مثال دوستی اسی محاذ کی وجہ سے پوری یونٹ میں مشہور تھی اور رشک کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔

(__________________)

زندگی اپنے معمول پر آچکی تھی۔ ان دونوں کی پوسٹنگ کلر کہار ہو گئی تھی۔

اس دن بھی وہ اپنے معمول کے فرائض سرانجام دینے کے بعد کلر کہار کے بلدار راستوں پر پیدل ہوا خوری کر رہے تھے موسم بہت سہانا تھا۔ شام ان پہاڑوں پر اک ادا سے اتر رہی تھی۔

سورج دن بھر کی تھکن مٹانے کے لیے مغرب کی طرف رواں دواں تھا۔ اور چاند نکلنے کے لیے بے تاب سا سورج کے گھر لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔

تختِ بابری کے قریب سے گزرتے ہوئے انہیں کچھ لڑکیاں پیچھا کرتے محسوس ہوئیں۔

وہاں شاید کسی یونیورسٹی کا ٹرپ آیا ہوا تھا۔

''یار یہ لڑکیاں ہمارا پیچھا کیوں کر رہی ہیں؟'' میجر ارتضی نے کیپ درست کرنے کے بہانے پیچھے کی جانب ایک نظر دیکھا تھا۔ اور اپنے ساتھ چلتے ہوئے بے نیاز سے میجر بلال سے استفسار کیا۔

''تو تم خود ان سے پوچھ لو۔'' میجر بلال نے چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجاتے ہوئے سرگوشی کی۔ وہ جانتے تھے کہ میجر ارتضی کبھی بھی یوں رک کر ان سے یہ بات نہیں پوچھیں گے۔

”نہیں یار۔ایسے انہیں لگے گا کہ ہم انہیں چھیڑ رہے ہیں۔“ وہ چلتے ہوئے جھیل کی جانب آرہے تھے۔ بہت سے پرندے ابھی بھی کلر کہار جھیل پر کسی کے لوٹ آنے کا انتظا کر رہے تھے۔

”توپھر کرنے دو پیچھا۔“ میجر بلال نے بات ہی ختم کر دی تھی۔ میجر ارتضی تیزی سے چلنے لگے۔ تبھی انہیں اپنے پیچھے سے ایک مہین سی آواز سنائی دی۔

”ایکسیوزمی۔“ اس پر وہ دونوں بیک وقت رکے۔

وہ چار پانچ لڑکیاں گھوم کر ان کے سامنے آ گئیں۔

ان کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کافی ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔

”جی؟“ میجر بلال نے ہمیشہ کی طرح اپنے سافٹ سے لہجے میں پوچھا۔وہ لڑکیوں سے ہمیشہ ایسے ہی بات کیا کرتے تھے۔

”آپ فوجی ہیں؟“ ان میں سے ایک ڑکی نے چہک کر پوچھا۔

اس پر میجر بلال نے حیرت سے ایک نظر خود کو دیکھا۔ خاکی ہاف سلیوز والی ٹی شرٹ،آرمی کا مخصوص ٹراوزاور کیپ پہنے وہ ہر لحاظ سے ایک فوجی نظر آرہے تھے۔ جبکہ میجر ارتضی آرمی کے فل یونیفارم میں تھے۔ میجر ارتضی ان کی اس حرکت پر رخ موڑ کر اپنی ہنسی قابو کرنے لگے جو کہ بہت مشکل کام تھا ولا کھ کوشش بھی کر لیتے تو بھی ان کے بھنور ان کے ہنسنے کی چغلی کھاجاتے۔انہوں نے کیپ کو ذرا سا نیچے کرتے ہوئے اپنا منہ چھپانے کی کوشش کی۔

”آپ کو ہم کیا ایلین نظر آرہے ہیں؟“ ناچاہتے ہوئے بھی ان کی چہرے میں طنز امڈ آیا۔ میجر ارتضی کے سامنے وہ کہاں اپنی اتنی عزت افزائی برداشت کر سکتے تھے۔انہیں لگا کہ شاید اس لڑکی نے یہ سول کر کے ان پر طنز کیا تھا۔

”سر آپ لوگ اتنے خوبصورت کیوں ہوتے ہیں؟“ ایک لڑکی نے حسرت بھری نظر سے میجر ارتضی کو دیکھا تھا۔اس کے یوں دیکھنے پر وہ دوبارہ رخ موڑ کر جھیل کی طرف دیکھنے لگے جس کا پانی سورج کی سرخی کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔

بالکل ان کے گالوں کی سرخی کی طرح جو کہ بلش کر رہے تھے۔

وہ اصل میں دل ہی دل میں محظوظ ہو رہے تھے۔ خاص طور پر میجر بلال کی حالت پر۔

”سر مجھے آرمی بہت اچھی لگتی ہے۔میری خواہش ہے کہ میرے ”وہ“ بھی آرمی میں ہوں۔“ یہ والی لڑکی کچھ زیادہ ہی آزاد خیال نظر آرہی تھی۔لڑکیاں حقیقت میں آرمی والوں کو ایسے ہی پرپوز کرتی ہیں۔ یہ تو آرمی والے ہوتے ہیں جو ایسی باتوں کو مذاق میں ٹال جاتے ہیں۔اب کی بار میجر ارتضی سے واقعی بہت مشکل ہو گیا تھا کہ وہ اپنی ہنسی کو قابو میں رکھتے۔

میجر صاحب اب پھنسے تھے جب ایک لڑکی مسلسل ان پر لائن مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سر آپ مجھے اپنا نمبر دے سکتے ہیں؟“ ایک لڑکی ڈائریکٹ میجر ارتضی سے مخاطب ہوئی۔

”کیوں؟“ لہجہ ذرا اچھا تھا۔

” سر آپ بہت پیارے ہیں۔اس لیے۔“ وہ ذرا شرماتے ہوئے بولی تھی۔

اب کی بار میجر بلال میجر ارتضی کی فیز میں آئے تھے۔

”کیوں مجھ میں سرخاب کے پر لگے ہیں؟“ انہیں واقعی کسی کا یوں پر تکلف ہوجانا اچھا نہیں لگتا تھا خاص طور پر لڑکیوں کا جو ہر آرمی والے کو دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھتی تھیں۔

”سر لگتا ہے آپ مائنڈ ہی کر گئے ہیں؟“ اس کے چہرے پر شام کا ایک سایہ سا لہرایا تھا۔

”جی بالکل۔“ وہ اس بات سے بے نیاز نظر آئے تھے کہ ان کے اس جواب سے اس لڑکی دل پر کیا گزرے گی۔

”مسکان جی تو کہتی تھیں کہ آرمی والے بہت سویٹ سے ہوتے ہیں۔“ اس لڑکی نے برا سا منہ بنایا۔وہ ان کے ایسے بات کرنے پر خفا سی ہوئی تھی۔

”کون مسکان جی؟“ میجر بلال نے ہمیشہ کی طرح دلچپسی کا اظہد کیا۔

”رائٹر ہیں۔“ اس کی ایک دوست نے چہک کر بتایا۔

”اللہ۔۔۔۔ایک تو ان رائٹرز کا بھی الگ سے حساب ہو گا۔ پتا نہیں بھولی بھالی بچیوں کو آرمی سے متعلق کیا کچھ لکھ کر پڑھاتی رہتی ہیں۔“ میجر ارتضی بس دل میں ہی سوچ کر رہ گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کسی ریڈر کے سامنے اس کی رائٹر کو کچھ کہنا آ بیل مجھ کو مار کے مترادف تھا۔

”اچھا سر اپنے ساتھ ایک تصویر ہی دے دیں۔“ وہ اپنا موبائل آن کرنے لگی۔ میجر بلال تصویر بنوانے کے لیے سیدھے کھڑے ہی ہوئے تھے کہ میجر ارتضی نے دوٹوک انکا کر دیا۔

”نہیں بالکل نہیں۔“ ان کے اس جواب پر اب میجر بلال نے بھی برا سا منہ بنایا تھا۔

”کیوں سر؟“ وہ لڑکی ابھی بھی کیمرے کو آن کیے ہوئے تھی۔

”کیونکہ یہ چیز مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی کہ ہمارے ملک کی بیٹیاں اس طرح راہ چلتے کسی بھی لڑکے کے ساتھ تصویریں بنانا شروع ہوجائیں یا ان سے نمبر مانگنا شروع ہوجائیں خواہ وہ آرمی میں ہو یا پھر کوئی سپر اسٹار۔۔۔گر کوئی لڑکا آپ سے نمبر مانگے یا یوں کسی راستے میں تصویر مانگے تو بہت غصہ آتا ہے نا؟ کیوں؟“ وہ پل بھر کے لیے ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھنے کے لیے رکے۔

”کیونکہ وہ ایک عام لڑکا ہوتا ہے اس سے بات کرنے پر یا اس کے ساتھ تصویر بنانے پر گناہ ملتا ہے نا۔لیکن آرمی کے کسی بھی سولجر کے ساتھ یا کسی بھی سپر اسٹار کے ساتھ بات کرنے یا تصویر بنانے پر گناہ نہیں ملتا۔ آئی ایم رائٹ مس؟“ وہ اسی لڑکی سے مخاطب ہوئے۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ کو اس یونیفارم سے بہت محبت ہے۔ ہم نے اسے اسی لیے پہنا ہوا ہے کہ کوئی آپ کی طرف بری نظر سے نہ دیکھے۔ لیکن اگر آپ ہی ایسی حرکتیں کرتی پھریں گی تو ہم سے کیا توقع رکھیں گی آپ؟میری ان باتوں کا غصہ نہ کیجیے گا پلیز لیکن ایک سولجر اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں آپ کے لیے بھی وہی چاہوں جو میں اپنی بہنوں کے لیے چاہتا ہوں۔ آخر میں ایک گزارش ہے آپ سے کہ آپ آرمی سے محبت کریں اور ضرور کریں لیکن احترام وعقیدت کے ساتھ۔اپنے وقار کو نیچے مت آنے دیں۔ آرمی کے لیے اپنی اقدار کو زوال مت آنے دیں۔یوں کسی بھی لڑکے کے لیے پاگل ہونا میرا نہیں خیال کے ایک لڑکی کو زیب دیتا ہے۔ آپ اپنا ٹرپ انجوائے کریں۔اور خیریت سے واپس جائیں۔اللہ حافظ۔“ آخر میں ان کے بھنور گہرے ہوئے تھے۔وہ ان کا جواب سنے بغیر میجر ارتضی کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔

” کھڑوس کہیں کا۔“ اسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

میجر ارتضی اس آواز کو سن کر ہنس دیے۔

”لیکن ہینڈسم ہے یار۔“ ان میں سے ایک لڑکی کی مرمٹنے کے سے انداز والی آواز نے ان کا تعاقب کیا۔

”یار اس ملک کی لڑکیوں کا کچھ نہیں ہوسکتا۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دیے۔

”تمہیں کس نے کہا تھا کباب میں ہڈی بننے کا۔“ میجر بلال کے چہرے پر مصنوعی خفگی چھائی تھی۔

”بیٹا ابرش کو پتا چل گیا نا تو تمہارا خون چوسنے کے لیے آسمانوں سے اتر آئے گی۔“ میجر ارتضی نے نہیں مستقبل کے انجام سے ڈرایا۔

”اس کا تو پتا نہیں لیکن میں تمہارا خون ضرور پی جاؤں گا۔“ میجر بلال انہیں مارنے کی غرض سے ان کی جناب لپکے۔انہیں ابرش کے بارے میں یہ مذاق بھایا نہیں تھا۔

ان کی اتنی خوبصورت بیوی کو انہوں نے پل بھر میں کسی خون پینے والی چڑیل سے تشبیہہ دے دی تھی۔

میجر ارتضی دفاع کے لیے آگے کی جانب بھاگے۔

سڑک پر وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

پرندے اپنے گھروں کی جانب لوٹ چکے تھے۔شام پوری طرح جھیل پر اتر چکی تھی۔

ہر چیز بہت خوشگوار ہوگئی تھی۔ بس ان کے دلوں میں ایک خالی جگہ بچ گئی تھی جو صرف ابرش اور ماریہ کی وجہ سے ہی پر ہوسکتی تھی۔

لیکن قسمت میں لکھا کہاں بدلا جا سکتا ہے۔ کہانی کا جو انجام ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے چاہے کہانی کو جتنے مرضی موڑ دے دیے جائیں۔اور دوستی کی اس لازوال داستان میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

(______________)

آپریشن ضربِ عضب اور سیاچن پر شہید ہونے والے شہدا کی یاد میں یادگارِ شہدا پر ایک تقریب کاانعقاد کیا گیا۔جہاں پاک آرمی اور شہدا کے لواحقین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

رات کا وقت تھا۔۔۔آسمان پر تارے جھرمٹوں کی شکل میں جگمگا رہے تھے۔اور چودھویں شب کا چاند اس وقت ان عظیم لوگوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے آسمان پر روشن ہوا تھا۔

ہر شہید عظیم تھا۔۔۔۔۔

جرات و بہادر کی عظیم مثال۔۔۔۔

شہدا کو یاد کیا جانے لگا اور اس کے ساتھ ہی تقریب میں شرکت کرنے والوں کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

ہر ماں کو اپنا بیٹا یاد آیا تھا۔ بہن نے اپنے بھائی کو یاد کیا تھا۔ بیٹی اور بیٹا اپنے باپ کے نام پر اپنا ضبط کھو بیٹھے تھے۔

شہدا کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے کئی پروگرام پیش کیے گئے۔

میجر ارتضی نے ایک نغمہ گا کر اپنے شہید دوستوں کو سلام پیش کیا۔

’’میں یہ نغمہ ضربِ آپریشن ،اپنی یونٹ اور پاک آرمی کے تمام شہدا خاص طور پر اپنے ان ساتھیوں کے نام کرتا ہوں جو زاہد پوسٹ پر ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے۔‘‘ اسی کے ساتھ پیانو پر ایک خاص دھن بجائی جانے لگی۔اور اس دھن پر میجر ارتضی کی آواز میں ایک خوبصورت نغمہ گونجنے لگا۔

اے راہِ حق کے شہیدو
وفا کی تصویرو۔۔۔۔
تمہیں وطن کی ہوائیں
سلام کہتی ہیں۔۔۔۔۔

وقت سرکنے لگا۔چاند بادلوں کی اوڑھ سے نکل کر یادگارِ شہدا پر اپنی چاندنی پھیلانے لگا۔

لگانے آگ جو آئے تھے آشیانے کو
وہ شعلے اپنے لہو سے بجھا دیے تم نے

بچا لیا ہے یتیمی سے کتنے پھولوں کو
سہاگ کتنی بہاروں کے رکھ لیے تم نے
تمہیں وطن کی فضائیں
سلام کہتی ہیں۔۔۔۔

سبزے پر بچھی کرسیوں پر براجمان ہر شخص کو اپنے عزیز یاد آنے لگے۔۔

چلے جو ہو گے شہادت کا جام پی کر تم
رسولِ پاک ﷺ نے بانہوں میں لے لیا ہوگا
علیؓ تمہاری شہادت پہ جھومتے ہوں گے
حسینؓ پاک نہ ارشاد یہ کیا ہوگا
تمہیں خدا کی رضائیں
سلام کہتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

ہر شخص کو اپنے شہید عزیزوں پر فخر محسوس ہوا تھا۔ستاروں کی کہکشائیں زمین پر اتر کر ان شہدا کے گھر والوں کا ماتھا چومنے لگیں۔ جگنو مبارکباد دینے کے لیے گروہوں کی شکل میں آنے لگے۔

اے راہِ حق کے شہیدو
وفا کی تصویرو۔۔۔۔
تمہیں وطن کی ہوائیں
سلام کہتی ہیں۔۔۔۔
اے راہِ حق کے شہیدو۔۔۔۔

اس کے ساتھ ہی میجر ارتضی کی آواز تھمی تھی۔۔۔۔ فضا میں تالیاں گونجی تھیں۔ان کو سراہا گیا تھا اس شاندار سلام پیش کرنے پر۔

اس کے بعد میجر بلال ان شہدا کے لیے کچھ اشعار پیش کرنے کے لیے اسٹیج پر آئے تھے۔

جو کوئی بھی تیری راہ میں مر گیا
اپنی ہستی کو وہ جاوداں کر گیا
میں شہیدِ وفا ہو گیا ہوں تو کیا

تد گی میرے در سے جائے گی کہاں

خوبصورت الفاظ۔۔۔۔۔

عظیم لوگوں کے لیے۔۔۔۔

اس کے بعد پاک آرمی کے دستے نے شہدا کو سلامی

دی اور چیف آف آرمی نے یادگارِ شہدا پر پھول چڑھائے۔

تقریب کے اختتام پر میزبان نے ایک شعران عظیم شہدا کی نذر کیا۔۔۔۔۔۔

ے مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے

وہ قرض چکائے ہیں جو واجب بھی نہ تھے

اور اس کے ساتھ ہی بنتِ عبدالخالق کا قلم رکتاہے کہ

شہیدانِ وطن۔۔۔۔

شہیدِ عشق۔۔۔

شہیدانِ وفا کی یہ داستان یہیں مکمل ہوتی ہے۔

(۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

ختم شد